تیرے نام کی شہرت
شازیہ چودھری

تیرے نام کی شہرت 3

میں نے شام ہاری ہے 79

چلو زندگی کو محبت بنا دیں 159

دل ٹھہر جانے کا موسم 205

بارِ اول 2007ء

ناشرین .... خواتین ڈائجسٹ

پریس .... پرنٹ لائن

قیمت .... [illegible]

سول ایجنٹ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37' اردو بازار' کراچی

تیرے نام کی شہرت

''نئے کپڑے پہن کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے!

او جی کس کے لیے

ہاں جی کس کے لیے

"مینا! او مینا۔ اللہ کی بندی کبھی تو پہلی آواز پر بھی سن لیا کر۔!''

دادی ماں جب بیرونی دروازہ بجا بجا کر ہار گئیں تو اونچی آواز میں پکارنے لگی تھیں۔ وہ جو برآمدے اور صحن کو ڈھیروں پانی سے بھگوئے خود بھی تر بتر نہایت تندہی سے وائپر کے ساتھ جتی ہوئی تھی دادی کی پکار پر اپنے سر تال کا گلا دبا کر باہر کے دروازے کی طرف لپکی۔

''ارے دادی بیل بجا دیتیں۔۔۔ اب میں مصروف تھی کیسے سنتی۔'' دروازہ کھول کر دادی کے ہاتھ سے سبزی اور فروٹ کے تھیلے لیتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی ناک چڑھا کر۔

'موئی بجلی جو گئی ہوئی ہے۔ بیل کہاں سے بجے گی۔ ہائے ہائے' سانس پھول گیا بری طرح۔''
دادی ماں تھک کر باہر بچھے تخت پر بے دم سی ہو کر گر گئی تھیں۔ وہ سبزی کے تھیلے کچن میں رکھ کر ان کے لیے پانی کا گلاس لے آئی۔

''یہ تو نے کیا ''ہلڑ'' مچایا ہوا ہے ادھر ادھر۔'' دادی یہاں وہاں بکھرے پانی پر نظر کرتے ہوئے ناک سکیڑ کر بولی تھیں۔

''صفائی ستھرائی کر رہی تھی۔'' اس نے بڑے ناز اور فخر سے بتایا۔ ''آپ کو جو شکایت رہتی ہے کہ گھر کا دھیان نہیں رکھتی۔ میں نے سوچا' آج چھٹی ہے' چلو آپ کو خوش ہی کر لیتے ہیں۔'' وہ لاڈ سے دادی کی گود میں گھستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''چل پرے ہٹ بڑی آئی دادی کی ہمدرد۔'' دادی نے مصنوعی غصے سے اسے گھورا۔ ''اتنا خیال ہے دادی کا تو بات کیوں نہ مان لیتی۔''

''کون سی والی بات شادی والی!'' اس نے سر اٹھا کر نہایت معصومیت سے پوچھا تھا۔ پھر دادی کی متوقع ''جوابی کارروائی'' یعنی دوہتڑ سے بچنے کے لیے بہ سرعت چھلانگ لگا کر پرے ہٹ گئی تھی۔

''ہاں' جیسے پہلے تو ساری باتیں مان لی ہیں جو یہ مان لے گی۔ ارے وہ تو شاید تو نے ضد لگا رکھی ہے کہ تب ہی کرے گی جب دادی منوں مٹی تلے سو جائے گی۔ میں تو نوکری کا کہہ رہی تھی۔ بھلا کیا رکھا ہے اس میں سارا دن مغز کھپائی کرو اتنی مصیبت کر کے آ جاؤ۔ اچھا بھلا گزارا تو ہو رہا ہے گھر بیٹھے ہم کون سا کوئی دس بیس کا کنبہ ہیں۔ ایک تو ہے یا میں ہوں۔ دونوں کے لیے بہتیرا ہے جو تمہارے مرحوم باپ نے چھوڑ رکھا ہے۔''

''کہاں بہتیرا ہے دادی پیاری۔'' اس نے منہ لٹکایا۔ ''اگر ہوتا تو میں ٹھاٹھ سے گاڑی کی مالک ہوتی۔ برانڈ نیو گاڑی کی آہاہا کیا شان ہوتی ہے بھئی۔ ذاتی گاڑی چلانے کا تو مزا ہی اور ہے۔'' اس نے نہایت حسرت و یاس اور اشتیاق کے ملے جلے عالم میں کہا۔ پھر ایک دم پرجوش ہو کر بولی۔

''بس پھر جو آپ کہیں جس طرح کہیں گی اسی طرح شریف بیبیوں کی طرح کیا کروں گی۔''

''لو سنو ذرا اس کی باتیں۔'' دادی پوپلے منہ سے ہنس دیں۔ ''بھلا ساری زندگی تو کسی شے کی حرص کی نہیں اور اب اگر دل مچلا ہے تو وہ بھی گاڑی کے لیے۔''

''اوہ دادی!'' وہ مٹھیاں بھینچ کر جوش سے بولی۔

''کو کیا پتا کیا لطف آتا ہے اپنی ذاتی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اپنی مرضی سے سڑک

پر ہواؤں کی طرح اڑتے پھرنے میں۔''

''پگلی ہے تو تو۔'' دادی سر جھٹک کر سبزی صاف کرنے میں لگ گئیں۔

''کیا پکانا ہے شام کو دادی۔'' وہ وائپر کا کام نپٹا کر گیلے فرش پر پرانا کپڑا پھیر کر اپنے گیلے کپڑے بدل کر نہا دھو کر اپنے اور دادی کے لیے چائے بنا کر دوبارہ صحن کی سمت آئی تھی۔ اسی اثناء میں دادی کافی ساری سبزی صاف کر چکی تھیں۔

''اے دیکھو پوچھتی تو یوں ہے جیسے خود بناتی ہے روز۔'' دادی نے ناک پھلا کر کہا تھا وہ ہنس پڑی۔

''ہماری شاہی چھٹی ہے اسی خوشی میں ہم اپنی دادی حضور کو شاہی مطبخ سے رخصت عطا کرتے ہیں۔ ماہ بدولت آج خود عشائیہ تیار کریں گے۔ یعنی کہ۔ یعنی کہ بھلا کیا پکائیں دادی حضور!''

''یعنی کہ شلجم اور میتھی۔'' دادی نے کھٹ سے جواب دیا۔ اس نے برا سا منہ بنا لیا۔

''جی نہیں یعنی کہ چکن روسٹ!''

''یعنی کہ آلو پالک۔'' دادی نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''اُف اُف۔'' اس نے سر پیٹ لیا۔ ''کیا خنجر سا مارا ہے دل پہ۔ یعنی کہ بریانی۔ یعنی کہ کوفتے یعنی کہ قورمہ۔ آہاہا۔'' اس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ ''ویسے دادی۔'' وہ پلٹا کھا کر دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''کیا خیال ہے کہ آج باہر ڈنر نہ کریں۔ چائنیز میں۔ تنخواہ بھی تازہ تازہ ملی ہے مبلغ ساڑھے پانچ ہزار۔''

اس کی باتوں پر دادی کو کوئی حیرت نہیں ہوتی تھی۔ اس کا اسٹائل سمجھتی تھیں اسی لیے اسی کے انداز میں جوابی کارروائی کرتی تھیں۔ اس وقت بھی پالک چنتے ہوئے مصروف سے انداز میں گویا ہوئیں۔

''اچھا باہر کھانے کا پروگرام ہے اور جانا کس پر ہے ہیلی کاپٹر پر یا چاند گاڑی پر۔''

دادی کے استفسار پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''میرا خیال ہے کہ ہم ریل گاڑی پر چلتے ہیں۔ ذرا سستی پڑے گی وہ۔'' کافی غور و خوض کے بعد وہ بولی۔

''ابھی دراصل اہم اتنے امیر نہیں ہوئے نا۔ ہائے دادی ویسے سنجیدگی سے سوچیں اگر ہمارے پاس ذاتی کار ہوتی اس وقت' تو آنے جانے کی مصیبت تو نہ پڑتی۔ ٹھاٹھ سے اپنی گاڑی پر چائنیز جاتے۔'' اس کی سوئی پھر گاڑی پر ہی آ کر ٹکی تھی۔

''اٹھو اور اوپر چھت سے کپڑے اتار کر لاؤ۔ سوکھ گئے ہوں گے۔'' دادی سبزی اٹھا کر کچن کی

جانب بڑھی تھیں۔

وہ بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔

”اتنی دیر میں کیا گاڑی ملنے کے چانسز بن جائیں گے۔“ سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے اس نے نہایت سنجیدگی سے پرخیال نظروں سے دادی کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ہاں شاید کہا جاسکتا ہے۔“ دادی نے اس سے زیادہ سنجیدگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ تسلی آمیز انداز میں سرہلاتی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ پھر ٹیرس پر آ کر خود بخود ہنس دی۔

”دادی بھی آخر میری دادی ہیں۔“

اس کے امی ابو چند سال پہلے ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے‘ ایسے میں دادی نے ہی اسے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا تھا۔ دادا ابو کا بنایا ہوا ذاتی مکان تھا۔ ابو کا بینک بیلنس اور کچھ پراپرٹی تھی۔ ٹھیک ٹھاک گزارہ ہوجاتا تھا۔ اس نے انگریزی میں ایم اے کے بعد قریبی پرائیویٹ ہائی اسکول میں جاب کرلی تھی۔ جس پر دادی کو اختلاف رہتا تھا۔ گو بینک میں اتنا تو تھا کہ ایک چھوٹی سی برانڈ نیو سوزکی خریدی جاسکتی تھی۔ لیکن دادی اس سلسلے میں ہمیشہ مزاحم ہوجایا کرتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں نرمین کو گاڑی کی حرص یا شدید حسرت نہیں تھی۔ بس ایک خواہش ایک شوق تھا اور وہ چاہتیں تو اسے پورا کرسکتی تھیں‘ ظاہری بات ہے وہی تو ایک ان کی کل کائنات تھی۔ اس کے وجود کی کھلکھلاہٹوں سے تو دادی کی زندگی کی سانسیں بندھی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ خود ہی اس کی فرمائش کو پورا کرنے میں ٹال مٹول سے کام لیتی تھیں۔

”میرا دل تو ویسے ہی ہولتا رہتا ہے جب تم گھر سے باہر ہوتی ہو گاڑی چلانی شروع کردی تو اور وہم ستانے لگیں گے۔ تمہارا مزاج تو پہلے ہی اتنا اتاولا ہے۔ ارد گرد کا کچھ دھیان نہیں ہوتا۔ اندھا دھند سیڑھیاں چڑھتی ہو۔ آنکھیں بند کرکے حشر مچا کر کام کرتی ہو۔ اللہ نہ کرے کوئی حادثہ ہوگیا تو۔“ اگر کبھی وہ بہت اصرار کرتی تو کہتیں۔

”بھئی‘ وہ پیسے تو تمہاری شادی کے لیے رکھے ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے پھر میں اپنی ذاتی محنت ومشقت اور کاوش سے پیسے کما کر گاڑی خریدوں گی۔“

دادی بے تحاشا ہنس دیتیں اور پھر ناک پر انگلی رکھ کر کہتیں۔

”اے لو۔ پانچ کا پانچ تو اُڑ دیتی ہو ہر ماہ۔ الٹے تللوں میں اور کھانے پینے کی چیزوں پر اور خریدنی ہے گاڑی۔“

کبھی موج میں ہوتیں تو اسے چھیڑتیں۔

”چل یوں کرتے ہیں‘ تیری شادی کے لیے کوئی گاڑی والا بندہ تلاش کرلیتے ہیں۔“

”ہیں دادی سچ!“ وہ مسرت سے چیخی۔ پھر ان سے لپٹ کر منمناتے ہوئے کہتی۔“ پھر جلدی کرونا ں دادی۔“ اور پھر دونوں بے تحاشا قہقہے لگانے لگتیں۔

زندگی۔ بہت آسان نہیں تھی تو ایسی مشکل بھی نہیں تھی۔ دادی نے اس کی تربیت ایسے کی تھی کہ کوئی محرومی‘ یاسیت اور حرص وطمع کا خلا اس میں پیدا نہیں ہونے دیا تھا۔ گاڑی کی خواہش بھی بس شوق ہی تھا ادی جانتی تھیں‘ بس ایسے ہی جیسے فضاؤں میں اُڑتے بادلوں اور پرندوں کو دیکھ کر ان کے سنگ اُڑنے کو جی مچلے بلکہ یونہی چھیڑ سی بنالی تھی اس نے دادی کی۔

چھت پر سے کپڑے اتارتے ہوئے یوں ہی اسے ایک نامعلوم سا احساس ہوا تو اس نے سر اٹھا کر دھر ادھر دیکھا۔ دائیں طرف پانچ چھ گھر چھوڑ کر پرے گھر کے ٹیرس پر ایک لڑکا دوربین سے اس کی لرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن آمیز تحیر در آیا۔

دور سے لڑکے کا چہرہ واضح نظر نہیں آرہا تھا تاہم قد وقامت اور ڈیل ڈول سے سولہ سترہ سال سے کچھ زیادہ نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بڑا دیکھا بھالا سا لگ رہا تھا۔

”کون ہوسکتا ہے؟“ اس کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں بچھ گئی تھیں‘ اس کے متوجہ ہونے کے بعد وہ دوربین آنکھوں سے ہٹا کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

نرمین نے غیر محسوس انداز میں دوبارہ اس نوجوان لڑکے کی سمت نظریں دوڑائیں۔ چند ثانیے غور کرنے کے بعد معاً جیسے اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔

”اوہ!“ اس نے گہری طویل سانس لیتے ہوئے جیسے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑا۔ یہ لڑکا نعمان پیرزادہ کے ساتھ اکثر نرمین نے دیکھا تھا۔ تھا تو اسی کے اسکول کا مگر اس کا سیکشن الگ تھا۔

نعمان پیرزادہ نائنتھ کلاس کا اسٹوڈنٹ تھا نہایت بدتمیز‘ اکھڑ مزاج‘ شرارتی اور سرکش۔ اس کے ساتھ یاسر نوید اور حمزہ بھی نرمین کے اسٹوڈنٹ تھے۔ پورے کا پورا ٹولہ نہایت گستاخ تھا دو سال سے مسلسل فیل ہوتا آرہا تھا۔ دوسرے لڑکوں خصوصاً لڑکیوں کو تنگ کرنا‘ اساتذہ کو اپنی شرارتوں سے عاجز کرنا‘ اور اسکول کی انتظامیہ کے لیے روز نت نئے مسائل پیدا کرنا اس گروپ کے پسندیدہ ترین مشاغل میں شمار ہوتا تھا۔ خصوصاً اس گروپ کا سرغنہ نعمان پیرزادہ تو اساتذہ کے کہنے میں بھی نہیں آتا تھا۔ نرمین سے البتہ خاصا دبتا تھا۔ مگر بالکل اسی طرح جیسے بند پنجرے میں۔ بھوکا شیر کسی مصلحت کے

تحت اپنی چنگھاڑیں بند کر دے اور جب اسے مطمئن دیکھ کر پنجرہ کھول دیا جائے تو کھولنے والے کو آناً فاناً چیر ڈالے۔

دراصل اس کا تعلق [illegible] پیر فیملی سے تھا۔ اس کے چچا حکمران پارٹی کی پسندیدہ شخصیات میں شمار ہوتے تھے سو چچا کی منسٹری اور باپ کی بے پناہ امارت نے اس کی چال اور مزاج میں خود بخود غرور، تکبر اور گستاخی کے عناصر شامل کر دیے تھے۔

ابھی پچھلے ہفتے دسمبر ٹیسٹ کے رزلٹ کے بارے میں بتاتے ہوئے نرمین نے نعمان پیرزادہ سمیت پورے گروپ کو ہر مضمون میں فیل ہونے پر بری طرح سخت سست کہا تھا۔ اور سزا کے طور پر دو پریڈ تک مسلسل کھڑا رہنے کا حکم دیا تھا۔ طوہاً و کرہاً باقی تو اٹھ کھڑے ہوئے مگر نعمان پیرزادہ لیت و لعل سے کام لینے لگا۔ نرمین کے ترش اور تند انداز پر وہ بدتمیزی پر اتر آیا۔ اس کی برداشت کی حد ختم ہو گئی اور اس نے غصے سے ابلتے ہوئے زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ پھر انگلی اٹھا کر غیض سے کانپتے ہوئے کہا تھا۔

''گیٹ آؤٹ۔ بی آف فرام ہیئر ودان سیکنڈز۔'' اور وہ لال سرخ چہرہ لیے سامنے کی کرسی کو ٹھوکر مارتا ہوا باہر نکل گیا تھا نرمین نے ساری بات اپنے پرنسپل کو جا کر بتائی۔

پرنسپل نے نعمان پیرزادہ کی اچھی خاصی کلاس لی' اس کو آئندہ اس قسم کے رویے سے اجتناب کرنے کی سرزنش کی۔۔ اور نرمین سے سوری کروانے کے بعد دوبارہ کلاس میں جانے کی اجازت دے دی۔

یہ معاملہ ابھی دبا نہیں تھا کہ ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہو گیا۔

کلاس میں ایک نئی لڑکی کراچی سے مائیگریٹ ہو کر آئی تھی۔ اس کا نام مریم تھا اس کا باپ ایک گورنمنٹ کے ادارے میں ہیڈ کلرک تھا۔ مریم کا تعلق تو سفید پوش طبقے سے تھا مگر اس کا بے پناہ حسن اس کا سانچے میں ڈھلا نوخیز و شاداب سراپا' اس کا شگفتگی سے سجا معصوم چہرہ بتاتا تھا گویا بے مثال تھی' کچھ ہی عرصے میں اس نے اساتذہ کی توجہ اپنی سمت مبذول کروالی۔ اس کی سادہ و شفاف مسکراہٹ' اس کا خوش اخلاق لہجہ اور محتاط طرزِ عمل اپنے اندر کچھ ایسی کشش لیے ہوئے تھا کہ بہت کم عرصے میں وہ دوسرے کلاس فیلوز کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔

اس دن جمعرات تھی۔ نرمین کی کوشش ہوتی تھی کہ جمعرات کو جلدی گھر پہنچے' آخری پریڈ چل رہا تھا ۔نرمین کا یہ پریڈ فری تھا سو وہ وقت گزاری کے لیے ٹہلتی ہوئی اسٹاف روم سے باہر گھاس کے قطعے کی

سمت آ گئی۔ اسکول کی باؤنڈری کے ساتھ ساتھ پیلے پھولوں کی گھنی باڑھ ایک تسلسل سے بڑھی چلی گئی تھی۔ وہ اسکول گیٹ کے عین سامنے والی روش پر کسی خیال میں مگن ٹہل [illegible] جب اس نے اڑے اڑے حواسوں اور بے ترتیب سے نڈھال حلیے میں مریم کو گیٹ سے [illegible] دیکھا۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ اور لرزش نمایاں تھی۔

''مریم!'' نرمین کا دل دھک سے رہ گیا۔

''تم اس وقت اس حلیے میں۔ کہاں سے آ رہی ہو۔''

چوکیدار شاید ادھر ادھر کہیں مصروف تھا ورنہ اسے باہر ہی روک لیتا۔

''میڈیم!'' وہ پھولی بکھری سانسوں سمیت اس کی بانہوں میں آ کر ڈھیر ہو گئی۔

''مریم! مریم ہوش کرو بھئی۔'' نرمین کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے تھے اسے اس حال میں دیکھ کر۔ ایک انجانے سے احساس نے اس کے روئیں روئیں کو جیسے خوف و ہراس سے ٹھٹکا کر رکھ دیا۔

غنیمت تھا کہ تمام بچے اپنی اپنی کلاسوں میں تھے۔ ادھر کوئی متوجہ نہیں تھا۔ وہ بدقت تمام مریم کے نیم بے ہوش وجود کو سہارا دے کر اسٹاف روم میں لے آئی اس کو پانی پلایا پنکھے کے نیچے بٹھایا اور بال درست کرتے ہوئے اس کے حواس بحال کرنے کی تگ و دو کرنے لگی۔

ہوش میں آتے ہی مریم گھٹی گھٹی چیخوں سمیت اس سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔

نرمین کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

''مریم! خدا کے واسطے خود کو سنبھالو۔ ہوش کرو کوئی ادھر آ گیا تو تمہیں اس حلیے میں دیکھ کر کیا کہے گا۔ جاؤ پہلے ادھر ٹوائلٹ میں جا کر اپنا حلیہ درست کرو۔'' وہ اسے پکڑ کر واش روم میں لے آئی۔ چہرہ دھلایا لباس درست کرایا۔ اس کی ظاہری حالت قابل قبول بنا کر ابھی باہر نکلی ہی تھی کہ چھٹی کی بیل بج اٹھی۔

اب یہاں بیٹھ کر سوال جواب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''تم فی الحال میرے ساتھ میرے گھر چلو' یہاں سے پیدل کا راستہ ہے۔ وہاں چل کر سکون سے ساری بات بتانا۔'' وہ اسے گھر لے آئی۔

''دادی۔ یہ میری اسٹوڈنٹ ہے اسے کچھ سمجھنا ہے مجھ سے' ہم ادھر کمرے میں ہیں۔ ذرا اچھی سی چائے بجھوادیں۔''

''چائے کا یہ کون سا ٹائم ہے۔ کھانا تیار ہے بالکل بس لگانے کی دیر ہے۔ بیٹھو بچی ادھر کھا کر پھر

پڑھنا شروع کرنا۔ ابھی اسکول میں مغز ماری کر کے آئی ہو۔'' دادی نے حق میزبانی نبھاتے ہوئے مریم کو ادھر ڈائننگ ٹیبل کے پاس ہی بٹھالیا تھا۔

کھانا کھا کر وہ مریم کو اپنے کمرے میں لے آئی۔ اور دروازہ بند کر کے اسے اطمینان سے بیڈ پر بٹھا کر پوچھنے لگی۔

''ہاں اب بتاؤ۔'' نجانے کیوں نرمین کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ پچھلے پورے وقت میں مسلسل اس کی کیفیات نوٹ کرتی رہی تھی جو پکار پکار کر کسی ہولناک داستان کا راز منکشف کر رہی تھیں اس کے پھول جیسے معصوم و حسین مکھڑے پر خوف و ہراس اور بے بسی و لاچاری کے ایسے رنگ ثبت تھے جس نے نرمین کو اندر ہی اندر دہلا کر رکھ دیا تھا۔

مریم لرزتے کانپتے مومی ہاتھوں کو اضطراری انداز میں مسل رہی تھی۔ آنکھوں کے کنارے دھیرے دھیرے بھیگنے لگے تھے۔

''میں آج صبح جب آ رہی تھی ناں گھر سے۔'' وہ رندھے ہوئے انداز میں کہنے لگی۔

''ہاں۔ ہاں پھر کیا ہوا؟'' نرمین کا رواں رواں اس کی سمت متوجہ تھا اس کا تجسس انتہاؤں کو چھو رہا تھا۔

''کچھ فاصلہ طے کیا تھا کہ دو موٹر بائیک سواروں نے راستہ روک لیا۔ یہ نعمان پیرزادہ کا گروپ تھا۔ پہلے تو اسکول میں ہی تنگ کرتے تھے مگر آج اسی دوران ایک پجارو ادھر آ رکی۔ اس میں سے تین مسلح آدمی اترے اور رائفلز کی زد میں لے کر زبردستی اندر بٹھالیا۔ پھر.....'' مریم کا سانس پھولنے لگا تھا۔ اس کا لہجہ بری طرح مرتعش ہو رہا تھا۔

وہ ایک ٹک بغیر پلک جھپکے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی بے چینی کے مارے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔

''پھر وہ مجھے ایک عالیشان بنگلے میں لے گئے۔ اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔ دو گھنٹے تک میں یونہی اکیلی اس کمرے میں بند رہی۔ پھر دروازہ کے پاس قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ایک بارعب سی دبنگ سی آواز میں کوئی بولا۔

''ہاں بھئی جوان کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟ ہمارے بندے پہنچ گئے تھے ناں؟''

''چچا جان کے ہوتے ہوئے کیا مسئلہ درپیش ہونا تھا۔'' نعمان پیرزادہ نے چہک کر جواب دیا تھا۔

''چل بھئی پھر عیش لوٹ۔ شیر جوان یہی تو چار دن ہوتے ہیں۔'' چچا نے بھتیجے کی پیٹھ تھپکی تھی۔

پھر چاروں طرف سے قہقہے گویا برسنے لگے تھے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ خوف سے

سانس لینا محال محسوس ہو رہا تھا۔ پھر آوازیں آہستہ آہستہ مدھم پڑتی گئیں۔ ایسا لگا جیسے کوئی جیپ اسٹارٹ ہو رہی ہو۔ اسی دوران ملازمہ لاک کھول کر کھانے کی ٹرے سمیت کمرے میں داخل ہوئی۔ میرے لیے یہی موقع تھا۔ ملازمہ نے دونوں ہاتھوں میں ٹرے پکڑی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹرے میز پر رکھتی میں نے چھلانگ لگا کر نشست چھوڑی اور دروازے کی سمت لپکی۔ آگے راہداری تھی۔ اس سے قبل کہ وہ عبور کرتی دفعتاً نعمان پیرزادہ دوسری سمت سے ادھر آ گیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ٹھٹھک کر لپکا اور میری کلائی پکڑ کر اندر کی سمت گھسیٹنے لگا۔ مجھ میں جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی میں نے بھرپور مزاحمت کی مگر بہر حال وہ مجھ سے زیادہ طاقتور اور مضبوط جسامت کا تھا۔ کوئی چارہ۔۔۔ نہ پا کر میں نے اس کی کلائی پر دانت گاڑ دیے۔ وہ درد سے بلبلا اُٹھا اور۔۔۔ مجھے چھوڑ کر اپنا بازو پکڑ کر بیٹھ رہا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ حملہ آور ہوتا میں سرپٹ بھاگ اٹھی۔ اور اندھا دھند کوٹھی کی دیوار سے باہر چھلانگ لگا کر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی آوازیں پیچھے سے سنائی دینے لگیں۔ میں انہیں کسی نہ کسی طرح جھانسا دے کر اسکول تک پہنچ گئی۔''

نرمین دم بخود مریم کو تک رہی تھی۔ جو اضطراری کیفیت میں دونوں ہاتھ کی انگلیاں چٹخا رہی تھی اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ نرمین نے شدید غیض کے عالم میں مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس کا خون بری طرح کھول رہا تھا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ نعمان پیرزادہ اس حد تک دلیری بھی دکھا سکتا ہے۔ خیر یہ سب کچھ اس نے اپنے باپ کی دولت اور اپنے چچا کے اثر و رسوخ کے بل بوتے پہ کیا ہے۔ میں کل ہی سر نیازی سے بات کرتی ہوں۔ اب ان لڑکوں کا اسکول میں مزید رہنا خطرناک ہوگا۔''

اس نے اگلے دن جا کر پہلی فرصت میں پرنسپل نیازی کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ پوری تفصیل سن کر انہیں غصہ ہی آ گیا۔

''مس نرمین! آپ اس بدتمیز اور گستاخ گروپ کے ساتھ جو بھی سلوک کرنا چاہتی ہیں آپ کو مکمل اختیار ہے۔''

چنانچہ دوسرے روز ان چاروں لڑکوں کے والدین کو بلا کر ان کے۔۔ کرتوتوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا۔

''آپ کے بچے اغوا، حبس بے جا' اور جبری زیادتی جیسے سنگین جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اگر اس بچی کے والدین چاہیں تو با آسانی آپ کے بچوں پر کیس بن سکتا ہے' لیکن ہم اپنے ادارے اور

ادارے کے ... ک نامی کی وجہ سے بات آگے نہیں بڑھا رہے۔ صرف آپ کے بچوں کو ا
اسکول سے خارج رر رہے ہیں۔ کیونکہ ان کی سرگرمیاں نقص امن کا باعث بن سکتی ہیں۔"
ان چاروں لڑکوں کے اسکول سے اخراج پر اسٹوڈنٹس انتظامیہ دونوں نے سکون کا سانس لیا۔

📖

دادی! یہ چائے ہے یا پائے جو بن کر ہی نہیں دے رہی۔" وہ ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھی جھنجھلا کر کہہ رہی تھی۔

"اری صبر تو کرو۔ اتاولی کیوں ہو رہی ہے۔ لا رہی ہوں۔" دادی کچن میں کھڑ پٹر کرتے ہوئے قدرے جھلا کر بولی تھیں۔

"اور یہ پراٹھا تو جوں کا توں سجا کے رکھا ہے تو نے۔۔ پلیٹ میں۔" دادی چائے کا مگ تھامے نکل آئی تھیں۔ "خود بنا کے تو کیا کھانا پکا پکایا بھی حلق سے نہیں اترتا نواب زادی کے۔" وہ خفا خفا سی بڑبڑانے لگی تھیں۔

"اے دو چار نوالے تو لے لو۔" خفا لاکھ سہی خیال پھر بھی اس کا دل میں رہتا تھا ان کے وہ جواب میں برے برے منہ بنانے لگی۔

"یہ کوئی پراٹھا ہے؟ نہ اس میں گھی نظر آ رہا ہے نہ پراٹھوں کی سی خستگی ہے کھانے میں۔ نہ کوئی شکل نہ کوئی مزا۔ اوں ہوں۔ میرا دل نہیں دل چاہ رہا۔" وہ ناک سکوڑ کر ان کے بنائے ہوئے پراٹھے کی مجروح حالت پر تبصرہ کر رہی تھی۔

دادی نے خفگی سے گھورا۔ "اے لو جب خوب گھی لگا کر کرارے کرارے بناتی ہوں تو پھر چیختی ہو کہ سارے کا سارا گھی میں نہلا دیا ہے، اتنا ثقیل ناشتا میں نہیں کر سکتی۔"

انہوں نے اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"یوں کہو ناں، آنا کانی کرنے اور مین میخ نکالنے کی لت پڑ چکی ہے تجھے۔ ہر شے میں سو ہزار کیڑے نکالنا تو تیرا شیوہ ہے۔"

"بس دادی ثابت ہو چلا ہے کہ اب آپ کے ہاتھ میں پہلی سی لذت نہیں رہی۔" اس نے جیسے بڑے پتے کی بات بتائی تھی انہیں۔

"تو خود سنبھال لو کچن۔ بناؤ اپنے ہاتھوں سے لذیذ اور مزے دار چیزیں۔" دادی کو تاؤ آ گیا تھا۔
"دو دن باورچی خانہ چلاؤ گی تو پتا لگ جائے گا۔"

"آئے ہائے دادی۔ کیا بات کرتی ہیں آپ۔" اس نے اک ادا سے کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے ھری تھی۔ "یہ ہاتھ تو صرف ایک چیز کو سنبھال اور چلا سکتے ہیں، یعنی گاڑی کو۔" اس نے اپنے ہاتھوں یکھا تھا۔

"لے آ جا پھر اسی پھسپھسے موضوع پر۔ میرا تو دل اوب چلا ہے تیری گاڑی کی رٹ سن سن کر۔"
برتن سمیٹنے لگی تھیں۔

"ارے تو پھر لے دیں ناں گاڑی، اچھی دادی۔" اس نے ان کے برتنوں سے الجھتے ہاتھ تھام کر ے کر فرمائش داغ دی۔

"اچھا۔" دادی نے سکون سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "چل تو شادی پر راضی ہو جا۔ تجھے جہیز میں دے گی گاڑی۔"

جواب میں برا سا منہ بنا لیا۔
"کوئی اور ذکر چھیڑیں دل لہو لہو ہے۔"

"میں کہتی ہوں خدا کے واسطے سنجیدگی سے اس معاملے کے بارے میں سوچ لے۔ یہی وقت ہے ں کے نیچے سے گزرا پانی واپس نہیں آیا کرتا۔"

"بس دادی بس۔" اس نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ "بہت کھا لیا ہے میں نے، آپ کا فلسفہ ہضم نہیں گا۔"

دادی نے جواباً غصیلی نظروں سے اسے گھورا۔
"آج تو دادی موجود ہے ناز نخرے اٹھانے کے لیے۔ کل کی سوچ، جب تیرے ارد گرد تنہائی اور موشی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔"

"اللہ جی! آج میرا یوم آخرت تو نہیں۔" اس نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر نہایت سنجیدگی سے یافت کیا تھا۔

تھوڑی دیر دادی سے چہلیں کرنے کے بعد وہ بیگ کاندھے پر ڈال کر باہر نکل آئی تھی۔ اپنے صوص مانوس راستے پر چلتے ہوئے اسے ایک ناموس سا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے وہ کسی کی نظروں کے حصار میں ہو۔ اس نے قدم روک کر ادھر ادھر دیکھا لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ وہ الجھے الجھے سے انداز میں ر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

لیکن چند قدم چل کر پھر اسے جیسے کوئی احساس ستانے لگا۔

"آخر مسئلہ کیا ہے۔" وہ تحیر کے عالم میں خود سے سوال کر رہی تھی۔ کافی دیر ادھر ادھر نظر دوڑانے کے باوجود جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا' تو پھر وہ چل پڑی۔ مگر اس کی چال میں پہلی والی روانی اعتماد اور تسلسل نہیں رہا تھا۔

کچھ دیر بعد پھر اسے رکنا پڑا لیکن اس بار رکنے کی وجہ تیز رفتاری سے فٹ پاتھ کے بالکل ساتھ ایک دھچکے سے کھڑی ہو جانے والی پجارو تھی۔ کھٹاک سے فرنٹ کا ڈور کھلا اور اگلے ہی لمحے لمبے چوڑے ڈیل ڈول والا پینتیس چھتیس سال کا بارعب سا آدمی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"جی۔" ایک لمحے کو وہ بے اوسان سی تو ضرور ہوئی تھی۔ مگر ظاہر کیے بغیر بڑی تسلی سے استفہامیہ انداز میں اس کا سرد و سنگین تاثرات سے سجا چہرہ دیکھا اور سکون سے بولی۔ پجارو سے کود کے تین چار کلاشنکوفوں والے بندے آن کھڑے ہوئے تھے۔

"تو تم ہو مس زرمین احمد!" بالآخر اپنی کڑی نظروں کا حصار توڑتے ہوئے وہ بولا تھا۔ اس میں بڑا تکبر' تحقیر اور تنفر سا تھا۔

زرمین نے انتہا درجے کی ناگواری سمیت اس کی سمت دیکھا تھا۔

"جی ہاں لیکن تعارف کا یہ کون سا انداز ہے۔"

"ابھی تعارف کروایا ہی کہاں ہے محترمہ۔" اس کے انداز میں خاصا استہزا تھا۔

"ہم عمر دراز خان پیرزادہ ہیں۔ نعمان پیرزادہ کے چچا۔"

بڑے زعم سے تعارف کروایا گیا تھا۔ یہ وہی ... جو حکمران پارٹی کا چہیتا بندہ تھا۔ ایک طاقتور سیاسی شخصیت۔

"تو پھر......" وہ بغیر مرعوب ہوئے اسی سکون سے دریافت کر رہی تھی۔

"غالباً آپ نے ہی بچے کی کسی شرارت پر اسے اسکول سے نکلوایا ہے۔"

"آپ کو غالباً بچے کی اس "شرارت" کے بارے میں علم نہیں ہے۔" اس نے طنزاً کہا تھا۔

"جانتے ہیں' اور ایسی چھوٹی موٹی شوخیاں تو اس عمر کے لڑکوں کا حصہ ہوتی ہیں۔" اس نے ... سے اپنا مغرور سر جھٹکا تھا۔ "بہرحال بحث مباحثے کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ آپ کو کرنا ہے کہ پرنسپل سے کہہ کر اس کا ایڈمیشن دوبارہ کروانا ہے اپنی کلاس میں۔ یہ اس کا بڑا اہم سال ہے اور سالانہ امتحان کو بھی دو تین مہینے رہ گئے ہیں بمشکل۔"

وہ گویا آرڈر کر رہا تھا اسے۔

زرمین کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"یہ اسکول کے قوانین اور اصولوں کے خلاف ہے۔"

اس نے یہ کہہ کر غصے سے سر جھٹکتے ہوئے آگے قدم بڑھائے تھے مگر اسی وقت اس کے راستے میں کلاشنکوفوں والے آگئے۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے مسٹر عمر دراز خان!" وہ بھنا کر اس کی طرف مڑی تھی' جو نہایت اطمینان سے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اس کا سراپا جانچ رہا تھا۔

"ویسے ہو خاصی دلکش۔" وہ خاصی بے باک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

شرم اور غصہ سے اس کا پورا وجود جل اٹھا۔

"اپنے ان پالتو کتوں سے کہو کہ میرے راستے سے ہٹ جائیں۔" ناک سکوڑتے ہوئے وہ غضبناک ہو رہی تھی۔

"ہمیں نڈر' خود اعتماد اور غصہ ور لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔" وہ اب بھی بڑی تسلی سے اس کو نظروں کے حصار میں لیے ہوئے تھا۔

"بی ہیو یور سیلف مسٹر عمر دراز خان۔"

کچھ دیر وہ اس کا طیش زدہ انداز ملاحظہ کرتا رہا۔

پھر محظوظ ہونے کے بعد ہاتھ کے اشارے سے اپنے بندوں کو ہٹا دیا اور خود بھی گاڑی میں جا بیٹھا۔

"بہرحال تم سوچ لو۔ نعمان پیرزادہ ہمارا ... سا بھتیجا ہے اور اس کا کیریئر ہمیں ہر شے سے عزیز ہے' کیوں ایک کلرک کی معمولی سی بیٹی ... مصیبت مول لے رہی ہو۔"

اس کے بظاہر سرسری انداز میں محسوس کی جانے والی دھمکی تھی۔

"جہنم میں جاؤ......" اس نے جواب میں تیوریاں چڑھا کر حساب بے باق کیا تھا۔

"سوچ لو ایک بار پھر لڑکی۔" اب کی بار اس کا لہجہ بہت سرد تھا۔

"ہم بار بار اپنی بات دہرانے کے عادی نہیں ہیں' تمہیں ہر صورت نعمان کا ری ایڈمیشن کروانا ہوگا ورنہ تمہاری جان و آبرو کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی۔"

"بہت دیکھے ہیں ایسے۔ ہونہہ۔" اس نے خاطر میں نہ لاتے ہوئے تیزی سے قدم بڑھا دیے

شاید اس واقعے کو اتنی اہمیت نہ دیتی مگر دادی سے جب سرسری سا ذکر کیا تو انہوں نے اپنے

ساتھ ساتھ اسے بھی خاصا ہولا دیا۔

"تجھے ساری زندگی عقل نہیں آئے گی۔" انہوں نے ساری داستان سن کر سر تھام لیا تھا۔

"دادی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔" وہ جھلاہٹ کے عالم میں دادی سے برسرِ پیکار ہوگئی۔

"اب اس میں عقل آنے یا نہ آنے کی کیا تک بنتی ہے' بھلا کیا اس بچی کی مدد نہ کرتی میں۔ ان اوباش لڑکوں کو سبق نہ سکھاتی تو کل ایک مریم کیا پورے اسکول کی لڑکیوں کے سروں سے آنچل چھن سکتے تھے۔"

"عزت شیشے کی مانند ہوتی ہے بیٹا بچے اور اس کی حفاظت گھر کی چار دیواری میں ہی ہوتی ہے۔ باہر نکلو تو بہت پتھر پڑے ہیں۔" دادی کے چہرے کے متفکر تاثرات اور لہجے کی سنجیدگی اسے بہت کچھ سمجھا رہی تھی۔

"اللہ اس بچی کی عزت و آبرو کی حفاظت کرے۔ اس کے باپ کا شملہ اونچا رکھے۔ رب کل کی خیر کرے۔ پر بچے پرائی آگ میں کودنے کا زمانہ نہیں رہا۔ تجھے کیا خبر ولیوں کے بھیس میں کیسے کیسے شیطان چھپے ہوتے ہیں۔"

ابھی دادی درحقیقت ساری کتھا سن کر جتنا پریشان ہوئی تھیں' اتنا ظاہر نہیں کر رہی تھیں' مگر ان کا دل عجیب واہموں اندیشوں میں ڈول رہا تھا۔

"میری ماں! تو' تو چھوڑ دے یہ نوکری۔ یوں بھی فالتو کی کھکھیڑ ہے' کیا ضرورت ہے بھلا۔" دادی کی سوئی بالآخر اس نکتے پر آ کر اٹکی تھی۔

"افوہ۔" وہ جھنجلا کر رہ گئی۔ "دادی بھلا فرار اور خود فریبی بھی کبھی مسئلے کا حل ہوا کرتے ہیں۔ زمانہ خراب سہی' مگر اس کے ڈر سے لوگ گھروں سے باہر نکلنا تو نہیں چھوڑ دیتے ناں۔ گھروں میں ڈاکے پڑتے ہیں تو کیا لوگ گھروں کو قیمتی اشیاء سے سجانا چھوڑ دیتے ہیں۔ چوری ہو جانے کے ڈر سے خواتین زیور خریدنا ترک کر دیتی ہیں کیا فراڈ کے ڈر سے سیٹھ لوگ کاروبار کرنا بند کر دیتے ہیں کیا؟ یہ دنیا کے دھندے یونہی چلتے رہتے ہیں دادی۔ دنیا میں اچھے برے سبھی لوگ ہوتے ہیں۔ ہر رنگ کے' ہر ڈھنگ کے' ہر روپ کے لوگ بستے ہیں اس نگری میں۔ کیا برائی کے ڈر سے ہم اردگرد کے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیتے ہیں؟ ایسا تو نہیں ہوتا ناں۔"

"پر احتیاط اچھی چیز ہوتی ہے۔"

دادی اس کے ریشمی بالوں کو آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے حد درجہ تفکر سے کہہ رہی تھیں' ان کے

چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ انداز میں مضطربانہ سی بے قراری تھی۔

"او دادی! اچھی دادی بس اب چھوڑیں بھی اس طرح علامہ بن کر بات کرتے ہوئے ذرا بھی میری دادی نہیں لگتیں۔ اٹھیں ناں ذرا مجھے اپنے ہاتھ کا آلو پراٹھا تو بنا دیں قسم سے بڑا دل چاہ رہا ہے۔" اس نے چٹخارہ لے کر گویا اپنی دلچسپی کا عملی اظہار کیا۔

"تجھے تو ہر وقت کھانے پینے کی پڑی رہتی ہے۔"

"اچھا سن۔ آئندہ سے میں تجھے چھوڑنے اور لینے جایا کروں گی۔"

گو کہ نرمین نے دادی کا دھیان ہٹانے کو فرمائش داغی تھی مگر دادی بہرحال اس بات کو نہیں بھولی تھیں۔

"دادی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔" اس کا دل ان سے الجھنے لگا تھا۔

"نرمین! بھئی تمہارا فون ہے۔" وہ حسب معمول اپنی کلاس رہی تھی۔ جب اس کی کولیگ راحیلہ نے آ کر اطلاع دی۔

"میرا فون۔ مگر کس کا؟" اس کو حد درجہ اچنبھا ہوا۔ بھلا اس کو یہاں اسکول میں کون فون کر سکتا تھا۔

وہ دل ہی دل میں حیران ہوتی اسٹاف روم کے ٹیلی فون اسٹینڈ تک آئی تھی۔

"ہیلو۔؟" اس کے طرز تخاطب سے استعجاب ٹپک رہا تھا۔

"ہاں جی جناب۔ کیا حال چال ہیں ـــــ" ایک بھاری آواز اپنے اندر عجب ساتحکمانہ انداز لیے ہوئے ایئر پیس سے ابھری۔

"کون صاحب بات کر رہے ہیں؟" اس نے اپنا تعجب دباتے ہوئے رسانیت سے دریافت کیا۔

"دنیا ہمیں عمر دراز خان پیرزادہ کے نام سے جانتی ہے۔" کیا جارحانہ لب ولہجہ تھا۔ "اور ہم بات نہیں کرتے' فرماتے ہیں' حکم صادر فرماتے ہیں۔"

لمحوں میں نرمین کی تمام حسیات چوکس ہو گئیں' اس کی شفاف پیشانی پر ناگواری کی واضح سلوٹیں اتر آئیں۔

"مسٹر عمر دراز خان! اگر آپ کو نہیں پتا تو میں بتائے دیتی ہوں کہ مجھے نرمین احمد کہتے ہیں' اور میں نے اس سرزمین پر اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کے بعد' اور صرف اپنی دادی کا حکم ماننا ہے۔ اس

کے علاوہ مجھے کسی کی سننے کی عادت نہیں ہے اپنے احکامات ان پر صادر کیجئے' جو بندوں کے بجائے کیڑے مکوڑوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں آپ کے سامنے۔'' اس نے زوردار آواز کے ساتھ ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا غضبناک قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی تھی' کہ گھنٹی دوبارہ بج اٹھی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

درزدیدہ نظروں سے چیختے چلاتے فون پر نظر ڈالی۔ وہ مسلسل بج رہا تھا۔

ایک چور نگاہ دروازے کی سمت کی۔ کوئی اہم فون بھی ہو سکتا تھا طوہاً کرہاً اس نے ریسیور دوبارہ اٹھالیا۔

''اگر آپ کو عادت نہیں ہے تو ہم آپ کو عادی بنا دیں گے مس نرمین احمد۔'' اس کے ہیلو کہنے پر دوسری طرف سے سرد اور خشک انداز میں کہا گیا تھا۔

''آج تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی عمر دراز خان پیرزادہ کا فون پٹخنے کی۔ آپ کی پوری بات سنے بغیر فون رکھنے کی حرکت نے ہماری برداشت کو خاصا آزمایا ہے۔''

''آپ چاہتے کیا ہیں آخر۔'' اس کا ضبط انتہا کو چھونے لگا تھا۔ طیش کے عالم میں ہونٹ کاٹتے ہوئے پوچھ لیا۔

جواب میں ایک بے ساختہ قہقہہ ساعتوں میں گونجا تھا۔

''دعوا تو بہت کرتی ہو نرمین احمد! بس اتنی سی ہی بااختیاری تھی خود پر؟ بہت جلد گھبرا کر پسپائی اختیار کر لی! ہمارے حساب سے تو یہ بات بہت بعد میں آنا تھی' اس دن کی ملاقات سے تو یہی اخذ کیا تھا۔ لیکن تم خاصی سمجھدار لگتی ہو' چلو اچھا ہوا۔ ہمارے اختیار کی حدیں ناپ کر لائن پر آ گئیں۔ یہ تمہارے حق میں ہی بہتر ہوتا۔ اب بتاؤ میں نعمان پیرزادہ کو تمہارے پاس کب بھیجوں۔ امتحانات خاصے نزدیک ہیں میں چاہتا ہوں وہ دوبارہ سے ایڈجسٹ ہو کر باقاعدگی سے اسکول جانے لگے۔''

آخر میں لہجہ بڑا دوستانہ سا ہو گیا تھا جیسے پرانی شناسائی رہی ہو۔ کس قدر زعم تھا اسے کہ وہ اس کے رعب و دبدبے اور جاہ وجلال سے خائف ہو کر اس کی بات ماننے پر راضی ہو جائے گی۔ نرمین کے تلوؤں سے لگی اور سر پر بجھی۔

''آپ کس دنیا کا خدا سمجھتے ہیں خود کو مسٹر عمر دراز خان؟'' طنزیہ لہجے میں زمانے بھر کا استہزا در آیا تھا۔ ''فار یور کائنڈ انفارمیشن۔ میں آپ کی رعایا نہیں ہوں۔ اور جہاں تک نعمان پیرزادہ کے کیس کا تعلق ہے' وہ چیپٹر کلوز ہو چکا ہے۔ ایسا قیامت تک ممکن نہیں ہے۔ اینڈ ڈیٹس آل۔''

''بڑا مہنگا سودا کیا ہے تم نے اپنی من مانی کا نرمین احمد۔'' کچھ توقف کے بعد ایئر پیس پر ایک پراسراری جارحیت لیے سنگین آواز ابھری تھی۔ ''بہرحال اب ہم سے گلہ نہ کرنا۔ ہم عنقریب تمہاری ثابت قدمی کو خراج پیش کریں گے۔ امید ہے آپ کو ہمارا تحفہ پسند آئے گا۔''

''میں منتظر رہوں گی مسٹر عمر دراز خان۔'' اس نے جواباً اتنے ہی زہریلے انداز میں کہا' اس کے حرف حرف میں کاٹ تھی۔

دوسری طرف سے ریسیور رکھا جا چکا تھا۔

''میری بلا سے۔ اونہہ۔'' وہ لاپرواہی سے شانے جھٹکتی دوبارہ کلاس روم کی سمت بڑھی تھی۔

''پوری رات بارش ہوتی رہی۔ راستے میں پھسلن ہوگی۔ آج میرے ساتھ نہ جائیں دادی!'' تیار ہو کر گھر سے نکلتے وقت اس نے دادی کو روک دیا تھا۔

''اے کچھ نہیں ہوتا چلے چلتی ہوں۔'' دادی اسے اکیلے بھیجنے پر راضی نہیں تھیں۔

''کیا ہے دادی! کوئی بھیڑیا نہیں اٹھا کے لے جائے گا جنگل میں نہیں رہتی میں۔'' وہ حلق تک جھنجھلا گئی۔

''انسان کو درندہ بنتے کون سی دیر لگتی ہے۔'' دادی پر اس کی جھلاہٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ''اس لیے کہتی ہوں چھوڑ دے اب نوکری۔ بہت ہو گیا شوق پورا۔'' دادی موقع دیکھ کر پھر اپنا من پسند موضوع لے بیٹھی تھیں۔

''مجھے سکون سے جانے تو دیا کرو۔'' وہ حقیقتاً زچ ہو گئی تھی۔

''سارا دن اسی ذہنی کوفت میں گزر جاتا ہے' آپ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں رہ گئی۔''

''زیادہ اتاولی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' دادی برہم ہو گئیں۔

''تو نے طے کر لیا ہے کسی بزرگ بڑے کی بات نہیں ماننا۔ خود سر اولاد اپنی من مانیوں کا بہت نقصان اٹھاتی ہے۔ تجھے کیا خبر کتنی خراب ہوا ہے زمانے کی۔ بڑی دادی بنی پھرتی ہے میری۔ تو نے دنیا نہیں دیکھی۔ باتیں بنانے' تقریریں جھاڑ لینے اور اپنی منوانے سے زندگی نہیں گزرا کرتی۔'' دادی اچھا خاصا بھنا گئی تھیں۔

''ڈر ڈر کے۔ واہموں اور نام نہاد اندیشوں کے بیچ بھی زندگی نہیں گزرا کرتی۔'' وہ جل کر بولی۔

''اچھا چل بحث نہ کر اب سویرے سویرے ٹائم نکل رہا ہے' کب نکلے گی تو۔'' دادی اس کے بگڑے موڈ کے پیش نظر مصالحت پر اتر آئیں۔

جب وہ گیٹ سے نکلی تو باہر تک اس کے ساتھ آئیں۔

''دوپہر تک موسم ٹھیک ہو گیا تو میں واپسی پر آ جاؤں گی۔ پانچ منٹ رک کے دیکھ لینا۔'' دادی نے پیچھے سے اطلاع دی تھی۔

''اچھا۔'' اس نے چارونا چار سر ہلا دیا اور خدا حافظ کہہ کر نکل کھڑی ہوئی۔ جب تک موڑ نہیں مڑ گئی' دادی گیٹ کے باہر کھڑی دیکھتی رہیں۔

ڈیڑھ بجے چھٹی کی بیل بجی تو وہ راحیلہ کے ساتھ ہی گیٹ تک آئی۔

راحیلہ کا خاوند موٹر بائیک پر اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ اسے خدا حافظ کہہ کر خاوند کے ہمراہ چلی گئی۔

''پانچ منٹ سے زیادہ ہو گئے ہیں' اب کہاں دادی آئیں گی۔ یوں بھی موسم بھی کچھ خراب سا ہو رہا ہے۔'' اس نے پہلے گھڑی کو اور پھر آسمان پر چھائی بدلیوں کو دیکھا اور پھر جانے کے لئے قدم بڑھا دیے۔

اس کا راستہ اکثر و بیشتر سنسان ہی تھا۔ ٹریفک یہاں نہ ہونے کے برابر تھی۔ راہ گیر بھی کبھی کوئی اکادکا گزر جاتا تھا اور آج اس ابر آلود موسم میں اس کا بھی نام ونشان نہیں تھا۔

دیکھا جو چہرا تیرا موسم بھی پیارا لگا

وہ یونہی بے خیالی میں گنگناتی روڈ سے کچھ اونچی بنی فٹ پاتھ پر اپنے دھیان میں چل رہی تھی۔

فٹ پاتھ کے ساتھ درختوں کی لمبی لائن تھی۔ کبھی کبھار ایک آدھ گاڑی قریب سے گزر جاتی تھی۔

اسی اثنا میں پیچھے سے آتی ایک وائٹ سوزوکی کار اس سے آگے نکل کر کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر فٹ پاتھ کے ساتھ جیسے جڑ کر کھڑی ہو گئی۔

پھر اس میں سے سفید شرٹ اور براؤن پینٹ میں ملبوس ایک نوجوان باہر نکلا اور گاڑی کی پشت پر آ کر ڈگی کھول کر انجن پر جھک گیا۔

''شاید گاڑی میں کوئی فالٹ ہو گیا ہے۔''

نرمین نے یونہی سرسری سی نگاہ ڈال کر سوچا تھا۔ وہ ابھی اس سے کافی فاصلے پر تھی۔

معاً وہ نوجوان ڈگی جوں کی توں کھلی چھوڑ کر پچھلی سیٹ کی سمت آیا اور دروازہ کھول کر اندر کی سمت

جھک گیا۔

اسی اثنا میں نرمین خاصی قریب آ چکی تھی۔ اپنے فطری تجسس کے زیر اثر اس نے دھیان سے ادھر دیکھا۔

سیاہ برقعے میں ملبوس ایک نقاب پوش خاتون بری طرح نڈھال سی کیفیت میں بے ہوشی کی سرحدوں کو چھو رہی تھی۔ بے جان سے انداز میں ادھر ادھر لڑھک رہی تھی اور نوجوان اس کے صحت مند وجود کو سنبھالنے کی بے سود کوشش کر رہا تھا۔ آنکھوں کے سوا خاتون کا پورا چہرا نقاب میں تھا اور اس کی کیفیت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اچھی خاصی اذیت میں مبتلا ہے۔

نرمین اب گاڑی کے بالکل نزدیک پہنچ چکی تھی۔ ایک آخری افسوس زدہ نظر نوجوان اور بیمار خاتون پر ڈال کر اس نے اگلا قدم بڑھایا ہی تھا کہ اسے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔

''ایکسکیوزمی میڈم! کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتی ہیں؟'' نوجوان کی پریشانی اور تفکرات میں لپٹی شائستہ سی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

نقاب پوش خاتون بری طرح بے قراری سے ادھر ادھر سر پٹختی حال سے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ نوجوان کے ہاتھوں سے مچل مچل کر نکل رہی تھی۔

''آپ ذرا ایک سائیڈ کو ہو جائیں۔'' آن کی آن میں جذبۂ ہمدردی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ پھرتی سے پچھلی سیٹ کی سمت بڑھی تھی۔ نوجوان بہ سرعت پیچھے ہٹ گیا اور ڈگی کا دروازہ بند کرنے لگا۔

''کیا ہوا' کیا طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے؟'' وہ کھلے دروازے سے جھک کر خاتون کے قریب سیٹ پر بیٹھ گئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے ہمدردانہ انداز میں دریافت کر رہی تھی۔ خاتون بدستور تکلیف کے عالم میں دونوں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔

''سیدھی ہو کر بیٹھیں تاکہ کچھ تازہ ہوا لگے۔'' اس نے جھک کر اس کے صحت مند بازو کو تھام کر اسے سیدھا کرنا چاہا۔

اس وقت وہ پوری جی جان سے خاتون کی دلدہی میں مصروف تھی۔ خبر ہی نہ ہوئی کب پیچھے کا دروازہ بند ہوا اور کب اس نوجوان نے فرنٹ سیٹ پر براجمان ہو کر اپنی سائیڈ کا دروازہ بند کر کے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز پر اس نے بری طرح چونک کر سر اٹھایا تھا مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ نقاب پوش خاتون اس کی ہدایت پر اپنی نشست کا انداز بدل کر

سیدھی ہوگئی تھی اور اسی لمحے بجلی کی سی سرعت سے اپنے دائیں ہاتھ میں دبا رومال زمین کی ناک پر رکھ دیا۔

جبلی طور پر مزاحمت کے لیے اس نے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارے اور اس کھینچا تانی میں اس خاتون کا تھوڑا سا نقاب سرک گیا۔

بے دم ہوکر شعور سے لاشعور کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے وہ اتنا ہی دیکھ پائی تھی کہ نقاب کے ذرا نیچے اس ''خاتون'' کے شاطرانہ انداز میں مسکراتے ہونٹوں پر گھنی سیاہ مردانہ مونچھیں سجی تھیں۔ اس نے پوری حسیات قابو میں لاتے ہوئے ایک آخری کوشش کرنا چاہی مگر ایک ایک کر کے اس کے سارے حواس کام کرنا چھوڑ چکے تھے۔

جانے گھڑیاں بیتی تھیں کہ صدیاں جب وہ ہوش کی دنیا میں لوٹی۔ ٹھیک طرح سے آنکھیں کھولتے ہوئے آنکھوں کے پپوٹے بہت بوجھل محسوس ہو رہے تھے جیسے ان پر بہت زیادہ وزن آ پڑا ہو۔

''تم نے کمال درجے کی ذہانت کا ثبوت دیا فصیح! دونوں مرتبہ بہت مہارت سے ''شکار'' کھیلا۔'' سگار کے گہرے کش لگاتا وہ بڑے سکون سے اس نوجوان سے مخاطب تھا۔

''سر! من آنم کہ من دانم۔ یہ تو آپ کی تربیت کا اعجاز ہے' آپ کی ذرّہ نوازی ہے ورنہ بندہ کس قابل ہے۔''

وہ سر خم کر کے بڑے سبھاؤ سے اپنی کمتری ظاہر کر کے مالک کو خوش کر رہا تھا۔ ''سر! میرے لائق اور کوئی خدمت۔''

''نہیں۔ فی الحال تم آرام کرو' ہم پھر تمہیں زحمت دیں گے۔'' اور وہ سعادت مندی سے سر جھکا کر باہر نکل گیا تھا۔

''میرا خیال ہے تم ہوش میں آ چکی ہو زمین احمد! غور سے آنکھیں کھول کر اردگرد دیکھ لو۔ یہ وہی کمرا ہے جہاں تمہاری اس شاگردہ رشیدہ مریم کو لایا گیا تھا۔''

اف یہ لہجہ۔ یہ فرعون صفت چہرا۔ یہ انداز اس کے اعصاب کے بہت قریب جیسے کسی نے بم پھوڑ دیا تھا۔

''اغوا۔'' یکلخت اس کی سوئی ہوئی ساری حسیات چونک کر بیدار ہوگئیں۔ نگاہ خود بخود کلائی پر بندھی گھڑی پر جا پڑی۔ ڈائل کی چمکتی سوئیاں چھ بجا رہی تھیں۔

اس کی ڈیڑھ بجے چھٹی ہو جاتی تھی اور حد سے حد ایک بج کر پچاس منٹ پر وہ گھر کا گیٹ پیٹ رہی ہوتی تھی اور اب چھ بج رہے تھے۔

''دادی......؟'' معاً جیسے دل پر گھونسا سا لگا۔ وہ دہل کر اٹھ بیٹھی اور ہراساں نگاہوں سے اپنے گرد و پیش میں نگاہ دوڑائی۔

یہ ایک پرتعیش کمرا تھا۔ وہ کمرے کے بیچوں بیچ عالی شان سی مسہری پر دراز تھی۔ بالکل سامنے ہلکے نیلے رنگ کا صوفہ سیٹ تھا جس پر وہ شخص بڑے کرّوفر سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے' پشت سے ٹیک لگائے براجمان سگار کے کش لے رہا تھا۔ اس کے انداز میں بڑا اطمینان اور سکون تھا جیسے اسے اس وقت کسی بھی بات کی جلدی نہ ہو۔ ایک بازو تمکنت سے صوفے کی پشت کے ساتھ پھیلائے وہ جچی تلی نظروں سے اس کا اور اس کی بے ساختہ حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔

''اوہ خدایا! دادی کا تو ہارٹ فیل ہونے والا ہو گیا ہوگا۔'' زمین کے اعصاب جیسے برف ہونے لگے تھے۔

''مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔'' وہ اپنا دوپٹہ سنبھال کر بستر سے اٹھی اور بڑے نپے تلے قدم اٹھاتی عین اس کے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کرتے ہوئے وہ عمر دراز خان کو ایک دم بہت بے خوف اور نڈر لگی۔

وہ جانے کیوں دھیمے سے ہنس دیا۔

''عمر دراز خان کے بنگلے میں بیٹھی ہو اور وجہ پوچھتی ہو حالانکہ ہم تمہیں بتا چکے ہیں کہ تمہاری جرأت اور دلیری کو ''خراج'' دینے کے لیے ایک دن تمہیں ضرور زحمت دیں گے۔ کہو کیسا لگا یہ ''تحفہ''......''

جواب میں وہ سانپ کی طرح پلکیں جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ اس کے اندر اتنا غصہ جمع ہو گیا تھا کہ قوتِ گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی ہو۔

''امید ہے اب تمہیں ہماری بات سمجھ میں آ گئی ہوگی۔ ہمیں معلوم ہے تم اپنی دادی سے بہت محبت کرتی ہو۔ یقیناً انہیں زیادہ دیر تک تکلیف میں تڑپتا نہیں دیکھنا چاہو گی۔ ہمیں بھی جلدی ہے۔ ہزار طرح کے دوسرے دھندے نپٹانے ہیں۔ کاغذ قلم تمہارے سامنے ٹیبل پر پڑے ہیں۔ ہمیں بس ایک تحریر چاہیے جس میں تمہارے دستخط کے ہمراہ کچھ اس طرح درج ہو کہ نعمان پیرزادہ پر عائد کیے جانے والے الزامات درست نہیں ہیں لہٰذا اسے دیگر طالب علموں کی طرح امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

باقی عبارت تم خود بنالوگی ہم سے زیادہ بہتر جانتی ہو۔تمہاری طرف سے جاری کیا گیا یہ کیریکٹر سرٹیفکیٹ بہت کافی ہوگا کیونکہ اس سلسلے میں پرنسپل نیازی نے سارا معاملہ تم پر چھوڑا ہوا ہے۔'' گویا ''اوپر'' تک پہنچ لڑائی جا چکی تھی۔

کتنی ہی دیر زمین ساکت وصامت کھڑی اپنے بکھرے سلگتے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔وہ اپنی بات کہہ کر اب اس کی طرف سے عمل درآمد کے لیے منتظر تھا۔

''میں نے پہلے بھی کہا تھا مسٹر عمر دراز خان کہ یہ چیپٹر کلوز ہو چکا ہے۔'' اس نے بالآخر سر اٹھایا۔

''نعمان پیرزادہ جیسے بھیڑیے کو درس گاہ جیسے مقدس مقام میں گھس کر درندگی کا مظاہرہ کرنے کی اجازت کیونکر دے سکتی ہوں۔میں ایک استاد ہوں' عزت' شرافت' برابری اور توازن کا سبق پڑھانے والی۔ایک ''مجرم'' کو ''محترم'' کیسے قرار دے سکتی ہوں۔اس گندی مچھلی کو پاکیزہ جل میں داخل کر کے ساری فضا خراب کر دوں؟ یہ پوری قوم کے بچوں کے مستقبل کا سوال ہے اور اب مجھے یہاں سے جانے دو۔''

اس نے بہت ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحمل سے جواب دیا تھا۔

''بہت بھولی ہو زمین احمد! اتنی معصومیت بھی اچھی نہیں ہوتی۔ہم نے بازی ہارنا نہیں سیکھا۔کھیلنے سے پہلے اپنی جیت کے تمام امکانات سامنے رکھتے ہیں۔بہت آگے تک جا کر چال چلنے کے پہلو کھنگالنے کا ہنر جانتے ہیں۔کیا تم سوچ سکتی ہو رات گئے گھر نہ لوٹنے والی لڑکی کے لواحقین' اہل محلہ کی سوالیہ نظروں کا کیا جواب دیتے ہوں گے؟''

دھک۔اس نے ایک ہی جست میں جیسے اسے آسمان سے زمین پر لا پٹخا تھا۔

زمین کے دل کو جیسے پنکھے سے لگ گئے ہوں۔یوں دھڑ دھڑانے لگا جیسے ابھی جسم سے نکل بھاگے گا۔

''مجھے جانے دو عمر دراز خان!'' اس کی ساری طراری پل میں ہوا ہوگئی۔لہجے میں مصلحت آمیز نرمی در آئی تھی۔

''ہمارا مطالبہ پورا کر دو۔ڈرائیور ابھی اور اسی وقت خود تمہیں تمہارے دروازے پر چھوڑ آئے گا۔'' اس کا انداز حتمی تھا۔

''اور اگر میں یہ مطالبہ پورا نہ کروں تو؟'' زمین نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔

''تو......'' عمر دراز خان نے سر سے پیر تک جانچنے والی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

سبز کاٹن کے ڈھیلے ڈھالے اسٹائلش سے لباس میں نازک سراپا متاثر کن تھا۔

اس کا سنہری شفاف وسادہ چہرا کشش کے خزینے اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔

''تو مطالبے کی نوعیت بدل بھی سکتی ہے' کہ بہر حال اپر ہینڈ ہمیں کو حاصل ہے۔'' بالآخر وہ گویا ہوا۔

اس کا لہجہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑا گیا۔وہ اس کی نظروں کی بدلتی کیفیت سے گھبرا سی گئی تھی۔

اپنی سدا کی بے دھیان فطرت کے باعث اس کے احساسات صورتِ حال کی گہرائی کی پیمائش کرنے سے قاصر رہے تھے۔یہ پہلو تو وہ فراموش ہی کر بیٹھی تھی کہ وہ ایک نوجوان لڑکی ہے اور اس وقت ایک بھرپور دبنگ اور طاقت ور مرد کے رحم وکرم پہ ہے۔عمر دراز خان کو بھی اس سے پہلے اس کی فطری ''کمزوری'' کا سرا نہیں ملا تھا اور اب جیسے اس کے اندر ایک حتمی انداز در آیا تھا۔

''تمہارے پاس اس وقت دو راستے ہیں۔اپنے اصولوں کی قربانی دے دو اور عزت کے ساتھ گھر جاؤ یا پھر عزت لٹا دو اور اصولوں کی پوٹلی ہمراہ باندھ کے لے جاؤ۔ہم تمہیں دو گھنٹے دیتے ہیں سوچنے کے لیے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم دو صدیاں دینے پر قادر ہوتے تو بھی میرا یہی جواب ہونا تھا۔میں اصولوں پر سمجھوتا کسی قیمت پر نہیں کروں گی اور جہاں تک عزت کا سوال پیدا ہوتا ہے تو مسٹر عمر دراز خان' عزت اور ذلت دینا تمہارے جیسے ہیچ فطرت لوگوں کے اختیار میں نہیں ہے۔یہ خدا کی دین ہوتی ہے۔میری عزت وآبرو کی حفاظت کرنے والا میرا خدا ہے۔تم جیسے بھیڑیے اور انسان نما درندے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

اس کے لہجے سے برستی آگ نے غرور ونخوت اور خود پسندی کی مٹی سے بنے اس شخص کو آن کی آن میں سوکھی لکڑی کی طرح جھلسا کر راکھ کر دیا۔

''اور اب ہم تمہیں بتائیں گے کہ ہم کیا ہیں۔ہم تو نعمان کی استاد ہونے کے ناتے انتہا درجے کی شرافت اور انسانیت نوازی کا سلوک روا رکھے ہوئے تھے۔''

بجلی کی سی سرعت سے اس نے بڑھ کر دروازہ لاک کیا اور خطرناک تیور لیے اس کی سمت جھپٹا تھا۔

ایک لمحے کو زمین کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔فرار کا راستہ مسدود تھا۔اسے لگا جیسے یہ درندہ لمحوں میں اس کے وجود کو نگل جائے گا۔اس کے پیروں میں جیسے کسی نے میخیں گاڑ دی تھیں۔

زمین کی سانسیں رکنے لگیں۔اس نے بے اختیار تڑپ کر کروٹ بدلی' اس کے کروٹ بدلنے سے

ایک تکیہ اپنی جگہ سے کھسک گیا اور اس کے نیچے اس کا سیاہ چمک دار چھوٹا سا ریوالور جھلک دکھانے لگا۔

زرمین کو یوں محسوس ہوا جیسے مددِ خداوندی آن پہنچی ہو۔ پسلیاں توڑ کر باہر نکلتے دھڑ دھڑاتے دل کو سنبھال کر اس نے پلک جھپکتے میں جھپٹا مار کر ریوالور اٹھایا اور بے سوچے سمجھے خود سے لحظہ بہ لحظہ قریب ہوتی اس عفریت کی سمت تان کر ٹریگر دبا دیا۔

یہ ایک قطعی غیر ارادی فعل تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی اصلی ریوالور نہیں دیکھا تھا کجا کہ اس کو استعمال کرنا۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان کو اپنی خفیہ صلاحیتوں کا اندازہ غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنے پر ہی ہوتا ہے۔

وہ کون سا ماہر نشانہ باز تھی' بس اتنا ہی بہت تھا کہ اس کے ہاتھ بچاؤ کے لیے ایک ہتھیار آ گیا تھا۔ اس کا مقصد اسے استعمال کرنا نہیں تھا بلکہ اسے آڑ بنا کر عمر دراز کو اس کے مذموم مقاصد میں ناکام کرنا اور یہاں سے فرار ہونا تھا۔

گولی عمر دراز خان کے بائیں بازو کا اوپری گوشت چیرتے ہوئے پار نکل گئی تھی۔ اس نے بس آستین سے ٹپکتے سرخ لہو پر نظر ڈالی اور تیزی سے بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے خیال سے گولی کے زخم اور اس کے ہاتھ میں تھامے ریوالور کے باعث عمر دراز اس کے لیے خطرناک نہیں رہا تھا اسی لیے وہ اطمینان سے بستر سے لڑھک کر سیدھی ہوئی تھی اور یہی اس کی بھول تھی۔

عمر دراز خان جیسے لوگوں کے لیے تو ریوالور کلاشنکوف جیسے کھلونوں سے کھیلنا معمول کی بات تھی۔ وہ سرخ بھیگی آستین پر ایک نگاہ ڈالنے کی زحمت کیے بغیر چیتے کی سی پھرتی سے اس کی سمت لپکا اور اس سے پیشتر کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر ریوالور اس کی سمت تان کر دروازے کی سمت بڑھتی عمر دراز خان اس کی پشت پر پہنچ چکا تھا۔

مارشل آرٹ کا استعمال کرتے ہوئے ایک نپا تلا ہاتھ اس کے ریوالور تھامے ہاتھ پر رسید کرتے ہی ریوالور زرمین کے ہاتھ سے پکے ہوئے پھل کی طرح زمین پر جا گرا۔

''چٹاخ۔'' ایک بھرپور مردانہ ہاتھ پانچوں انگلیوں کے نشان اس کے سنہرے گداز گالوں پر چھوڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے وجود کو جھٹکا لگا اور اگلے لمحے عمر دراز نے اسے کسی بے جان کھلونے کی طرح اٹھا کر بے دردی سے دوبارہ مسہری پر پٹخ دیا۔ اس بار چونکہ بغیر دیکھے بھالے اشتعال کے عالم میں پھینکا گیا تھا اس لیے اس کا سر بری طرح مسہری کی لکڑی کی بنی ہوئی منقش کٹاؤ دار پشت سے ٹکرا گیا۔ اس کی نظروں میں جیسے زمین و آسمان گھوم کر رہ گئے۔ سر کے ساتھ ساتھ پورا جسم بری طرح ڈول

چرمرا کر رہ گیا کہ بے اختیار اس کے ضبط سے بھینچے لبوں سے سسکیاں بلند ہونے لگیں۔ آنکھوں
آگے جیسے تارے سے ناچ رہے تھے۔

تکلیف کے بے پناہ احساس کے ساتھ اس نے بمشکل تمام پلکیں اٹھا کر سامنے کھڑے اس سفاک
ان نما درندے کی سمت دیکھا جس کا چہرا تپ کر بالکل انگارہ ہو رہا تھا۔ سانسیں دھونکنی کی طرح چل
تھیں۔ آنکھیں بالکل کسی درندے کی طرح سرخ دہکتی ہوئی چنگاریاں بنی ہوئی تھیں۔

صحیح معنوں میں خوف و ہراس کا بے پناہ ریلا جیسے اس کے اعصاب ٹھٹھرا گیا۔ اپنی جسمانی تکلیف
قطع نظر اس وقت اسے اپنی عزت کے بچاؤ کے لیے جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

خلاف توقع وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا شرربار نگاہوں سے اسے گھورتا رہا۔

''یہ خون دیکھ رہی ہو زرمین احمد!'' اس نے اپنی لہو ٹپکاتی آستین کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اوپر کیا تھا۔

''یہ خون عمر دراز خان کے بدن سے نکل کر مٹی میں مل رہا ہے۔ عمر دراز خان بڑا عالی نسب ہے اور
کا لہو اتنا ارزاں کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بے وقعت' بے حیثیت اور بے توقیری لڑکی کے ہاتھوں ضائع
جائے۔ کسی دشمن کی گولی سے زخم لگتا تو ہم خوش ہوتے کہ اس صورت میں اس بہتے لہو نے ہمارے
انتقام کے الاؤ کو مزید روشن کر دیا تھا۔ ہمیں نئی قوت دی ہے ٹپکتے ہوئے لہو کے یہ قطرے پھول بن
نے تھے مگر اب صنفِ نازک ایک معمولی سی کمزور سی لڑکی کے ہاتھوں لگنے والے زخم سے ٹپکتے یہ
رے ہمارے لیے انگارے بن گئے ہیں۔ ہماری غیرت اور مردانگی کے لیے کھلا چیلنج بن گئے ہیں۔
ج تک کسی کو عمر دراز خان کی عالی شان ہستی کی اتنی توہین کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ تم نے ہماری
ہماری مردانگی اور عزتِ نفس پر کوڑے برسائے ہیں۔ اب ہمارا ارادہ بدل گیا ہے۔ ہماری توہین
رنے والا اتنی آسان موت کیسے مر سکتا ہے۔ ہم نے تو بہت مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمہیں
اریوں سے بچانا چاہا تھا مگر تم نے خود اپنے لیے جیتے جی جہنم کا چناؤ کر لیا ہے۔ ہمارے بازو سے ٹپکتا
ہو اب تمہاری آنکھ سے بہے گا زرمین احمد۔ ہمیشہ۔ میرا زخم تو دو دن میں مندمل ہو جائے گا مگر تمہاری
ح اب تا عمر زخمی پرندے کی طرح تمہارے منتخب کردہ زندان میں سڑتی رہے گی۔''

اس کا پراسرار سا بے رحم سفاک لہجہ اسے خوف اور وحشت کے سمندر میں غرق کر گیا۔

''تم مجھے تسخیر نہیں کر سکتے۔ کبھی نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔ میں تمہیں خود پر حاوی نہیں ہونے دوں گی عمر
ز خان!'' وہ دونوں بازو اپنے وجود کے گرد سمیٹتے ہوئے آنسوؤں میں گھلی خوف زدہ آواز میں بولی
ما۔ جواب میں عمر دراز خان کا اونچا قہقہہ اسے سہا گیا۔

"وہ تو پرانی بات تھی۔ وہ دونوں مطالبے تو اب ختم ہوگئے ہیں۔ وہ تو احتراموں میں لپیٹے اند
تھے۔ اب صورتِ حال مختلف ہے۔ ہم تو انسانیت برت رہے تھے۔ بہت نرم پڑ گئے تھے۔ اب کھل
بتائیں گے کہ عمر دراز خان کس چیز کا نام ہے۔ تم نے تو ابھی دنیا دیکھی ہی نہیں۔ ہم تمہیں عزت اور
عزتی کا اصل فرق سمجھائیں گے۔ پوری 'وضاحتوں' کے ساتھ۔ وہ سبق بھی پڑھائیں گے جس سے
ابھی تک نابلد رہی ہو۔"

اس کا لہجہ سفاکانہ معنی خیزی لیے ہوئے تھا۔

وہ اندر ہی اندر کانپ کر رہ گئی۔ وہ کیا کرنے والا تھا۔

"فصیح! اندر آؤ۔" اس نے انٹرکام کا بٹن پش کر کے تحکمانہ کہا تھا۔

"جی سر!" لمحوں میں وہی سفید سوزوکی والا نوجوان اپنے باس کے حضور کھڑا تھا۔

"دیکھو جیپ نکالو اور اس "مہمان" کو نہایت عزت واحترام سے ہمارے خاص ٹھکانے پر
دو۔ مستانی شاہ کو اچھی طرح سمجھا دینا کہ خاص خیال رکھے۔ ہمیں آج ایک انتہائی ضروری کام
یہاں شہر میں ہم کل رات کو پہنچیں گے۔ تب تک تم ادھر ہی رہو گے مستانی شاہ کے ساتھ۔" وہ ہدا
دے رہا تھا۔

"اور ہاں بینڈیج کا سامان پہنچا دینا ذرا۔"

فصیح سر ہلا کر تعمیل کے لیے پلٹ رہا تھا کہ اس نے پیچھے سے آواز لگا دی۔ فصیح نے مڑ کر دیکھ
ر پھر اس کی خون سے سرخ بھیگی آستین پر نگاہ پڑتے ہی ٹھٹک گیا۔

"اوہ سر! آپ کا تو بہت خون بہہ گیا۔" وہ پریشان سا ہو گیا تھا۔

"ہم ایسے زخموں کو سوئی کی نوک کی ہلکی سی چبھن سے بھی کم گردانتے ہیں فصیح! اور یہ تم اچھی
جانتے ہو۔ زخم کھا کر مخالف پارٹی کو زخم دینے کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ زخم
سے زیادہ ہماری آن پر ہماری انا اور ہماری غیرت پر لگا ہے۔ خیر اسے دھونے کا فن بھی ہمیں
ہے پھر ابھی تو ابتدا ہے۔" اس نے نہایت لاپروائی سے سر جھٹک کر اک انگارہ نگاہ زمین پر ڈالی تھ
اندر ہی اندر اس کے پراسرار انداز سے پریشان ہوئے جا رہی تھی۔

"مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟"

"ایک ایسی جگہ جہاں سے بچ نکلنے کا رستہ صرف ایک ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے شہ
کی انگلی اٹھا کر اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

زمین کے اندر خوف کا ایک بھونچال سا آ گیا۔

"میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ تمہیں کیا کہا ہے؟ خود ہی مجھے کہتے ہو کہ میں ایک معمولی سے بے
یت سی لڑکی ہوں تو پھر مجھ سے ضد باندھنے سے کیا حاصل۔ تمہارا کام میں نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے
زرت' اگر تمہیں محسوس ہوا ہے کہ میں نے تمہاری انا اور مردانگی پر ضرب لگائی ہے تو میں اس پر بھی
زرت کر لیتی ہوں۔ اس کے سوا اور کیا چاہیے۔ پلیز مجھے جانے دو عمر دراز خان! میری دادی بے
ت مر جائے گی۔"

عام حالات میں وہ شاید قیامت تک اس رعونت اور غرور کے لبادے میں لتھڑے شخص کے آگے
یار نہ ڈالتی مگر اس وقت اتنی سنگین صورتِ حال میں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مصالحت' معذرت اور
نواست کے سے انداز اپنانے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"معذرت کرنا اچھی بات ہے مگر وہاں جہاں ضرورت ہو۔ وقت گزر جانے کے بعد اس کا استعمال
بے مصرف بن جاتا ہے اور اب کوئی گنجائش نہیں رہی۔ جاؤ فصیح! بینڈیج ہم خود کر لیں گے۔ تم اب
انہ ہو جاؤ۔ ہم چاہتے ہیں رات گہری پڑنے سے پہلے پہلے تم وہاں پہنچ جاؤ اور ہاں ہماری مہمان
ی تھک گئی ہیں۔ بہتر ہو گا انہیں کچھ دیر کے لیے آرام کرنے دیا جائے۔"

فصیح اپنے باس کی بات کا مفہوم سمجھتے ہی پھرتی سے بڑے غیر محسوس انداز میں مسہری کی پشت کی
ت بڑھا تھا اور اس سے پہلے کہ زمین کچھ سمجھتی کلوروفام سے بھیگا رومال اس کے نتھنوں کو چھو چکا تھا۔

اس کے بے ہوش وجود کو پچھلی سیٹ پر احتیاط سے ڈال کر فصیح ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا اور پھر جیپ
پنے مطلوبہ راستے پر ڈال دی جو آگے جا کر دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔ شام کے گھنے سائے اب
ت کی تاریکیوں کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔

جیپ جانے کتنی دیر تک کچے پکے اونچے نیچے پہاڑی راستوں پر بھاگتی رہی تھی۔

اس نے دوبارہ ہوش وحواس کی سرزمین پر قدم رکھا تو اسے اپنا سر بری طرح درد سے پھٹتا ہوا
وس ہو رہا تھا۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

آنکھ کھلتے ہی یہ احساس تو ہو گیا تھا کہ وہ اس وقت کمرے میں تنہا ہے اور باہر کھلنے والا لکڑی کا
ری آبنوسی دروازہ سختی سے بند ہے۔

اس نے چاروں طرف طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ کمرا اچھا خاصا کھلا تھا۔ ایک طرح کی بیٹھک تھی۔

بائیں دیوار کے ساتھ پرانے طرز کی بھاری لکڑی کی گدی دار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں آتش دان بنا ہوا تھا۔ فرش پر سبز دبیز ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ دائیں دیوار پر قدیم طرز کا صوفہ سیٹ دھرا تھا۔ صوفے کے ساتھ درمیانے سائز کی لکڑی کی میز تھی جس پر شیشے کا پانی سے بھرا جگ اور گلاس رکھا ہوا تھا۔

وہ بمشکل تمام اپنے جسم سے اٹھتی ٹیسیں دبا کر اٹھ بیٹھی۔ حلق میں جیسے کانٹے سے چبھتے محسوس ہو رہے تھے۔ اب جو پانی دیکھا تو پیاس اور شدت سے بھڑک اٹھی۔

لرزتے ہاتھوں سے پانی گلاس میں انڈیل کر وہ غٹا غٹ چڑھا گئی۔ اپنے اوپر غور کیا وہ ایک پرانے طرز کے تخت پر دراز تھی۔ اردگرد گاؤ تکیے بھی تھے۔ کچھ گاؤ تکیے قالین اور صوفے پر بھی دھرے ہوئے تھے۔ تخت پر مخملیں نرم کمبل کی تہیں تھیں۔ اس نے اپنی حالت پر نگاہ کی۔ کندھوں تک لمبے بال چٹیا سے نکل کر چہرے اور گردن کے گرد پریشان تھے۔ سبز کپڑے بری طرح ملگجے ہو رہے تھے۔

''یا خدا! یہ میں کہاں آ گئی ہوں۔'' اس نے اسی بڑے سے بند کمرے سے روشنی کی درز تلاش کرنے کے لیے اردگرد نظر دوڑائی' بالآخر سامنے واحد داخلی دروازے سے کچھ ہٹ کر لکڑی کی چوڑی سی کھڑکی نظر آ ہی گئی۔ وہ تیزی سے اس کی سمت لپکی۔

کھڑکی کافی مشکل سے کھلی۔ اس کے تختے سخت پڑ گئے تھے۔ شاید بڑی مدت سے انسانی لمس سے محروم تھے۔ دونوں پٹ کھولنے میں تو کامیاب نہ ہو سکی البتہ ایک پٹ ضرور وا ہو گیا تھا۔ اس نے تجسس اور بے قراری سے سر ڈال کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

جہاں تک نظر پڑی تھی سنگلاخ بھورے' سیاہی مائل سبز فلک بوس پہاڑ ہی پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ ہوا میں خنک سی نمی اسے اجنبی دیس کی طرح بے گانہ اور نامانوس سی لگی تھی۔

گویا وہ اپنے شہر' اپنے ضلع' اپنے ڈویژن سے ہی نہیں اپنے صوبے سے بھی نکل آئی تھی۔

حواس باختہ سی نظریں اس نے اپنی گھڑی پر دوڑائیں اور دھک سے رہ گئی۔

وہ دو تاریخ کی دوپہر کو اغوا ہوئی تھی اور اسی شام سات بجے اسے اس ''مخصوص ٹھکانے'' پر پہنچانے کے لیے بے ہوش کر دیا گیا تھا اور اب آج چار تاریخ ہو گئی تھی اور گھڑی شام کے پانچ بجا رہی تھی۔

اس نے بے یقین نظروں سے بے اختیار کئی بار گھڑی کی طرف دیکھا۔

''یہ میری تیسری رات ہے گھر سے نکلے ہوئے۔''

اس کے کلیجے میں جیسے کوئی برمے سے چھید کیے دے رہا تھا۔

''دادی۔ پیاری دادی۔ ارے وہ تو دکھیاری جیتے جی مر گئی ہو گی۔ کس حال میں ہو گی بھلا۔ ایک دفعہ جب میٹرک کے اسٹوڈنٹس کی فیئر ویل تھی شام کو اور میں پانچ بجے گھر آئی تھی حالانکہ بتا کر بھی گئی تھی پھر بھی کتنا پریشان تھیں وہ اور دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ ''تیرے بغیر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا مینا۔'' میرے خفا ہونے پر کتنی بے چارگی سے بولی تھیں۔ اب تین دن ہو گئے ہیں۔ جانے کچھ کھایا بھی ہو گا کہ نہیں۔ کس قدر ذہنی اذیت میں ہوں گی۔ میرے خدا میں کیا کروں۔''

اس کو اپنے آنسوؤں پر اختیار نہ رہا۔ بے اختیاری کی سی کیفیت میں کتنے ہی اشک مچل مچل کر آنکھوں سے گالوں تک کا سفر طے کرتے ہوئے قمیص میں جذب ہو گئے۔

معاً باہر سے قفل کھولنے کی آواز آئی پھر لکڑی کا بھاری آبنوسی دروازہ چرچرایا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

اسی لمحے ہلکی نیلی شرٹ اور براؤن پینٹ میں ملبوس فصیح نپے تلے قدموں سے اندر داخل ہوا۔

''آپ اٹھ گئیں۔ چلیں اچھی بات ہے۔ حکم کیجیے کیا لیں گی۔ ناشتا چائے یا کھانا۔'' اس کے انداز میں شائستہ قسم کی تابعداری تھی۔

جواب میں خاموشی طاری رہی تو فصیح نے سر اٹھا کر دوبارہ مخاطب کرنے کی غرض سے اس کی سمت دیکھا اور چونک سا گیا۔ اس کا سارا چہرا آنسوؤں سے تربتر تھا۔

''آپ رو رہی ہیں؟ رونے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ الٹا مزید انرجی کم ہو جائے گی۔ افسوس کہ سر کے ساتھ آپ کا معاملہ سیٹ نہیں ہو سکا اور انہیں یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا' وگرنہ کم از کم صنفِ نازک کو اس خاص ٹھکانے تک لانے کی نوبت آج تک نہیں آئی۔ بہرحال مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی ہی ہو سکتی ہے اور وہ ہے۔ اگر آپ فریش ہونا چاہیں تو میں آپ کی باتھ روم تک رہنمائی کر دوں۔ سر کی ہدایت پر میں نے شہر سے آپ کے قد و قامت کو مدنظر رکھ کر چار پانچ جوڑے کپڑوں کے لے لیے تھے۔ ادھر ساتھ والے کمرے میں الماری میں رکھے ہوئے ہیں' کم ہوئے تو اور آ جائیں گے۔ ابھی نہ جانے کب تک آپ کو یہاں رہنا پڑے گا۔''

اس کے لہجے میں ہمدردی' تعاون اور افسوس کی جھلک تھی۔

نرمین نے کچھ سوچ کر جانچتی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا کسرتی بدن کا حامل اسمارٹ اور پرکشش نوجوان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت اور ٹھہراؤ تھا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں نرمین کے ذہن میں ایک آئیڈیا جیسے اڑ کے فٹ ہو گیا۔

"سنو فصیح! کیا یہاں سے نکلنے کا کوئی آسان سا راستہ ہے۔" اس کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا جوش و خروش تھا۔ فصیح عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

"پیرزادہ صاحب کی زندگی لفظ "آسانی" سے قطعی خالی ہے۔ وہ بڑی نڈر اور دلیر فطرت کے مالک ہیں۔ انہوں نے ایسی جگہ پر رہائش گاہ بنائی ہے جہاں عام آدمی پر بھی نہیں مار سکتا۔ اس جگہ کا روڈ کے ساتھ لنک نہیں ہے۔ حتیٰ کہ جیپ بھی یہاں سے میل بھر کے فاصلے پر کھڑی کرنی پڑتی ہے اور آگے کا راستہ پیدل طے کر کے آنا پڑتا ہے اور یہ راستہ بھی کوئی سیدھا سادہ نہیں ہے۔ پہاڑی چٹانوں، جھاڑیوں، کھائیوں سے ہو کر جاتا ہے۔ کوئی انجان شخص اگر جیپ تک آ بھی جائے تو بھی وہاں سے یہاں تک پہنچنے کا صحیح راستہ تلاش نہیں کر پائے گا اور ادھر ادھر بھٹکتا رہ جائے گا یا پھر کسی جنگلی درندے کا شکار بن جائے گا۔"

وہ بے ساختہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔

"مگر تم تو جانتے ہو گے ناں۔" اس نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ تنکے کا سہارا نہ لیتی تو اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

"ہاں۔ فقط میں، پیرزادہ صاحب اور مستانی شاہ ان راستوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔"

"فصیح! تم طرزِ گفتگو چال ڈھال سے کسی شریف خاندان کے دکھائی دیتے ہو۔ یقیناً تمہارے والدین نے تمہیں کسی بے کس اور بے یار و مددگار کی مدد کرنے اور مظلوم کو ظالم کے پنجے سے چھڑا کر نیکی کمانے کے سبق پڑھائے ہوں گے۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟ دیکھو میرا اس دنیا میں اپنی دادی کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ وہ میرے بغیر مر جائے گی۔"

مغرور اور متکبر شخص کے آگے اپنی بے بسی اور لاچاری کا اظہار کرنا خودداری کی توہین محسوس ہوتا ہے، لیکن کسی ہمدرد فطرت اور انسانیت کی رمق رکھنے والے بندے کے سامنے مجبوریوں کی گرہیں کھول کر دکھانے میں البتہ کوئی خاص جھجک محسوس نہیں ہوا کرتی، سو اس نے رسک لے ہی لیا تھا۔

"بعض اوقات بچپن میں ہم جو کچھ سیکھتے ہیں بڑے ہو کر معاشرہ اس "سکھائی پڑھائی" کو بری طرح رد کر دیا کرتا ہے۔" اس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ "والدین تو بچے کو یہ بھی سکھاتے ہیں کہ بدعہدی اور بے وفائی کرنا جرم عظیم ہوتا ہے پھر میں پیرزادہ صاحب کے اعتماد کو ٹھیس کیسے پہنچا سکتا ہوں۔"

"ظالم کا ساتھ دینا، ظلم کرنے کے برابر ہوتا ہے، یہ بدعہدی اور بے وفائی نہیں ہوگی اور پھر تم سوچو تم جس غلط راستے پر آنکھیں بند کر کے اپنے پیرزادہ صاحب کے پیچھے چل رہے ہو اس کا انجام بربادی اور تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔"

وہ غیر محسوس طریقے سے جذباتی بلیک میلنگ کر رہی تھی کہ اس وقت اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

"میں نے خود ہی اپنی مرضی سے یہ راہیں چنی ہیں۔ پیرزادہ صاحب نے کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ میری ضرورتیں مجھے ان کے در تک لے آئی تھیں۔" اس کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہیں آئی تھی۔ نرمین کچھ مایوس سی ہو گئی۔

"اب انسان کو اتنا بھی نفس کا غلام نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے ایک آخری کوشش کی۔

"میں چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں۔ باپ میرا مزدور تھا۔ ایک دن اینٹیں اوپر چھت تک پہنچاتے ہوئے راستے میں ہانپ کر نیچے گر پڑا اور کافی دن ہسپتال میں رہا۔ ماں اور بہنوں نے سلائی مشین چلا چلا کر ارمانوں سے مجھے ایم اے کرایا تھا، مگر دو سال جوتیاں چٹخانے کے باوجود کہیں نوکری نہ ملی۔ گھر میں فاقوں تک کی نوبت آن پہنچی تھی پھر قسمت نے مجھے پیرزادہ صاحب سے ملا دیا اور آج فقط ڈیڑھ سال ہو رہا ہے ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے، اور میری چار بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں اور پانچویں کا جہیز بھی تقریباً تقریباً تیار ہو چکا ہے۔ آخری والی ابھی پڑھ رہی ہے، میرے باپ کا علاج ہو رہا ہے، میری ماں نے سکھ کا سانس لیا ہے۔ جب بات بنیادی ضروریات کی فراہمی تک آن پہنچے تو ذریعہ معاش ثانوی سی چیز بن کر رہ جاتا ہے۔ میں پور پور پیرزادہ صاحب کا احسان مند ہوں، ان کا مشکور ہوں اور ان کے مفادات کا ہر ممکن تحفظ کرنا میرے ایمان میں شامل ہے۔ آپ فرمائیے، پہلے کھانا کھائیں گی یا لباس تبدیل کریں گی۔"

اس کے دوٹوک قطعی انداز نے نرمین کو مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا۔ وہ دلگیر سے انداز میں دوبارہ تخت پر جا بیٹھی۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ تم جاؤ۔" اس نے نروٹھے پن سے کہا۔

"شام سات بجے تک پیرزادہ صاحب آ جائیں گے۔ ان کے آتے ہی میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔ پیچھے مستانی شاہ ہی بچے گا۔ وہ اردو قطعی نہیں جانتا، اس لیے اس سے کسی قسم کی کوئی بات پوچھنے یا منوانے کی کوشش بے سود ہوگی۔ اس کا کام باہر پہرہ دینا اور تین وقت کا کھانا تیار کرنا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو یہاں کوئی ذی نفس نہیں ملے گا۔ اس لیے مناسب ہوگا اگر آپ ابھی سے اپنی ضروریات

کی نوعیت مجھے بتا کر ضروری معلومات حاصل کرلیں۔اس میں آپ کا ہی فائدہ ہوگا۔پیرزادہ صاحب کے مزاج کا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔یہ ہوسکتا ہے ہر دوسرے تیسرے دن چکر لگاتے رہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہفتوں پلٹ کر خبر نہ لیں۔ایسے میں آپ مکمل طور پر مستانی شاہ کے رحم وکرم پر ہوں گی' جو مقامی بولی کے علاوہ کوئی زبان نہیں جانتا۔آپ کے لیے بہت مشکل ہوجائے گی۔''

وہ اس کی آئندہ زندگی کا دل دہلا دینے والا نقشہ کھینچ رہا تھا۔وہ بے یقین سی وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس کا ایک ایک لفظ زرمین کے اندر عجیب سے واہمے اور خوف جگا رہا تھا۔

وہ چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی۔جب اس سے میری جنگ نہیں تو اس کے ساتھ معرکہ آرائی سے کیا حاصل ہے۔اس کی رہنمائی میں وہ بیٹھک کے واحد دروازے سے باہر نکلی' بالکل سامنے ہی لمبا سا کوریڈور تھا جس کے اختتام پر لکڑی کا مضبوط پھاٹک تھا۔کوریڈور کے دائیں جانب ایک دروازہ تھا جسے کھول کر وہ اسے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر داخل ہوگیا تھا۔یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔دولکڑی کے سادا سے پلنگ بچھے تھے اور ایک دیوار گیر الماری تھی جسے کھول کر فصیح نے اسے ہینگر پر لٹکے کپڑے دکھائے تھے۔الماری خاصی کھلی تھی اور یہاں بہت سے مردانہ سوٹ بھی ہینگرز میں پریس کیے لٹک رہے تھے۔نیچے ریک میں قیمتی مردانہ جوگرز' پشاوری چپل اور سلیپر وغیرہ کے بہت سے جوڑے تھے' ایک اسٹینڈ پر کمرے کے دائیں جانب چار پانچ صاف ستھرے تولیے لٹک رہے تھے۔اسٹینڈ کے ساتھ ہی قدیم طرز کا دیوار گیر قد آدم آئینہ لگا ہوا تھا اور اس کے عین مقابل کی دیوار میں ایک دروازہ تھا جسے فصیح نے آگے بڑھ کر کھول دیا۔

''یہ باتھ روم ہے۔''اس کا جائزہ لے کر زرمین کو خاصی حیرت ہوئی۔باتھ روم جدید لوازمات سے پوری طرح آراستہ تھا۔اسٹائلش سانیوی بلو ٹائلز باتھ ٹب' جدید طرز کا کموڈ' خوبصورت سا بیسن' ہاف مرر' شیمپو' باتھ سوپ' شاور سب کچھ موجود تھا۔اتنی قدیم طرز کی دقیانوسی عمارت میں اتنا شاندار پرتعیش باتھ روم۔یقیناً حیرت ناک بات تھی۔

اس نے بڑی دیر تک غسل کیا' جی بھر کر تھکن اور سفر کی گرد اتاری اور کھل کر آنسوؤں کی برسات کو برسنے دیا۔اس کے دل کو جیسے کوئی کانچ کے ٹکڑے سے نوچ کھسوٹ کر زخم زخم کرتا جارہا تھا۔جانے کتنی ہی دیر گزر گئی حتیٰ کہ بند دروازے پر دستک ہوئی۔

''مس! آپ فارغ نہیں ہوئیں۔پیرزادہ صاحب تشریف لا چکے ہیں اور کھانے پر آپ کا انتظار

کر رہے ہیں۔''

فصیح نے مہذبانہ انداز میں اطلاع دی۔

اس کا جی چاہا یہیں پانی میں بیٹھے بیٹھے حلول کر جائے' اس شخص کا سامنا کرنے سے تو بچ جائے۔ دل نفرت کے دھوئیں سے اس قدر اٹ گیا تھا کہ اسے اس کی آواز' اس کا وجود اس کی موجودگی سے وحشت ہورہی تھی۔

اپنا گرد آلود لباس تبدیل کرکے اس نے ہلکے زرد رنگ کا شلوار سوٹ جیسے طوہاً وکرہاً جسم پر چڑھایا۔بال جھٹک کر خشک ہونے کے لیے کندھوں پر ڈالے اور ہم رنگ زرد دوپٹہ شانوں پر اچھی طرح پھیلا کر بالآخر وہ باتھ روم سے نکل آئی۔

کمرے کے داخلی دروازے پر فصیح اس کا منتظر تھا۔

''آیئے' آپ کو پیرزادہ صاحب کے پاس لے چلوں۔''

''پہرہ داری کررہے تھے تم غالباً۔فکر نہیں کرو بغیر ''تیاری'' کے نہیں بھاگوں گی۔''اس کے لبوں پر تلخ تبسم پھیل گیا تھا۔

فصیح نے خجل سا ہو کر سر کھجایا اور پھر اسے ہمراہ لے کر بیٹھک میں آگیا۔عمردراز خان صوفے پر اپنے مخصوص شاہانہ اسٹائل میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایک ہاتھ صوفے کی پشت پر پھیلائے دوسرے ہاتھ میں سگار دبائے دروازے کی سمت متوجہ گویا اس کا منتظر بیٹھا تھا۔

اس پر اچٹتی سی نظر ڈال کر اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر فصیح کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''ان سے اچھی طرح ان کی ضروریات دریافت کرلینا تھیں کہ بہرحال قیدیوں کی بنیادی ضروریات پورا کرنا فرض ہوتا ہے۔تعیش تو ہم نہ دیں گے اور نہ یہاں ایسا ممکن ہے مگر آرام پہنچانے کی بہرحال کوشش ضرور کریں گے کہ اس بیابان اجاڑ ویران جگہ قید تنہائی کاٹنا بذاتِ خود ایک کڑی سزا بن جائے گا۔''

وہ مخاطب ہوا تو اس کے لہجے اور تیوروں میں عجیب درشتی اور برفیلا پن اتر آیا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی زرمین نے ذرا دھیان سے اس کا چہرا دیکھا۔اس کے تاثرات بلا کے سرد اور پتھریلے تھے۔وہ عجیب سی بے چینی اور اضطراب کا شکار ہوگئی۔اسے لگا اس کے اندر جاگتی قوتیں دھیرے دھیرے جیسے کمزور پڑتی جارہی ہوں۔اس نے خود کو بہت بے بس سا محسوس کیا مگر یہ کیفیت بذاتِ خود اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کررہی تھی۔

"ہمارا خیال ہے تم روانہ ہو جاؤ اور چوہدری افتخار حسن والے معاملے میں جیسا کہ ہم نے تمہیں سمجھایا ہے اپنے بندوں کو گائیڈ کر کے کام پر لگا دو۔ کوئی ضروری بات ہو تو ہمارے موبائل نمبر پر انفارم کر دینا۔ ہم آنے سے پہلے تم سے سارا پروگرام طے کر لیں گے۔"

"جی سر!" وہ ایڑیوں کے بل گھوم کر الوداعی سلام کے بعد تیزی سے کمرے سے نکل گیا تھا۔

وہ بے چینی سے ہاتھ مسلتی اسے جاتا دیکھنے لگی۔ اسے لگا جیسے امید کے جگنو ایک ایک کر کے ہاتھ سے پھسلتے جا رہے ہوں۔ وہ یہاں رہتا تو شاید کسی طور مددگار ثابت ہو جاتا۔ اس کے ساتھ "ناک" کا معاملہ تو نہیں تھا ناں۔ کسی نہ کسی طرح اپنے حق میں کوئی نرمی، کوئی روشنی کی درز کا پتا لے لیتی۔ اب اس بندے کے ساتھ تو "آن" کا مسئلہ ہے نا۔ ناک نیچی ہو ہی نہیں سکتی۔

"یہ زندان تم نے خود منتخب کیا ہے اپنے لیے۔ ہمیں تم سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی لیکن تم نے اپنے لفظوں کے انگارے ہمارے سینے میں اتار کے ہمیں سرتاپا آتش فشاں بنا دیا تھا اور اب اس کے نتیجے کے طور پر ہمارے جسم سے بہنے والے ایک ایک قطرے کا حساب لینا ہم پر واجب ہو گیا ہے۔ مردانگی اور غیرت کا خون کرنے والے کسی طور پر معافی کے مستحق قرار نہیں پا سکتے۔ یاد رکھنا مرد کو چیلنج کرنے والی احمق خواتین اپنا سب کچھ گنوا لیتی ہیں۔ مرد کو سرتاپا انتقام بنا ڈالتی ہیں۔

مگر ہم تم سے تمہاری عزت نہیں لیں گے کہ یہ بھی اب ہمارے لیے چیلنج بن چکا ہے۔ ہم نے خود سے عہد باندھ لیا ہے کہ تمہاری عزت پامال کرنے کی غرض سے تمہیں خود سے قریب نہیں کریں گے بلکہ اس کے برعکس ہم جو کچھ تمہیں دیں گے یہی تمہاری سزا کے لیے بہت کافی ہو گا۔ اتنی بے آباد ویران جگہ قید تنہائی کی صورت میں بخشا ہوا ہمارا یہ "تحفہ" تمہیں برسوں ہماری یاد دلاتا رہے گا کہ تم نے کسی عمر دراز خان پیرزادہ کی آن پر حملہ کیا تھا۔"

اس کی طویل پیرائے میں کی جانے والی گفتگو کا حرف حرف پھنکار رہا تھا۔

"اب تم کھانا کھا لو۔ یقیناً ابھی تک تم نے کچھ نہیں کھایا ہو گا۔ کھانے، پینے، پہننے اوڑھنے اور سونے جاگنے کے جملہ معاملات میں تمہیں کسی قسم کی تنگی یا تکلیف نہیں ہونے دی جائے گی۔"

اس کے یاد دلانے پر زرمین کو یاد آیا۔ تین دن سے ایک کھیل بھی اڑ کر اس کے منہ تک نہیں پہنچی تھی اور اب اس کی آنتیں صحیح معنوں میں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔

طاقت ور دشمن سے نپٹنے کے لیے اپنی منتشر قوتوں کو مجتمع کرنا بہت ضروری ہوا کرتا ہے۔ سو وہ اپنی انا کی نہ نہ کی آواز کا گلا گھونٹ کر خاموشی سے میز کی طرف بڑھ گئی۔

کھانے میں بھنا ہوا مرغ، فرائی کیے ہوئے گوشت کے پارچے جات اور مرغ پلاؤ تھا۔ گرم گرم کھانے کی خوشبوؤں نے اس کی اشتہا فزوں تر کر دی۔ وہ بلا تکلف کھانا شروع ہو گئی اور اس کی تاکید سے پیشتر ہی سیر ہو کر کھایا۔

"پتا نہیں دادی نے کھانا کھایا ہو گا کہ نہیں۔" پیٹ بھرنے کے جبلی تقاضے نے یہ سوچ وقتی طور پر بھلا دی تھی مگر اب یاد آتے ہی ایک دم جیسے اس کا احساسِ ندامت جاگ اٹھا۔ اس کے حلق میں پھندے سے لگنے لگے۔

"تمہارا کیا پروگرام ہے عمر دراز خان!" بالآخر اس نے اس سے دوٹوک بات کرنے کے فیصلے پر عمل درآمد کر ہی لیا۔

اس نے شعوری کوشش سے اپنے لہجے میں کسی قسم کا جھول پیدا نہیں ہونے دیا تھا۔

"میں تمہیں بتا چکی ہوں، میں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔ مجھے میرے گھر جانے دو۔ تمہارا کام کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔"

اس نے بہت ضبط سے لہجے میں رسانیت برتی تھی۔

"اب معاملہ وہ نہیں رہا۔ نعمان پیرزادہ کا قصہ وہیں ختم ہو گیا تھا۔ آج کے بعد سے دوبارہ اس کیس کے بارے میں تم سے کوئی بات نہیں ہو گی۔ ہمیں اس سلسلے میں اب تم سے کچھ تعاون درکار نہیں ہے۔"

"تو پھر کیوں مجھے روک رکھا ہے۔" وہ ضبط کرتے کرتے بالآخر چیخ اٹھی۔ "میں نے تمہارا کیا چھینا ہے؟"

عمر دراز خان کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ در آئی۔

"ہماری ذات کا غرور، ہماری آن، ہماری مردانگی کا زعم، ہماری ہستی کا فخر، ہماری انا اور غیرت۔ بڑی لمبی فہرست ہے تمہارے جرائم کی۔ ایسا کون ہے جو ہمیں ہماری ذات کو تعارف کرانے کے بعد بھی اہمیت دیے بغیر نخوت سے آگے بڑھ جائے۔ جو ہماری ٹیلی فون کال سنے بغیر ریسیور پٹخنے کی جسارت کرے، جو ہمیں جتلائے کہ وہ ہماری رعایا نہیں ہے ہمارے زیر اثر نہیں ہے، جس کے لہجے میں ہم سے بات کرتے وقت زمانے بھر کی بے زاری اور زہریلا پن ہو۔ جو ہمارا حکم ماننے سے صاف انکار کر دے جو ہماری گرفت میں ہمارے سامنے دیدہ دلیری سے ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ہمیں تنفر و تحقیر سے دیکھے اور چیلنج کرنے والے انداز میں ہمارا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کر دے، جو ہمیں

ہمارے منہ پر بھیڑیے اور انسان نما درندے جیسے توہین آمیز القاب سے نوازے، ہمیں ذلیل کتا اور جنگلی وحشی تک کہہ ڈالے۔ کس میں اتنی جرأت ہے۔ کون ہے ایسا سورما جو عمر دراز خان پیرزادہ کی بلند وبالا ہستی کے غرور کو خاک میں ملا سکے۔"

اس کی آنکھیں بالکل سرخ ہو کر دہکنے لگی تھیں۔ نرمین کو یکدم اس سے بہت خوف سا محسوس ہوا۔ اس کی رگوں میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔

"تمہارے تمام جرائم ناقابلِ معافی ہیں۔ تم نے ایک جیتے جاگتے بھرپور مرد کو دہکتے کوئلوں کی بھٹی پہ لا بٹھایا ہے۔ اب اس تپش کو جب تک تمہارے جسم کی ایک ایک رگ محسوس نہیں کرے گی، قرار نصیب نہیں ہوگا۔ تم نے عمر دراز خان کے جسم کو نہیں اس کی مردانگی کو زخم لگایا ہے اور زخموں کا یہ لہو تمہاری آنکھوں سے برس کر ان کوئلوں کی بھٹی پر پڑے گا تو ہی یہ سرد ہوگی۔"

اس کے بہت دھیمے پن سے کہے گئے انگارہ جملوں کی دہشت نے نرمین کو بری طرح ہولا کے رکھ دیا۔ کیسی کچے گوشت کی سی بو آ رہی تھی اس کے شرربار لہجے میں۔

"تمہارے مذموم مقاصد پورے نہیں ہوں گے۔ یاد رکھو تم مجھے زیادہ دیر تک یہاں قید نہیں رکھ سکتے۔" وہ اپنی جبری فطرت سے مجبور تھی۔ اس کے فرعونی لہجے نے اس کے اندر بلبلاتی خوددار اور بہادر روح کو باہر آنے پر بے چین کر دیا تھا۔

اس کے پرعزم اور دھمکی آمیز لہجے پر عمر دراز خان نے چونک کر بہت دھیان سے اس کی طرف دیکھا۔

چند لمحے یونہی اسے دیکھتا رہا۔ نرمین نے پوری کوشش صرف کر کے اپنے پائے استقامت میں لغزش نہیں آنے دی۔

"مستانی شاہ......" پھر اس کی پاٹ دار آواز وسیع وعریض بیٹھک میں گونج اٹھی۔ چند ساعت بعد جھاڑ جھنکار نما لمبی سی داڑھی اور لمبے الجھے بکھرے گھنے سیاہ بالوں والا جسیم توانا ادھیڑ عمر شخص گلے میں سرخ نیلے پیلے پتھروں کی بے شمار مالائیں پہنے ملیشیا کے سیاہ بدرنگ سے کپڑوں میں جوتے کے بغیر کمرے میں موجود تھا۔

عمر دراز خان نے اپنی زبان میں اس سے کچھ کہا۔ جواب میں اس نے فرمانبرداری کا اعلاترین مظاہرہ کرتے ہوئے جب زور سے سر ہلایا تو اس کی مالائیں بھی بج اٹھیں۔

جب وہ پھرتی سے برتن سمیٹ رہا تھا تو اس کی دونوں مضبوط کلائیوں میں پڑے سیاہ رنگ کے

کڑے بھی بج رہے تھے۔ مستانی شاہ کا رنگ بالکل سرخ تھا گویا ابھی خون چھلکنے والا ہو۔ چہرے کا زیادہ تر حصہ سیاہ بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ چہرے پر دور دور تک کرختگی اور کھردرے پن کے ناہموار جذبات کا راج تھا۔

نرمین نے اپنا جائزہ مکمل کر کے ٹھنڈی سانس لی۔ اس کے تو حلیے سے ہی ظاہر تھا کہ اس سے کسی قسم کی ہمدردی یا نرمی کی توقع عبث تھی۔ بس اپنے آقا کا غلام ہے۔ ہونہہ جیسا باس پتھر دل اور خشک بے آب وگیاہ سا ہے ویسے ہی اس کے کارندے ہیں۔ نرمین دل ہی دل میں تلملا رہی تھی۔ برتن سمیٹ کر وہ ایک لحہ توقف کیے بغیر پھرتی سے کمرے سے نکل گیا۔

"ہم نے مستانی شاہ سے کہہ دیا ہے آج کی رات کسی قسم کی پہرہ داری کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک ضروری کام سے روانہ ہو رہے ہیں۔ تم پوری طرح آزاد ہو جیسے چاہو جس طرح چاہو یہاں سے فرار ہو سکتی ہو۔ آج کی رات تم پر کوئی زور زبردستی نہیں چلائے گا۔ تم اچھی طرح کوشش کر کے دیکھ لو تا کہ حسرت نہ رہ جائے۔ اگر آج تمہارا موڈ نہیں ہے تو ہم کل سارا دن بھی دے سکتے ہیں۔ تم نے دوسری بار ہمیں چیلنج کیا ہے۔ ہم نے گیند تمہارے کورٹ میں ڈال دی ہے۔ تم اس مختصر عرصے میں فرار کی ہر ممکن کوشش کر دیکھو مگر یاد رکھو ہماری دی ہوئی کل شام تک کی مہلت کے بعد اس قسم کی کارروائی قابلِ معافی نہیں سمجھی جائے گی۔"

نرمین نے بے یقین نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا پھر بعجلت کھڑکی کی سمت نگاہ کی جہاں رات کی تاریکی نے شام کے سارے ملگجے نقوش مٹا دیے۔

"ٹھیک ہے۔ میں کل صبح دن کی روشنی میں اپنا سفر شروع کروں گی۔ اس مہلت سے فائدہ ضرور اٹھاؤں گی خوامخواہ ہی مجھے راستے کی دشواریوں اور ہولناک مناظر سے ڈرایا جا رہا ہے۔ انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ میں جان پر کھیل کر بھی یہاں سے فرار ہونے کی پوری کوشش کروں گی۔" وہ دل ہی دل میں اپنے عزم کے تسمے باندھ رہی تھی۔

صبح کے بجائے اس کا اسی وقت رات کو فرار ہونے کا منصوبہ پختہ ہو گیا۔ ایسی ناقابلِ برداشت صورتِ حال میں صبح تک یہاں رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ سو جیسے ہی وہ بیٹھک سے نکلا اس کے ٹھیک بیس منٹ بعد وہ بھی بیٹھک کا واحد دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ لمبے سے کوریڈور کو عبور کر کے اس نے اپنے آپ کو کھلے آسمان تلے پایا۔ بالکل سامنے پھاٹک تھا اور کوریڈور سے پھاٹک تک کا حصہ سرسبز وشاداب باغیچے پر مشتمل تھا۔

اس نے احتیاط سے پھاٹک کا بھاری پٹ وا کیا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ مالک کے حکم کے بموجب پھاٹک کو کھلا رکھا گیا تھا۔

پھاٹک سے نکل کر چند قدم آگے بڑھ کر وہ الجھ کر رک گئی۔ اس کے چاروں طرف سیاہ و سبز آسمان سے باتیں کرتے پہاڑ تھے۔ اونچی نیچی گھاٹیاں تھیں' خاردار جھاڑیاں اور اکادکا درختوں سے ڈھکی کھائیاں تھیں۔ اردگرد کی فضا میں جنگلی جانوروں اور حشرات الارض کے بولنے کی مہیب آوازیں سماعت میں عجب دہشت ناک شور بن کر گونج رہی تھیں۔

''یاالٰہی۔ یہاں سے کہاں جاؤں۔ راستہ کون سا ہے۔ پہاڑ کے اوپر کی سمت سفر کروں یا کسی کھائی کے ساتھ ساتھ نیچے کی طرف جاؤں۔ راستہ کہاں ملے گا؟''

اس کا دل یکا یک خوف اور دہشت کی آماجگاہ بن گیا تھا۔

پھر اس نے یونہی قیافے سے کام لے کر ترائی کی سمت سفر کرنے کا فیصلہ کرلیا اور دھیرے دھیرے جھاڑیوں کی مضبوط شاخوں کا سہارا لے کر پتھروں پر مضبوطی سے قدم جماتی وہ نشیب کی طرف رینگنے کے انداز میں آگے بڑھنے لگی۔

آسمان پر بارہ یا تیرہ تاریخ کا چاند روشن تھا۔ روشنی کے باعث دیکھ کر راستہ تلاش کرنا خاصا سہل ہو گیا تھا۔

مگر راستہ یہاں تھا کہاں۔ ہر قدم پر اس کا دل اچھل کر حلق میں آجاتا۔ وہ اس وقت بہادری کی انتہا کو چھونے کی تگ ودو میں اردگرد کی ہراساں کر ڈالنے والی پراسرار وحشت زدہ فضا سے پیدا ہونے والے خوف و دہشت کو سر سے جھٹک کر پوری کوشش پھسلتے پتھروں اور خاردار جھاڑیوں سے بچ کر قدم جمانے میں صرف کر رہی تھی۔

اس کا عزم اس کا جنون اس کا ہمسفر بنا ہوا تھا ورنہ اتنے پر پیچ خطرناک راستوں پر کوئی لڑکی دن کی روشنی میں بھی اکیلے سفر کرنے کی ہمت نہ کرپاتی۔

ابھی کچھ ہی قدم آگے بڑھائے ہوں گے کہ ایک جھاڑی کے پاس سے عجب سی پھنکار نے اس کی سٹی گم کر ڈالی۔

''سانپ۔'' خوف سے اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

ابھی وہ اپنے دھک دھک کرتے دل کو سنبھال نہیں پائی تھی کہ اس نے سامنے مقابل کے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ایک درندے کی دل دہلا دینے والی چنگھاڑ سنی۔ اس نے گردن موڑ کر ادھر دیکھا اور جیسے

اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرنے لگی۔

چیتے کی انگاروں کی طرح دہکتی آنکھیں اس پر جمی تھیں۔ اس نے اضطراری انداز میں حرکت کرتے ہوئے اپنے نیچے کی سمت جاتے قدم روک لیے اور خوف سے مفلوج حسیات بمشکل تمام بیدار کرتے ہوئے واپس اوپر کی سمت جانا چاہا مگر اس اثنا میں اس کا حرکت کرتا وجود چیتے کی نظروں میں آچکا تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے چوٹی سے نیچے نشیب کی طرف جہاں وہ کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی بڑھنا شروع کر دیا۔ اس کی گھگھی بندھ گئی۔

اسی لمحے جھاڑی سے سانپ کی پھنکار دوبارہ کان میں پڑی۔ اس نے خوفزدہ ہو کر جھاڑی کی شاخیں چھوڑ دیں جن کا سہارا لے کر وہ کھڑی تھی۔ اچانک توازن بگڑا یا شاید کانپتی لرزتی ٹانگوں نے جواب دے دیا کہ وہ بری طرح لڑکھڑا کر نیچے نشیب کی طرف گرنے لگی۔ جہاں چیتا گویا اس کا منتظر تھا۔ خوف کی انتہاؤں پر حواس سے مکمل طور پر رابطہ منقطع ہونے سے پہلے اس کی سماعتوں نے رائفل کی کان پھاڑ دینے والی آواز پر جواب میں درندے کی ڈکراتی آواز ضرور محفوظ کرلی تھی۔

ایک بار پھر ہوش کی وادی میں واپس ہوئی تو اس کے تصور میں اس پراسرار دہشت ناک رات کے تمام تر بدصورت اور ہولناک ڈراؤنے نظارے پوری صراحت کے ساتھ روشن ہو گئے۔

''مم...... میں کہاں ہوں۔''

''تم بالکل ٹھیک ہو زرمین! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔'' ایک مہربان آواز اور ہاتھ کا لمس اسے اپنے بہت قریب محسوس ہوا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر اردگرد دیکھا۔ سامنے کھڑکی سے صبح کے آثار نظر آرہے تھے۔ تکیوں کے سہارے تخت پر دراز تھی اور عمر دراز خان اس کے بہت قریب بیٹھا اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھ رہا تھا۔ اس کا بدن بخار سے جھلس رہا تھا۔ خوف و دہشت کی شدت نے جیسے اس کی رگ رگ میں آگ بھڑکا دی تھی۔

''وہ...... وہ...... رات کو۔'' اس نے اٹک اٹک کر کچھ کہنے پوچھنے کے لیے عمر دراز خان کا پٹیاں بدلتا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی تمام تر پرچھائیاں سمٹ آئی تھیں۔ لہجہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔

''سب ٹھیک ہے زرمین! رات کو ہم کہیں دور نہیں گئے تھے۔ تمہاری حفاظت کے خیال سے ادھر ہی رہ گئے تھے۔ ہمیں خدشہ تھا کہ تمہیں کسی خطرناک صورتِ حال سے واسطہ نہ پڑے۔ اس وقت ہم

پہاڑوں پر ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ جب ہم نے اس درندے کو تمہاری طرف جھپٹتے دیکھا تین گولیوں نے اس کو ٹھنڈا کر دیا تھا اور تم خوش قسمتی سے نیچے کھائی میں جاتے جاتے ایک جھاڑی میں پھنس گئی تھیں، اس طرح بچاؤ ہو گیا۔ پوری رات بے ہوشی اور بخار میں مبتلا رہی ہو۔''

''عمر دراز خان!'' زرمین کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

اس رونگٹے کھڑے کر دینے والی دلدوز اور قاتل ڈراؤنی گھڑیوں کا تصور کچھ ایسا دہشت طاری کر دینے والا تھا کہ وہ اپنے آپ میں نہ رہی۔ بے ساختہ بے اختیاری اور خود فراموشی کے عالم میں وہ سسکتی ہوئی عمر دراز خان کے کندھے سے جا لگی۔

''ارے ارے کیا ہو گیا۔ زرمین یار! ٹیک اٹ ایزی۔ سب ٹھیک ہے۔''

اس کے انداز میں بلا کی رسانیت اور نرمی در آئی تھی۔

جانے کب وہ روتے روتے یونہی اپنے آپ سے غافل ہو گئی۔

عمر دراز خان نے اسے کانچ کی گڑیا کی طرح سنبھال کر بہت آہستگی سے اس کے ہوش و خرد کی دنیا سے بیگانہ وجود کو دوبارہ تخت پر لٹا دیا تھا اور اب پر تشویش انداز میں اس کی نبض چیک کر رہا تھا۔

''ہیلو'' موبائل فون کی گھنٹی بج بج کر ہلکان ہو گئی تھی تو اس نے انٹینا کھینچ کر بالآخر پک کر لیا۔

''ہیلو۔ السلام علیکم۔ جی جناب کیا حال چال ہیں۔ کہاں ہوتے ہیں جناب عمر دراز خان پیرزادہ صاحب صحیح معنوں میں ہمارے لیے تو عید کا چاند بن بیٹھے ہیں۔''

دوسری طرف سے چہکتی لہکتی بشاش زنانہ آواز جیسے چھا سی گئی تھی۔

عمر دراز خان کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ کی کرنیں بکھر گئیں۔ وہ پہچان چکا تھا۔ یہ شہر کی مشہور سوشل ورکر اور ایک سماجی تنظیم کی لیڈر نیلوفر صدیقی تھی۔ اس کے ساتھ بڑی اچھی علیک سلیک تھی۔

''چاند تو چاند ہی ہوتا ہے یعنی نایاب اور رسائی سے بہت دور۔'' اس کا ہاتھ بدستور فائلوں پر جما ہوا تھا۔

''کیسے یاد کر لیا؟''

''یاد تو آپ بغیر وجہ کے بھی آتے ہی رہتے ہیں۔'' بڑا معنی خیز جواب آیا تھا۔ پھر ساتھ میں ایک ٹھنڈی سانس بھری گئی۔ ''آپ ہی ہمیں بھول بیٹھے ہیں۔'' بڑے دلنشین انداز میں شکوہ کیا گیا۔

''آپ بھولنے والی چیز تھوڑی ہیں۔ بہر حال فرمائیے۔'' اس نے مشینی انداز میں جیسے تیار شدہ

جواب دیا۔

''ہماری تنظیم کے تحت پچھلے سال نفسیاتی امراض کی شکار خواتین اور بچوں کے لیے ''امن ہاؤس'' کے نام سے ایک ادارہ کھولا گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد اس کی پہلی سالگرہ ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے ایک تقریب کا اہتمام کیا ہے اور سب کی متفقہ رائے اور خواہش ہے کہ آپ کو اس تقریب کا مہمانِ خصوصی بنایا جائے۔''

''ایک ہفتے بعد۔'' اس نے سامنے لگے خوبصورت سے کیلنڈر کو نظروں سے ٹٹولتے ہوئے دیکھا۔

''جی ہاں۔ پلیز پیرزادہ صاحب آپ کی تشریف آوری ہمارے لیے بہت بڑی عزت افزائی ہو گی۔ آپ کی آمد کا سن کر خود بخود دیگر اہم شخصیات مدعو کرنے پر کھنچی چلی آئیں گی ورنہ تو آپ جانتے ہیں یہ بڑے لوگ ٹال مٹول کرنے لگتے ہیں۔''

وہ اس کی ہچکچاہٹ محسوس کر کے فوراً اصرار اور درخواست پر اتر آئی تھی۔

''اچھا چلیں۔ ہم غور کرتے ہیں۔'' اگر بڑا آدمی پہلی دفعہ میں ہی ہاں کر دے تو اس کی بڑائی کون تسلیم کرے گا۔

''پلیز جناب! ہم گزارش کرتے ہیں کہ غور سے کچھ آگے بھی کیا جائے۔'' نیلوفر صدیقی اثبات میں جواب پانے کو مچلی تھی۔ آخر ٹھیک ٹھاک موٹی اسامی تھی۔ دولت و شہرت کی فراوانی تھی۔ اس کی آمد سے خود بخود پریس میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا حرکت میں آ جائے گا اور اس طرح اس تنظیم کی شہرت پر لگا کر اڑے گی۔ پھر نوازے گا بھی بہت۔ ہر لحاظ سے مہمانِ خصوصی بنانے کے لیے سودمند شخصیت تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ ہم فرصت نکال لیں گے لیکن آپ احتیاطاً ایک دن پہلے میرے سیکرٹری کو یاد کروا دیجیے گا۔'' اس نے نخریلی رد و کد کے بعد بے نیازی سے حامی بھر لی۔

''تھینک یو ویری مچ پیرزادہ صاحب!'' دوسری طرف کا جوش و خروش اور جذبہ سپاس دیکھنے کے قابل تھا۔

''اونہہ۔ یہ فالتو کی مصروفیات۔'' اس نے آف کرتے ہوئے بڑبڑا کر خود سے کہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد فائلیں ایک طرف کھسکاتے ہوئے انٹر کام کے بٹن پش کیے۔

''فصیح کو اندر بھیج دو۔''

دوسری طرف سے مؤدبانہ ''جی سر'' سن کر اس نے تحکمانہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سر خم کیے اس کے سامنے حسب معمول اس کے حکم کا منتظر تھا۔

''ہماری جیپ نکالو فصیح!'' ایزی چیر کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے اس نے قیمتی پارکر پین بند کر کے میز پر گرا دیا تھا۔

''اور دیکھو۔ لمبا سفر ہے۔ اچھی طرح پیٹرول وغیرہ چیک کر لینا اور وہ سامان جو ہم نے تمہیں لانے کو کہا تھا۔''

''سر! وہ میں لے آیا ہوں۔'' فصیح نے جلدی سے کہا۔

''ٹھیک ہے' اسے بھی جیپ میں رکھوا دو اور مستانی شاہ کو اطلاع کر دو ہم شام تک پہنچ جائیں گے۔ ہمیں دو تین دن لگ جائیں گے ادھر۔ ہماری غیر موجودگی میں تمہیں کس طرح ہینڈل کرنا ہے ہم تمہیں بریف کیے دیتے ہیں۔ آؤ بیٹھو۔''

سامنے والی کرسی پر بیٹھتا فصیح پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی چکا تھا کہ باس کس لمبے سفر پر جانا ہے۔

یہ ایک فطری سا امر ہے کہ جب انسان بہت شدت سے رو لے تو آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں' جسم زخم لگنے کا تسلسل بڑھتا ہی چلا جائے تو ٹیسیں اٹھنا ختم ہو جاتی ہیں پھر درد نہیں رہتا بلکہ بے حسی طاری ہو جاتی ہے۔ سوچیں جب انتہاؤں کو چھو کر بغیر کسی عملی صورت کے واپس مایوس پلٹنے لگیں تو ذہن خالی ہو کر رہ جاتا ہے پھر اجتماعی بے حسی کی کیفیت انسان کو لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ وہ بھوک پیاس کی شدتوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ صبح شام اگر کھاتا بھی ہے تو اس طرح جیسے ایک روٹین ورک تھا پورا کر لیا۔ رات کو سوتا اور دن کو جاگتا یوں ہے جیسے مشین آف اور آن ہوتی ہے۔ سوچ' یاد' خوشی' غمی احساس برف بن جاتا ہے۔

انسان چلتا پھرتا روبوٹ بن جاتا ہے۔

وہ اتنا روئی تھی کہ اب اندر سے سارے سوتے خشک ہو چکے تھے۔ اپنے گزرے ایام کو پیچھے جانے والے رشتوں کو اتنا یاد کیا تھا کہ اب خود فراموشی والی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ جیسے اب یادیں ساتھ چھوڑنے لگی تھی۔ جب انسان ہر ممکن کوشش کے باوجود ناکام رہے تو صبر کے ماسوا اور چارہ کیا رہتا بھی کیا ہے اور وہ بہت سارا صبر کر چکی تھی۔ بہت سارے تعلق آنسوؤں کی برف میں دفن کر چکی تھی۔

وہ دادی کو بھی رو چکی تھی۔ اپنے آپ کو بھی اور اپنی ہر حس کو بھی۔ ایک بے جان لاشے کی طرح ادھر ادھر چکراتی پھرتی تھی۔ اب تو کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا نہ قید تنہائی ڈراتی تھی نہ ماضی کی یادیں ڈستی تھیں اور نہ بچھڑنے کا دکھ ستاتا تھا۔

ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھی ارد گرد کی خاموش وحشت زدہ فضاؤں کو تکتی وہ بڑی بے دم سی ہو کر بیٹھی تھی۔ اندر ہی اندر فرار کی ہر ممکن کوشش کرنے کے بعد اب وہ مکمل طور پر حالات سے سمجھوتا کر چکی تھی اور یوں بھی اب پیچھے کیا بچا تھا جس کے لیے وہ تگ و دو کرتی۔

عزت' آن' آبرو' شرافت و نجابت سب ختم تھا۔ کون یقین کرے گا اس کا۔ تین ماہ۔ ایک طویل عرصہ گھر سے غائب رہنے والی لڑکی کے لیے گواہی کہاں سے آئے گی؟

وہ دنیا والوں کے لیے مر چکی تھی۔

کتنی ہی دیر سے وہ مکان سے کچھ فاصلے پر اس جگہ بیٹھی بے سبب سامنے والے پہاڑ کی چوٹی پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ پہلے پہل مستانی شاہ اس کے پھاٹک سے باہر نکلنے پر اس کے ہمراہ آتا تھا۔ غالباً حفاظت کے خیال سے لیکن اب چونکہ وہ ارد گرد کی فضاؤں سے مانوس ہو چکی تھی اس لیے وہ اپنی جگہ پھاٹک کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔

شام کے سائے آہستہ آہستہ ماحول کو اپنے حلقے میں لینے لگے تھے۔ معاً سامنے والی چوٹی پر ایک انسانی ہیولا نمودار ہوا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی باعث وہ پہچان نہیں سکی۔

پتا نہیں دوست ہے کہ دشمن۔ خیر انسان تو ہے ناں۔ اس ویرانے میں کسی کے ساتھ کیا دشمنی کی جا سکتی ہے۔

وہ متجسس سی ہو کر دیکھنے لگی۔ وہ مضبوط قدموں سے چلتا ادھر ہی آ رہا تھا اور پھر جونہی وہ اس کے قریب آیا اس کا تجسس دم توڑ گیا۔ وہ عمر دراز خان تھا۔

اس دفعہ بڑے عرصے بعد آیا تھا۔ ہفتے میں ایک آدھ بار چکر ضرور لگاتا تھا۔ اس بار وہ کوئی تین ہفتے بعد آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تین بیگ تھے جنہیں زمین پر نیچے رکھتے ہوئے وہ اس پر بھرپور نظر ڈال کر مسکرا کر اس کی سمت بڑھا۔

''السلام علیکم۔ کیا حال ہے۔''

ہلکے آسمانی ڈھیلے ڈھالے چکن کے شلوار کرتے میں اس کا متناسب سراپا اور اس کی اجلی شفاف رنگت جیسے لو دینے لگی تھی۔

زمین کے اندر جیسے شعلے سے جلنے لگے۔

"قیدیوں کو اتنا بھی ستانا ٹھیک نہیں ہوتا۔"

"ہم تمہیں قیدی تو نہیں سمجھتے تم تو راج کر رہی ہو۔" اس کا لہجہ بڑا عجیب سا تھا۔

"عمر دراز خان! بڑی بھاری قربانی دی ہے اصولوں کی فتح کے لیے۔ پھر بھی کرچی کرچی دل لیے استقامت سے کھڑی ہوں۔ اگرچہ آبلہ پا ہوں۔ دل مردہ ہے مگر ضمیر ہنوز زندہ ہے اس لیے خدا نے برداشت کی حدیں بھی بڑھا دی ہیں مگر تم سناؤ بے ضمیری کی سیاہ گرد نے تمہارے کثیف دل پر کتنا وزن اور لادا ہے؟" اس کا دل چیخ چیخ گیا تھا۔

"یہ سزا تمہارا اپنا انتخاب تھی۔ تمہاری عاقبت نااندیشی کا نتیجہ تھی۔ ہماری انا وغیرت اور مردانگی پ حرف گیری کرنے والا ہمارا سکون برباد کرنے والا چین کی نیند کیسے سو سکتا ہے...... بربادیاں اس ک مقدر کیوں نہ بنیں۔" زرمین کے زہریلے انگارہ لہجے کی تپش نے اسے بھی بھڑکا کے رکھ دیا۔

اس کی ساری لطیف مزاجی تلپٹ ہو کر رہ گئی تھی۔

ان کے لمبے ہی سلسلے تھے۔ آغاز میں نیلوفر صدیقی نے اپنی تنظیم کی کارکردگی اور "امن ہاؤس" کے قیام کی وجوہات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پھر مہمانِ گرامی کو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ڈائس آنے کی زحمت دی گئی۔

چائے کی فارمیلٹیز پوری ہوئیں تو مہمانِ گرامی کو اہم سیاسی وسماجی شخصیات، پریس رپورٹرز اور فو گرافرز کے ہمراہ "امن ہاؤس" میں مقیم نفسیاتی مریضوں سے ملوایا گیا۔ نیلوفر صدیقی امن ہاؤس ک انچارج مسز ذکیہ کے ہمراہ پیش پیش تھیں۔ مسز ذکیہ ہر مریض کی کیس ہسٹری اور بیک گراؤنڈ فرفر رہی تھیں۔

چلتے چلتے وہ ایک بوڑھی بے حال سی عورت کے بیڈ کے پاس رکے۔ کھچڑی بال، میلے پھٹے پرا۔ کپڑے، ناخنوں میں جما میل، ویران آنکھیں، بنجر سراپا۔ بظاہر اس میں کوئی ٹھٹھکا دینے والی چیز نہیں تھی اور شاید نیلوفر صدیقی مہمانوں کے ہمراہ ایک منٹ رک کر آگے بڑھنے ہی والی تھیں، جب بڑھیا۔ چونک کر عمر دراز خان کو دیکھا۔ پھر ایک جھٹکے میں اس کا گریبان تھام لیا۔

"مینا...... میری مینا کو دیکھا ہے۔" بڑا بے قرار انداز تھا۔ "میری زرمین تھی ناں۔ صبح کی اسکول گئی ہوئی ہے، واپس ہی نہیں آئی۔"

اسے بتاتے ہوئے آخر میں وہ بڑی استعجاب آمیز معصومیت سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"زرمین!" عمر دراز خان کو ایک جھٹکا سا لگا۔

"میرا اس دنیا میں دادی کے سوا کوئی نہیں ہے، وہ میرے بغیر بے موت مر جائے گی۔" اس کے ذہن میں زرمین کا جملہ تڑپا اور جیسے تڑپ کر ساکت ہو گیا۔

"یہ بے چاری بڑی بدنصیب ہے۔ ایک ہی پوتی تھی اس کی، وہ تین چار ماہ پہلے لاپتا ہو گئی۔ اس کے غم میں یہ پاگل ہو گئی۔ ایک دن پاگلوں کی طرح اسے پکارتی ہوئی سڑک پر جا رہی تھی کہ ایک گاڑی کے نیچے آ گئی اور اپنی دونوں ٹانگیں گنوا بیٹھی۔ ہاسپٹل والوں نے ضروری علاج کے بعد اسے ادھر بھیج دیا۔"

مہمانِ گرامی کی دلچسپی کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسز ذکیہ نے اس بڑھیا کے بارے میں مفصل بتا دیا۔

"مینا کہاں ہے...... میری مینا۔ اپنے امی، ابو کے پاس چلی گئی ہوگی ہے ناں۔" بڑا معصومانہ استفسار تھا بڑھیا کا۔

عمر دراز خان کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ ہزار خود پہ قابو پانے کی کوشش میں اس کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔

"آ جائے گی مینا اماں!" دھیرے سے کہہ کر اس کا شانہ تھپک کر وہ بے جان قدموں سے آگے بڑھا تھا۔

بنجر پتھریلی سیاہ چوٹیوں کے عقب میں سورج کا تھال نمودار ہو چکا تھا اور اب آہستہ آہستہ اوپر کی سمت بڑھ کر پھیل رہا تھا۔ اٹھ کر تخت کے کمبل اور گاؤ تکیے درست کرتے ہوئے اس نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھولے، پھر میز سے چابی اٹھا کر دروازے کا لاک کھولا اور فریش ہونے کے لیے دوسرے کمرے کی سمت قدم بڑھائے۔ رات کا عمر دراز خان آیا ہوا تھا۔ وہ ادھر سو رہا تھا۔ اس نے ہلکے سے دروازہ پش کیا۔ وہ کھلا تھا۔

جس رات وہ ادھر ہوتا تھا زرمین بیٹھک والے کمرے میں سوتی تھی۔ وہ سونے والے کمرے کا دروازہ کھلا ہی رکھتا تھا کیونکہ باتھ روم کا واحد دروازہ اسی کمرے میں کھلتا تھا۔ آہستگی سے اندر داخل ہو کر غیر ارادی طور پر اس نے پلنگ کی طرف نظر کی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔

وہ دھیرج سے الماری سے اپنے کپڑے نکال کر باتھ روم چلی گئی۔

فریش ہو کر خاصی دیر بعد باہر نکلی تو عمر دراز خان جاگ چکا تھا۔ پلنگ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز

سگار کے کش لیتے ہوئے اس کی نظریں چھت پر بنے مکڑی کے جالے میں الجھی ہوئی تھیں۔

کھٹکے پر اس نے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ وہ سیاہ پھولدار شلوار سوٹ میں ملبوس تھی۔ سیاہ دوپٹہ شانوں پر برابر کرتے ہوئے اپنے گیلے بالوں کی لٹیں کان کے پاس سے پیچھے کی طرف کرتے ہوئے اس نے عمر دراز خان کی نظروں کی محویت کو پوری شدت سے محسوس کیا اور بظاہر بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مگر بباطن گھبراہٹ چھپانے کو رخ پھیر کر دیوار گیر آئینے کے سامنے برش لے کر بال سلجھانے لگی۔

''زرمین!'' وہ اٹھ بیٹھا اور پلنگ چھوڑ کر عین اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا۔

''جی۔'' اس کے طرزِ تخاطب کی نرمی پر زرمین کو بڑا اچنبھا ہوا مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا' اپنا لب ولہجہ سپاٹ ہی رکھا۔

''اپنے شہر واپس چلو گی؟'' دھیمے سے استفسار کرتے ہوئے اس نے دائیں شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ جیسے کھولتے ہوئے تیل کے کڑاہے میں پھینک دی گئی۔

''کیا......؟'' اڑے اڑے حواس بمشکل مجتمع کرتے ہوئے اس نے اپنی پوری طاقت صرف کر کے اس کی سمت دیکھا تھا۔ نگاہوں کے آگے بری طرح دھندسی چھائی محسوس ہو رہی تھی۔

''کیا کہا تم نے عمر دراز خان۔'' اس کی آنسوؤں میں گھلی نم دار آواز جیسے کسی کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

زرمین کو لگا جیسے کچھ ساعت جاتی ہے' جب اس کے تمام حواس اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے' جسم سے روح نکلتی کچھ ایسے ہی محسوس ہو رہی تھی جیسے کورا بدن خاردار جھاڑیوں پر سے بے دردی سے گھسیٹا جا رہا ہو۔

''گوتم نے ہمارا بہت نقصان کیا ہے' تمہاری سزا میں اتنی جلدی ترمیم کی گنجائش نہیں نکلتی تھی' مگر تمہاری دادی کی دگرگوں حالت کے پیشِ نظر اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ تمہارے لیے یہ بہت کافی ہے۔ ہم شام کو روانہ ہو رہے ہیں۔ تم تیاری کر لو۔ ہم تمہیں تمہارے گھر کی دہلیز پر چھوڑ کر واپس پلٹیں گے۔''

''دادی! دادی......!'' جیسے نئے سرے سے وہ بننے کے مراحل سے گزرنے لگی۔ ''کیا وہ زندہ ہیں؟'' بہت ہچکچا کر اس کی سمت دیکھتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی۔

''ہاں......زندہ تو ہیں۔'' وہ نظر چرا گیا۔ ''تم دیکھ لینا۔''

''ہاں......میں چلوں گی۔'' دادی کی زندگی کی نوید کیا ملی اس کے شوق کی ساری حدتیں انگڑائی لے کر جیسے بیدار ہونے لگیں۔ وہ یہ بھی فراموش کر گئی کہ چار ماہ بعد جب وہ ''اس'' دنیا میں قدم رکھے گی تو زمانہ اس کی پذیرائی کے کیا کیا سامان نہ کرے گا۔

عمر دراز خان بڑی دلچسپی سے اس کے چہرے پر بکھرے شوق کے رنگ ملاحظہ کر رہا تھا۔ بڑے عرصے بعد اس کے چہرے کے برفیلے تاثرات تبدیل ہوئے تھے۔

''کنویں کے اتنے قریب رہ کر بھی پیاسا رہنا بہت عالی ظرف لوگوں کا کام ہوا کرتا ہے اور دیکھ لو ہم نے کتنا ضبط رکھا ہوا ہے۔''

وہ اک شانِ تفاخر لیے بتلا رہا تھا۔

زرمین کے روئیں روئیں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ وہ کوئی جھلستا ہوا جواب دیتے دیتے رہ گئی کہ کہیں وہ غضب ناک ہو کر اپنی سابقہ پیشکش واپس نہ لے لے۔ دادی کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ایک باران کے سینے سے لگ کر دل کا غبار نکالنے کے لیے تو وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔

شام کے سائے گہرے پڑتے ہی وہ عمر دراز خان کی معیت میں باہر نکل آئی۔ نیچے اترائی تک کا راستہ بہت دشوار تھا۔ وہ کتنی ہی بار لڑھک کر گرتے گرتے بچی اور کتنی ہی بار عمر دراز خان کے آہنی پر حرارت بازوؤں نے اسے سنبھالا دیا تھا۔ وہ ہر طرح کے انتظامات کر کے چلا تھا۔ کندھے پر لوڈ ہوئی رائفل لٹک رہی تھی' پینٹ کی جیب میں ریوالور اڑسا ہوا تھا۔ ایک چھوٹا سا پسٹل لوڈ کر کے حفاظت کے خیال سے زرمین کو بھی تھما دیا تھا۔

کتنی بار وہ اس سے پوچھ چکی تھی کہ کتنا فاصلہ باقی ہے اور ہر بار اس نے تسلی بخش جواب دیا تھا۔ بس تھوڑا اور۔

مگر اب اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ اونچے نیچے پتھروں پر چلتے چلتے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔

''مجھ سے نہیں اب اور چلا جاتا۔'' بالآخر وہ ہانپ کر پتھریلی گزرگاہ پر بیٹھ گئی اور سانسیں درست کرنے لگی۔ وہ حال سے بے حال ہو رہی تھی۔

عمر دراز خان نے رک کر اس کی سمت متذبذب انداز میں دیکھا۔ وہ تقریباً بے سدھ ہونے کو تھی۔

''بس اب تو واقعی تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا ہے۔'' وہ فلاسک سے پانی نکال کر اسے دیتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"نہیں پلیز مجھ سے اب اور نہیں چلا جاتا۔" وہ بے دم ہو رہی تھی۔

"وقت بہت تنگ ہے، ہمیں جلد از جلد شہر پہنچنا ہے اور ابھی سفر بہت لمبا ہے، کوئی جنگلی درندہ ادھر نکل آیا تو مصیبت ہو جائے گی۔ اکیلے ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی مگر اب تمہارے ساتھ ہم ایسا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ تم تھوڑی ہمت سے کام لو اب فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔"

بالآخر وہ جیپ تک پہنچ ہی گئے پھر ایک لامتناہی سفر شروع ہو گیا۔ جانے کتنے گھنٹے گزر گئے جیپ چلاتے چلاتے۔ بیچ میں اس نے فصیح سے موبائل فون پر رابطہ کے بعد کچھ ہدایات بھی دیں۔ صبح کاذب کے آثار افق پر نظر آ رہے تھے۔ جب جیپ اس کے محلے کے مانوس راستوں سے گزرتی گھر کے گیٹ پر آ کر رکی۔ اپنے گھر کے گیٹ پر نگاہ پڑتے ہی اس کے جسم و جاں میں عجیب سی سنسنی پھیل گئی۔ ایک عجیب سے کرچی کرچی کر دینے والے احساس نے جیسے اس کے پورے وجود کو حصار میں لے لیا۔

نامانوس رستوں، گلیوں، دریچوں اور مکانوں سے کتنا خوف سا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی ان کی زبانیں نکل آئیں گی اور سب کے سب مل کر بولنے لگیں گے۔

اس نے یونہی کسی احساس سے ٹھٹھک کر اس کی طرف گردن موڑی۔ وہ نہایت سکون کے عالم میں اس کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ کے جمود نے اسے جز بز سا کر دیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بڑی آہستگی سے اس نے نظر اور گردن پھیر لی تھی۔ اسی لمحے اس نے اس کے توانا بازو اور گرم سانسوں کا لمس اپنے اردگرد محسوس کیا۔

"فصیح کو ہم نے ہدایت کر دی تھی۔ وہ امن ہاؤس والوں سے معاملات طے کر کے تمہاری دادی کو یہاں لے کر آنے ہی والا ہے، ان کی حالت دیکھ کر یقیناً تمہیں دھچکا پہنچے گا لیکن بہرحال یہ سب شاید ایسے ہی ہونا تھا۔"

"میری دادی! کیا ہوا انہیں؟ وہ گھر پر نہیں ہیں تو کہاں ہیں؟" اس کے اوسان خطا ہونے لگے۔ دل کسی بری خبر سننے کے واہموں تلے پڑا تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ اس نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"وہ کیسی ہیں؟" وہ بلا ارادہ نظر چرا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"کچھ دیر بعد تم ان سے مل لوگی۔"

"کیا کیا ہے تم نے دادی کے ساتھ؟" اسے برے برے ہول آ رہے تھے۔ بے ساختہ اس کے ہاتھ کو جھنجھوڑ کر چیخ پڑی۔

"ہم نے کیا کرنا تھا۔ تمہاری جدائی شاید لے ڈوبی ہے۔" اس نے کسیلا انداز اختیار کر لیا۔ پھر اسے چھوڑ کر سیٹ پر سیدھا ہو گیا اور جیپ اسٹارٹ کر دی۔

"بہرحال تمہارے تمام تر توہین آمیز رویوں کے باوجود ہم نے تمہاری آبرو پر حرف نہیں آنے دیا اور جیسے لائے تھے ویسے ہی چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ہمارے حصے کا باقی انتقام زمانے کی نگاہیں اور اس معاشرے میں بسنے والے افراد خود تم سے لے لیں گے۔ یوں سمجھو ابھی تک تم جنت میں تھیں، سزا کا اصل دور تو اب شروع ہوا ہے، کیسے کس طرح کیونکر؟ یہ بات تم خود ہی بہت جلد جان جاؤ گی۔ خدا حافظ۔" اس کے لہجے میں عجیب سرد پن در آیا تھا۔

اسی اثنا میں سفید کرولا جیپ ان کے پاس آن رکی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر فصیح براجمان تھا۔ عمر دراز کو غالباً اسی کا انتظار تھا۔ نظر آتے ہی زمین کے جیپ سے اترنے کے بعد تیزی سے جیپ آگے بڑھا لی تھی۔ اردگرد کے کچھ گھروں کے لوگ بیدار ہو گئے تھے اور بہت تجسس کے عالم میں یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

قاتل چپ ہے، خون آلودہ ہاتھ میں اب تک
خنجر تھر تھر کانپ رہا ہے
لوگوں کا انبوہ اسے گھیرے میں لے کر
چیخ رہا ہے
یہ قاتل ہے
یہ قاتل ہے
خاک اور خون میں لت پت لاش کے ہونٹوں پر اک بات جمی ہے
یہ قاتل ہے
لیکن کس کا؟ اس نے خود کو قتل کیا ہے
لوگوں کا انبوہ مگر کب سنتا ہے
کون ہے قاتل
کس نے کس کو قتل کیا ہے

اس کے قدموں تلے فٹ پاتھ کی سخت زمین تھی اور سر پر چلچلاتی ہوئی دھوپ، دور تک سائبان کا نام

ونشان نہیں تھا۔اس کے تیز تیز قدم تھکن کی پروا کیے بغیر بڑھتے چلے جارہے تھے۔

''اس پاپی پیٹ کے لیے کیا کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔'' راستے میں رک کر اس نے سینڈل کے اسٹریپ دوبارہ بند کیے اور پھر چل پڑی' جیسے چلتے رہنا بھی اس کی ڈیوٹی میں شامل ہو۔

بالآخر اسکول کی عمارت تک پہنچ ہی گئی۔ داخلی گیٹ پر ضروری کارروائی سے گزرنے اور آدھ گھنٹہ اسٹاف روم میں انتظار کی مشقت برداشت کرنے کے بعد آخر کار اسے پرنسپل کے کمرے میں جانا نصیب ہوا۔

''باقی تو سب ٹھیک ہے مگر میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی بی بی! کہ آپ نے نیازی صاحب کا اتنے اچھے اسٹینڈرڈ کا اسکول کیوں چھوڑا۔ وہ تو عنقریب اب کالج لیول تک پہنچنے کو تھا۔'' پرنسپل صاحبہ نے اس کے ڈاکومنٹس وغیرہ چیک کر کے پیپر ویٹ ہاتھ میں گھماتے ہوئے کسی قدر تحیر اور تجسس سے دریافت کیا۔ چند ثانیے کو جیسے اس کا سارا اعتماد بھک سے اڑ گیا۔ وہ لب بستہ بیٹھی رہ گئی۔ پھر خود پر قابو پا کر رسان سے جواب دیا۔

''دراصل ہم نے ادھر سے گھر شفٹ کر لیا ہے اس لیے آنے جانے کی پرابلم تھی۔ وہ یہاں سے خاصا دور پڑتا ہے اس لیے۔''

''کب کیا ہے آپ نے گھر شفٹ؟'' پرنسپل نے یونہی بر سبیلِ تذکرہ ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

''کل ہی شفٹ ہوئے ہیں ادھر۔''

چند سرسری سے سوال و جواب کے بعد بالآخر بات طے ہو گئی۔ اس کا اکیڈمک ریکارڈ بہترین تھا۔ اتنے اچھے انگلش میڈیم ہائی اسکول میں ڈیڑھ سال پڑھانے کا تجربہ رہا تھا اور پھر انہیں ضرورت بھی تھی۔ سو تھوڑی سی رسمی ردوکد کے بعد اسے رکھ لیا گیا۔

''دیکھیں بی بی! ایک بات ابھی سے آپ پر واضح کر دوں' یہ اسکول پرائیویٹ ہے اور پرائمری کلاس تک ہے۔ اس کو کھولے ابھی ڈیڑھ دو سال ہوئے ہوں گے' اس لحاظ سے نیا بھی ہے چنانچہ تنخواہ کے معاملے میں آپ کو اپنی سابقہ پے کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ ہم فی الحال آپ کو دو ہزار پر رکھ رہے ہیں' اس سے زیادہ یہ ادارہ افورڈ نہیں کر سکتا البتہ بعد میں حالات بہتر ہوتے ہی آپ کی کارکردگی کے مطابق آپ کی تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا جائے گا۔''

نرمین نے طویل سانس لے کر پرنسپل کی طرف دیکھا اور خوش اخلاقی کا دکھاوا کرنے کے لیے یونہی لب پھیلا کر سر ہلا دیا۔

''دو ہزار۔'' اسکول کی عمارت سے نکلتے ہوئے اس نے سوچا۔ ''اس کا مطلب ہے گزارہ کرنے کے لیے شام کی ایک نوکری اور بھی تلاش کرنا ہوگی۔''

واپسی کے لیے قدم موڑتے ہوئے ایک اور بوجھ آن پڑا تھا پھر کچھ جدوجہد کے بعد اسے ایک ''کمپوزنگ سینٹر'' میں جاب مل گئی۔ خوش قسمتی سے بی اے کے بعد کمپیوٹر کلاسز لینے کا شوق اس کے کام آیا تھا۔ دادی کے ہزار شور مچانے' منع کرنے کے باوجود اس نے رزلٹ کے انتظار میں گھر بیٹھنے کے بجائے وہ نو ماہ کمپیوٹر کورس کرنے میں صرف کر دیے تھے۔ سو اب اس کا فائدہ ہوا تھا۔ ٹائمنگ دوپہر دو بجے سے شام پانچ بجے تک کے تھے۔ سو اس کے لیے پرابلم نہیں تھی۔ اسکول گھر سے واکنگ ڈسٹینس پر تھا۔ ڈیڑھ بجے وہاں سے فارغ ہو کر گھر جاتی۔ دادی کو کھانا کھلاتی اور پھر انہیں سلا کر وہ مین روڈ سے اپنے روٹ کی بس پکڑتی اور سیدھا سینٹر جا پہنچتی۔ دل کی دنیا اب اس قدر برف بن چکی تھی کہ دونوں جگہ اس نے اب تک کسی سے سلام دعا اور دوستی آشنائی کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ دانستہ اپنے خول میں بند رہنا چاہتی تھی۔ وہ جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ''وہ تو اتنی ہنس مکھ ہے کہ چلتی ہوا کو بھی دوست بنا لے۔'' اب وہ ''آدم بیزاری'' کا اشتہار بن چکی تھی۔

ایک ماہ کے صبر آزما عرصے کے بعد جب پہلی تنخواہ ملی تو اس نے واپسی پر سیدھا میڈیکل اسٹور کا رخ کیا۔ دادی کے لیے دوائیں خرید کر جب وہ بس اسٹینڈ کی طرف جا رہی تھی' اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اس کی نگرانی کر رہا ہو۔

چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر کچھ سمجھ میں نہ آنے پر سر جھٹک کر اپنی مطلوبہ بس میں سوار ہو کر بیٹھنے کی جگہ تلاش کرنے لگی۔

مین روڈ پر اتر کر وہ دھیمے دھیمے کھوئے بکھرے قدموں سے اپنے مخصوص راستے پر ہو لی۔ یہاں فلیٹوں کی ایک دنیا آباد تھی۔ اردگرد بلاکوں کی سر بفلک عمارتوں نے جیسے آسمان کو نگاہ سے اوجھل کر دیا تھا۔ یہ فلیٹس لوانکم (کم آمدنی) والی فیملیز کے لیے بنائے گئے تھے۔ تنگ و تاریک پلاسٹر اکھڑے بوسیدہ سے بے رنگ سے بلاکس چہار اطراف پھیلے ہوئے تھے۔

وہ اپنے مطلوبہ بلاک میں داخل ہوئی اور تھکے تھکے انداز میں سیلن زدہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس کا فلیٹ چھٹی اور آخری منزل پر تھا۔

بالآخر چٹختے' تکان زدہ جسم و جان کے ساتھ وہ اپنے فلیٹ تک پہنچ ہی گئی۔ پرس سے چابی نکال کر لاک کھولا اور اندر داخل ہو کر دوبارہ لاک کرتے ہوئے نڈھال سی سامنے والے کمرے کی سمت بڑھی۔

دو ہی تو کمرے تھے۔ایک میں سستا سا صوفہ سیٹ اور ایک میز اور چار کرسیاں سجا کر اسے ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم دونوں کے لیے مختص کر دیا تھا اور دوسرے کمرے میں دو بیڈ اور ایک کپڑوں کی الماری تھی۔ایک باتھ روم تھا جس سے کچھ فاصلے پر چھوٹا سا کچن تھا۔ڈرائنگ روم کے ساتھ ایک چھوٹی سی نام نہاد بالکنی تھی۔

شروع شروع میں تو اسے اس کابک میں بڑی گھٹن ہوتی تھی۔وہ ایسی تنگ و تاریک جگہوں پر رہنے کی عادی کہاں تھی۔ان کا آبائی مکان پورے ایک کنال پر مشتمل تھا۔کھلے کھلے کمرے' بڑا سا لان۔پیچھے چھوٹا سا باغیچہ۔یہاں آکر تو کھلی فضا میں سانس لینا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔

''دادی۔'' بیڈ روم میں آکر اپنا پرس اور چادر الماری میں ڈالتے ہوئے وہ دادی کے بیڈ کی طرف آئی اور آہستگی سے ان کے اوپر پڑی چادر کا کونا کھسکا دیا۔انہوں نے کسمسا کر آنکھیں کھول کر ویران نظروں سے اسے دیکھا پھر کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔

''مم۔مم۔می۔مینے۔'' بڑی تگ و دو کے بعد ان کے منہ سے بے ربطی کے عالم میں اس کا نام ادا ہوا۔

''ہاں دادی! تمہارے پاس ہی ہوں۔'' وہ انہیں تکیے کے سہارے بٹھا کر دھیمے سے کہتی ان کے ہاتھ سہلانے لگی۔

''مم۔ما'' ان کے بھرائے ہوئے گلے سے پھر چند بے ربط جملے ادا ہوئے۔اسے اچانک سامنے پا کر اس دن صدمے اور خوشی کے ملے جلے عالم میں وہ اچانک قوتِ گویائی سے محروم ہو گئی تھیں۔

دکھ کے پاتال میں ڈوبے دل کے ساتھ وہ دھیرے دھیرے ان کے کندھے تھپک کر تسلی کے سے انداز میں کہنے لگی۔

''سب ٹھیک ہے دادی! تم کچھ نہ کہو۔ٹھیک ہے سب۔تم بیٹھو میں اپنے اور تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔''

وہ اپنے تپتے جھلستے پاؤں سینڈل سے آزاد کرنے لگی۔

''باتھ روم تو نہیں جانا دادی!'' کچن کی طرف جاتے جاتے وہ رک کر پوچھنے لگی۔

دادی کے نفی میں سر ہلانے پر وہ لباس بدل کر کچن میں آگئی۔دادی کو چائے دے کر اپنی چائے کا کپ وہیں کچن میں ہمراہ لے گئی اور رات کے کھانے کے لیے سوچنے لگی۔

تھوڑی سی مسور کی دال پڑی ہوئی تھی اس نے وہی بھگو دی۔

''کل شام کو واپسی پر دو تین سبزیاں لے آؤں گی۔یوں دالوں پر کب تک گزارا چلے گا۔ویسے دادی کو تو مقوی مرغن غذائیں کھلانی چاہئیں۔ڈاکٹر بھی یہی کہہ رہا تھا۔کمزوری بھی تو بہت ہو گئی ہے مگر مرغی اور گوشت ہم افورڈ نہیں کر سکتے۔ابھی تو اتنے بہت سے اخراجات منہ کھولے کھڑے ہیں۔پانی' بجلی' سوئی گیس کا بل اور مالک مکان کا کرایہ تو شکر ہے چھ ماہ تک کا پیشگی ادا کر دیا ہے مگر روز کے کھانے پکانے کے اخراجات بھی ہیں۔''

وہ سوچ سوچ کر دل مسوس رہی تھی۔اس سے قبل گھر اور گھرداری کی الف بے بھی جاننے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔کھانا پکانا تو سب دادی کے سر ہوتا تھا۔کیا چیز ختم ہو گئی' کیا موجود ہے زمین کی جانے بلا' مگر اب۔آہ۔وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔

''دادی! آپ کی دوائیں میں لے آئی ہوں' اب انہیں باقاعدگی سے استعمال کرنا ہے۔یاد ہے ناں ڈاکٹر کہہ رہا تھا علاج باقاعدگی سے اور توجہ سے ہو گا تو کچھ عرصے بعد قوتِ گویائی بحال ہو سکتی ہے۔اگلے ہفتے آپ کو لے کر جاؤں گی چیک اپ کے لیے۔''

کھانا پکا کر وہ وہیں بیڈ روم میں لے آئی تھی اور اب دادی کے ساتھ مل کر کھاتی۔انہیں نوالے بنا کر کھلاتی' وہ امید افزا لہجے میں کہہ رہی تھی۔

مگر دادی کی سنسان مقبرے جیسی آنکھوں میں امید کی روشنی کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔برتن اٹھا کر سمیٹ کر کچن میں رکھنے کے بعد وہ دادی کو ان کی بیساکھیاں تھما کر کمرے سے سہارا دے کر باتھ روم لے کر گئی۔پھر واپس بستر پر لٹا کر کمبل ان پر ڈالا بیرونی دروازے کا لاک ایک بار پھر چیک کیا اور کچن کی لائٹ بجھا کر دروازہ بند کر کے بیڈ روم میں اپنے بستر پر آگئی۔

''دادی! انشاء اللہ اچھا وقت جلد لوٹ آئے گا۔''

سونے سے پہلے اس نے روز کی طرح دادی کو اور خود کو جھوٹی تسلیاں دینے کی گویا رسم ادا کی۔

اس نے دیکھا دادی کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔بے بس اور مضطرب آنسو۔اس کے اندر جیسے کوئی چیز پگھلنے لگی۔

''دادی!'' وہ بولی تو اس کے بھیگے لہجے میں دکھ کی آمیزش تھی۔

''دادی! ہم نے کیا قصور کیا تھا۔اصولوں سے دوستی ہی تو کی تھی۔برائی کی نشاندہی کر کے اس کو پھیلنے سے روکا تھا۔کیا یہ کوئی جرم ہے؟ پھر اتنے بہت سے پتھر کیوں ہمیں زخمی کر گئے ہیں؟ ہم معتوب کیوں ٹھہرائے گئے ہیں؟ کرے کوئی بھرے کوئی' جو فعل ہم نے نہیں کیا اس کی تہمت ہم پر کیوں لگاتے

ہیں لوگ!"

اس کا جی چاہ رہا تھا وہ دونوں ہاتھوں میں چہرا چھپا کر پھوٹ پھوٹ کے روئے دھاڑیں مار مار کر اپنی روحانی موت پر بین کرے مگر جانتی تھی دادی نے اس کے ایک آنسو پر ساری رات بلک کر گزارنا تھی۔

سو کمال درجے کے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود پر قابو کیے رکھا۔

"سو جائیں دادی! ماضی کو دفن کر دیں اس کی تمام تر بدصورتیوں کے ساتھ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے جیسے رٹا رٹایا سبق دہرایا اور ان کی طرف سے رخ موڑ کر سونے کی ایکٹنگ کرنے لگی۔ مگر نیند۔

نیند کہاں تھی آنکھوں میں۔ ڈیڑھ ماہ پہلے کیا ہوا تھا۔

اس صبح جب اس نے جیپ سے اتر کر اپنی نیم پاگل دونوں ٹانگوں سے معذور نحیف و نزار دادی کا نیم مردہ لاشہ دیکھا تھا اور ارد گرد دیکھنے والوں کا ایک ہجوم تھا۔

اس دن جب لوگوں کی زبانیں خنجر بن گئی تھیں اور ان کی نگاہوں کے بے رحم برمے اس کے اندر تک شگاف ڈال گئے تھے۔

دیکھنے والوں میں شامل
یار بھی اغیار بھی
چند آنکھوں میں نمی
چند آنکھوں میں حقارت، برہمی
چند آنکھوں میں سکوتِ دائمی
دشمنوں کو بھی یقین
اور بدگماں کچھ ہم نشین، غم خوار بھی
کس طرح صدیاں اچانک ثانیوں میں بٹ گئیں۔

اور ڈیڑھ ماہ پہلے گزرے سارے واقعات اس کی نگاہوں میں پھرنے لگے۔

جتنی دادی سے ملنے کی بے تابی تھی اسی قدر انہیں سامنے دیکھ کر جیسے سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی پھر لٹے پٹے انداز میں ان کا خود سے بے گانہ وجود تھام کر اپنے گھر میں داخل ہوئی تو یوں لگا جیسے کسی دوسری دنیا میں آ گئی ہو۔

"دادی پاگل ہو گئیں اور تم اتنے عرصے تک لاپتا رہیں چنانچہ ہم نے عدالت سے اجازت نامہ حاصل کر کے مکان پر قبضہ کر لیا۔ اب یہ ہمارا ہے۔ ہمارا حق ہے۔" یہ مکان دادا نے بنوایا تھا۔ دادی کو قانونی پیچیدگیوں کی خبر نہ تھی سو ابھی تک ٹرانسفر نہیں کروایا تھا۔ دادا کے بھائی کے بیٹے عزیز الرحمٰن کی بڑے عرصے سے اس مکان پر نظریں تھیں اب جو میدان صاف دیکھا تو اپنے ایک وکیل دوست کے ذریعے رسمی کارروائی کے بعد مکان پر قبضہ کر لیا اور اب اپنی فیملی سمیت رہائش پذیر تھا۔

وہ حیران پریشان بے سائبان اور بے امان کھڑی تھی۔

عزیز الرحمٰن نے اتنی مہربانی ضرور کی کہ کچھ عرصے کے لیے اپنے ساتھ رکھنے پر رضامند ہو گیا مگر یہ چند یوم اس محلے میں قیامت کی طرح گزرے۔

عمر دراز خان نے ٹھیک کہا تھا اصل سزا تو اب شروع ہوئی تھی۔ لوگوں کی زبانوں کے تیز نگاہ کی برچھیاں جیسے اندر باہر اس کے تعاقب میں رہتی تھیں۔ اسے دیکھ کر بچے بڑے یوں راستہ چھوڑ کر ایک سمت ہٹ جاتے تھے جیسے کوئی بدروح دیکھ لی ہو۔ لوگوں کی نظروں میں حقارت، نفرت اور لعنت ملامت کے انگارے برسا کرتے تھے اور زبانیں۔ وہ خنجر زبانیں۔

"توبہ توبہ۔ دہائی ہے۔ چار ماہ اپنے یار کے ساتھ گزار کے آئی ہے۔ لو بھلا بتاؤ کوئی پوچھے تمہیں کس کا خطرہ تھا۔ باوا اماں سر پہ نہیں۔ دادی بوڑھی۔ اس کی کیا مجال تھی۔ اتنا پسند تھا تو عزت سے اس سے نکاح کر لیتی پھر چاہے جہاں مرضی جاتی۔ اس طرح اپنے خاندان کی عزت اور غیرت کا سودا تو نہ کرتی۔"

"اے بہن! یہ ملازمت کی شوقین لڑکیاں شادی بیاہ کے بکھیڑے کہاں پالتی ہیں۔ بن سنور کے لچکتی مٹکتی گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہیں اور نوکری کے بہانے اپنے عاشقوں، دل داروں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہیں۔"

"پھر اس کے لچھن تو ویسے بھی شروع سے ہی خراب تھے۔ دیکھا نہیں تھا کیسے دادی سے دو بدو سوال جواب کیا کرتی تھی۔ من مانی کرنے اور زبان درازی کرنے کی بدعادت تو شروع سے اس کو لاحق تھی۔"

"اللہ کی مار ایسی بے حیا اور بے شرم لڑکیوں پر۔ بھلا بوڑھی دادی کا بھی خیال نہیں آیا۔ کوئی خوف خدا نہیں رہا۔ ایک نہ دو پورے چار ماہ۔ توبہ استغفار۔"

"تمہارے چچا جی بتا رہے تھے میں نے صبح نماز پڑھنے کے لیے مسجد نکلتے ہوئے دیکھا تھا اسے جیپ سے اترتے ہوئے۔ وہ شہر کا بڑا مشہور اور دولت مند بندہ ہے۔"
"کون بھلا؟"
"ارے وہی جس کے ساتھ منہ کالا کر کے آئی تھی وہ ناہنجار بے غیرت لڑکی!"
"بھئی شیخ صاحب! آپ محلے کے بڑے ہیں۔ بزرگ ہیں۔ ہمارا خیال ہے۔ اس ضمن میں آپ کو یہ اہم قدم اٹھا لینا چاہیے۔"
"کیا مطلب بھئی کھل کر بیان کیجیے صاحبان!"
"دیکھیے شیخ صاحب! ہماری بھی بیٹیاں ہیں جو جوان ہیں ان کے بیاہ کرنے ہیں اور جو چھوٹی ہیں انہوں نے کل جوان ہونا ہے۔ ہمارا خیال ہے محلے کی پاکیزہ اور صاف ستھری فضا کو آلودہ ہونے سے بچانے کے لیے اس غلاظت کی پوٹ کو اپنے محلے سے نکال دینا چاہیے۔"
"بجا فرماتے ہیں صوفی صاحب! کہیں بے حیائی اور بے غیرتی کی یہ کھلی داستان میرے منہ میں خاک محلے کی بہو بیٹیوں کے لیے مثال نہ بن جائے۔ اس ضمن میں فوری اقدام کرنا ہوگا۔"
اور پھر باہر کی فضاؤں میں برستے الزام اور تہمت کے یہ انگارے گھر کے اندر تک بھی چلے آئے۔
جب ایک دن عزیز الرحمٰن کی بیوی نے بڑی عاجزی سے اس سے مخاطب ہو کر درخواست کی۔
"دیکھو بھئی۔ میں تمہیں یہاں رکھ لیتی مگر بات یہ ہے کہ میری دونوں لڑکیاں جوان ہیں۔ کوثر کی بات طے ہو چکی ہے اگر اس کی سسرال کو یہ خبر ہوگئی کہ چار ماہ تک گھر سے غائب رہنے والی لڑکی ہماری رشتہ دار ہے اور ہمارے ساتھ رہ رہی ہے تو وہ کھڑے کھڑے رشتہ ختم کر ڈالیں گے پھر انجم بھی شادی کے لائق ہوگئی ہے جو تمہاری کہانی کان پڑ گئی تو کون ہماری بیٹی کا ڈولا اٹھائے گا۔ تم برائے مہربانی کہیں اور انتظام کر لو۔"
اور پھر...... پھر ایک اور تازیانہ اس وقت لگا جب سر نیازی نے اسے اپنے کمرے میں بلوا کر استعفیٰ دینے کو کہا۔
وہ ہکا بکا دیکھتی رہ گئی۔ نیازی صاحب اپنے مخصوص پر وقار نپے تلے انداز میں کہہ رہے تھے۔
"دیکھیے مس فرحین احمد! استاد کا کردار طالب علموں کے لیے مشعلِ راہ ہوا کرتا ہے۔ بچے بڑوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں اور معذرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کا کردار اب کوئی قابلِ فخر نہیں رہا۔ اس سے طالب علموں کے اخلاق و کردار کی نشوونما پر فرق پڑے گا۔ بہت عرصے سے اسٹاف کے دیگر ممبران مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ درس گاہ کی فضا کو آلودہ کرنے والے عناصر کا یہاں سے اخراج بہت ضروری ہے اور اب تو بچوں کے والدین بھی شکایت لے کر آنے لگے ہیں کہ آپ کے اسکول کا ماحول اب ٹھیک نہیں رہا۔ ہم اپنے بچوں کو بے حیائی اور بے غیرتی کا سبق نہیں پڑھانا چاہتے۔ چنانچہ مجھے اپنے ادارے کی نیک نامی اور وقار کی خاطر آپ سے مطالبہ کرنا پڑ رہا ہے کہ آپ بخوشی یہاں سے رخصت ہو سکتی ہیں۔"
ایک دو تین چار۔ ذلت کے طاقتور تھپیڑوں کی بارش نے اس کے چہرے کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا تھا۔ صدمہ۔ شدید صدمہ اس کے ذہنی خلجان کا باعث بن گیا تھا۔
اسی ادارے کی فضا کو پاکیزہ شفاف اور آلودگی سے پاک رکھنے کے لیے تو اس نے یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ ان ہی بچوں کی مثبت اخلاقی و جذباتی نشوونما کے لیے تو اس نے نعمان پیرزادہ جیسے مشکوک کردار کے لڑکے کو اپنی کلاس میں ایڈمٹ کرانے سے انکار کیا تھا۔ اس تعلیمی درس گاہ کے مقدس ماحول کو بحال رکھنے کے لیے تو اس نے اذیت کی لامحدود وسعتوں پر محیط وہ چار ماہ کی قید تنہائی کاٹی تھی۔
"ادارے کی فضا کو آلودہ کرنے والے عناصر کا اخراج بہت ضروری ہے۔" رہ رہ کر یہ جملہ اس کے اعصاب پر کوڑے کی طرح برس رہا تھا۔

میں نے جس شاخ کو پھولوں سے سجایا تھا منیر
میرے سینے میں اسی شاخ کا کانٹا اترا

اور پھر ایک اور خبر نے اس کے سینے میں شگاف ڈال دیا۔ اس کی غیر موجودگی میں میٹرک کی کلاس ایک دوسری ٹیچر کے ذمہ لگ گئی تھی اور اس سے "معاملہ" طے کر کے عمر دراز خان پیرزادہ نے نعمان پیرزادہ کو ری ایڈمٹ کرا دیا تھا۔ اور اب وہ شان سے میٹرک کے فائنل پیپر زدے کر فارغ ہو چکا تھا۔
یہ اصولوں پر سمجھوتا نہ کرنے کی سزا تھی جو وہ آج در بدر تھی۔ بالآخر وہ محلہ بدر کر دی گئی۔ بینک میں جو رقم پڑی تھی اسے نکلوا کر ایک گمنام و تاریک علاقے میں فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ جو رقم بچی اس سے کچھ فرنیچر ڈلوا لیا اور پھر گھر کے روٹی پانی کے خرچے اور دادی کے علاج معالجے کے لیے ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔
"تم نے ٹھیک کہا تھا عمر دراز خان! سزا تو میں اب پا رہی ہوں۔ پور پور زخمی ہوں۔ دادی کی آتی

جاتی سانسوں کا خیال نہ ہوتا تو کب کی زہر کھا کر سو رہتی۔ مگر اب جینا اور جیتے رہنا جیسے فرض بن
ساتھ چمٹ گیا ہے۔ بہت حساب ہیں تمہاری طرف عمر دراز میرے روئیں روئیں میں تمہارے ل
نفرت اور صرف نفرت ہے۔ تمہارا نام کلنک کا ٹیکہ بن گیا ہے میرے لیے۔ تمہارا تو بال بھی بیکا نہیں
ہوا۔ تم پر تو کوئی آنچ نہیں آئی مگر تمہیں چین کی نیند میں بھی نہیں سونے دوں گی۔ میں نے تو تمہار
جسم سے بہتے خون کے بدلے اپنی آنکھوں کو خون رنگ کر لیا ہے مگر میری پارسائی کے شیشے پر پڑی گ
تمہارے دامن کو ایک دن ضرور آلودہ کرے گی۔ تم تو آج بھی اتنے ہی چاہے جاتے ہو ہاتھوں ہاتھ
لیے جاتے ہو۔ کسی کو جرأت نہیں کہ تمہیں اسکینڈلائز کر سکے مگر میں تمہارے حصے کی رسوائیاں بھی اپ
دامن میں سمیٹنے پر مجبور ہوں۔ تم سے کوئی جواب طلب نہیں کرتا مگر میں اس معاشرے میں ایک حقیر کیڑے
سے بھی بدتر سمجھی جاتی ہوں۔ لوگ تمہارے نام سے میرے شیشہ عصمت کو چکنا چور کرتے ہیں۔ سب
نے مجھے کھلی گزرگاہ سمجھ لیا ہے۔ جس کا جی چاہتا ہے اپنی پسند کی گالی سے نواز دیتا ہے۔ مگر کب تک آخر
کب تک۔

جنہوں نے بستی اجاڑ ڈالی، کبھی تو ان کا حساب ہوگا۔ بھڑکتی سلگتی یادوں کی چنگاریاں رہ رہ کر اس
کے دل کے گرد الاؤ روشن کر رہی تھیں۔

وہ سر جھکائے اپنے راستے پر چل رہی تھی۔ سر اٹھانا تو جیسے بھول ہی گئی تھی۔ اب تو جیسے گناہ کرنے
شرمسار ہونے والوں کی طرح دوسروں سے خود اپنے آپ سے چھپتی بچتی پھرتی تھی۔ یونہی اسے لگا
جیسے وہ کسی نظروں کے حصار میں ہو۔ اس نے کسی خدشے کے پیش نظر سر اٹھا کر سڑک کی طرف نگاہ کی
اور پھر جیسے زمین و آسمان تھم کر رہ گئے۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر قدم قدم گنتا عین اس کے مقابل
آن کھڑا ہوا تھا۔

اس وقت وہ اپنے اسکول کے گیٹ سے محض ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی اور اسکول گیٹ پر کھڑ
بت کی طرح ایستادہ چوکیدار پوری طرح اس گاڑی سے نکل کر سامنے آنے والے شاندار سوٹڈ بوٹڈ
وجیہہ مغرور سے بندے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''السلام علیکم۔ کیسی گزر رہی ہے۔'' اس کے لہجے میں وہی بشاشت اور گرمجوشی تھی گویا کچھ بھی نہ
ہوا ہو۔

''ہمیں تو تم نے خاصا پریشان کیا۔ ہم دو تین دن پہلے ادھر اپنے ''ٹھکانے'' پر گئے تھے وہاں
ایک ایک نقش تمہیں ڈھونڈتا تمہارا پتا پوچھتا محسوس ہو رہا تھا۔ مکینوں کے ساتھ ساتھ مکان اور ماحول

نے بھی تمہیں مس کیا۔ وہ کیا فرماتے ہیں اپنے ساحر لدھیانوی صاحب کہ

جہاں جہاں تری نظروں کی اوس ٹپکی ہے
وہاں وہاں سے ابھی تک غبار اٹھتا ہے
جہاں جہاں ترے جلوؤں کے پھول بکھرے تھے
وہاں وہاں دل وحشی پکار اٹھتا ہے

جواب میں فرحین نے بلا کے قہرمان انداز میں اسے دیکھا تھا۔

''یہ شاہراہ ہے اور میرا اسکول قریب ہے میں یہاں کوئی تماشا کھڑا نہیں کرنا چاہتی۔ اس لیے بہتر
ہوگا۔ میرا راستہ چھوڑ دو۔'' اس کا دھیما انداز غضب کا سرد پن اور زہر اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔

''اچھا چلیں پھر ملیں گے کبھی کبھی پسپائی اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ یوں بھی اتنی بڑی
شکست فاش دینے کے بعد ہمارا تم سے انتقام کا کوئی سلسلہ باقی نہیں رہا۔ ہمارا مسئلہ تو ویسے بھی حل
ہو چکا ہے۔'' خلاف توقع وہ خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راستے سے ہٹ گیا تھا۔

جب وہ تیز قدم اٹھاتی گیٹ کراس کر کے اندر جا رہی تھی تو چوکیدار کی معنی خیز نگاہیں اس کے اندر
تک اترتی چلی گئی تھیں۔

دوسرے دن چوکیدار نے اسے ایک سفید لفافہ اسٹاف روم میں آ کر تھمایا تو چونک پڑی۔

''وہی کل والے صاحب دے کر گئے ہیں۔'' اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں چوکیدار نے
ذومعنی انداز سے مسکرا کر جواب دیا۔

وہ خود کو بے بسی کی انتہاؤں پر محسوس کرنے لگی۔ دل چاہ رہا تھا بغیر پڑھے دو ٹکڑے کر کے ڈسٹ
بن میں پھینک دے مگر پھر کچھ سوچ کر کھول لیا۔ اندر اسٹائلش وش کارڈ پر سیاہ روشنائی میں درج تھا

ہم بھی شکستہ دل ہیں پریشان تم بھی ہو
اندر سے ریزہ ریزہ میری جان تم بھی ہو
ہم بھی ہیں ایک اجڑے ہوئے شہر کی مثال
آنکھیں بتا رہی ہیں کہ ویران تم بھی ہو
مل جائیں ہم تو کیسا سہانا سفر کٹے
گھائل ہیں ہم بھی سوختہ سامان تم بھی ہو

''اف اللہ۔'' اس کا چہرہ غیض سے جل اٹھا۔ اس نے شدت جذبات سے بری طرح وش کارڈ

مٹھیوں میں بھینچ کر چور چور کر دیا تھا۔
"مجھے انگاروں پر پھینک کر میرا تمسخر اڑاتے ہو عمر دراز خان؟ وہ خدا تو دیکھ رہا ہے اوپر والا سب جانتا ہے میں دوسروں کے حصے کا بھگتان بھی بھگت رہی ہوں کہاں تک' کبھی تو رحم آئے گا نا اس پاک ہستی کو۔ کبھی تو میرے بھی دن پھریں گے۔"
"آؤ نرمین! ہم تمہیں گھر چھوڑ دیں۔ بہت تیز دھوپ ہے۔"
وہ اسکول گیٹ سے نکلی ہی تھی جب سامنے ہی اپنی سرخ چمکتی دمکتی ٹیوٹا کرولا سے ٹیک لگا کر کھڑا عمر دراز خان اسے دیکھ کر اس کی سمت بڑھا تھا۔
ابھی اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی یا اپنے قدم بڑھاتی اسی لمحے پرنسپل نے اپنی سوزوکی کار گیٹ سے نکالتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔
اس کے وجود میں جیسے کوئی بھونچال سا آ گیا۔ پرنسپل اپنی گاڑی نکال کر روانہ ہو چکی تھی مگر اس کی کاٹ دار نگاہوں نے اندر تک اس کی روح کو چھید کے رکھ دیا تھا۔
"کیوں آتے ہو بار بار میری راہ میں؟ تمہارے بچھائے ہوئے انگاروں پر ہی تو چل رہی ہوں اور اطمینان رکھو نرمین احمد کوئی موم کا پتلا نہیں ہے کہ مصائب کی دھوپ میں پگھل جائے گا۔ مت بار بار اپنی شکل دکھا کر میرے دکھوں کا دورانیہ بڑھایا کرو۔"
گیٹ پر ایستادہ حسب سابق ادھر متوجہ چوکیدار کی وجہ سے وہ بہت دھیمے غراتے ہوئے انداز میں گویا ہوئی اور پھر جیسے پیر پٹختی ہوئے آگے بڑھی تھی۔
ابھی وہ گھر کے کچھ فاصلے پر ہی تھی جب دوبارہ سرخ کرولا اس کے راستے میں حائل ہو گئی۔
"سنو۔ سنو۔ ہمیں صرف دو باتیں کہنی ہیں تم سے۔" اس کے غضبناک ہو کر پھٹ پڑنے سے پہلے ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔
"نمبر ایک یہ ہمارا کارڈ رکھ لو کبھی ضرورت یا مصیبت پڑنے پر بلا جھجک کال کر دینا۔ موبائل نمبر بھی درج ہے گھر کے اور دفتر کے تمام کانٹیکٹ نمبرز بھی موجود ہیں۔ نمبر دو یہ کہ ہمیں ساحر لدھیانوی کی زبان میں تم سے کہنا تھا کہ

تیری تڑپ سے نہ تڑپا میرا دل' لیکن
تیرے سکون سے بے چین ہو گیا ہوں میں
یہ جان کر تجھے نہ جانے کتنا غم پہنچے
کہ آج تیرے خیالوں میں کھو گیا ہوں میں

اس کے لبوں پر بڑی واضح قسم کی خوشگوار مسکراہٹ در آئی تھی
"تمہارے ساتھ گزارے لمحات کی یاد ہمیں خاصا ڈسٹرب کرنے لگی ہے۔ تب ہی تو دیکھ لو بغیر کسی باڈی گارڈ اور ڈرائیور کے اتنی غیر معروف سی جگہ پہ بے خطر تم سے ملنے چلے آتے ہیں۔" وہ کہہ کر گاڑی کا دروازہ کھولنے لگا۔ پھر جیسے کچھ یاد آ جانے پر مڑا تھا۔ ارے ہاں۔ یہ بلینک چیک رکھ لو۔ اس میں اپنی ضرورت کے مطابق رقم بھر لینا۔ ان حالات میں ضرور۔"
اور اتنی دیر سے ضبط کے قفل لگائے کھڑی نرمین سے اپنا غصہ دبانا جب دشوار تر ہو گیا تو اس نے جھپٹ کر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں سے چیک تھاما اور پرزے پرزے کر کے ہوا میں اچھالتے ہوئے دانت پیس کر اس کی بات کاٹ کر غرائی۔
"میں لعنت بھیجتی ہوں تمہاری شکل پر' تمہاری دولت پر' تمہارے عہدے پر اور ہر اس شے پر جو تم سے وابستہ ہے۔" پھر وہ رکی نہیں بھاگتی ہوئی اپنے بلاک کی سیڑھیاں طے کرنے لگی تھی۔
گھر پہنچ کر دروازہ مقفل کر کے وہ دادی کے پاس بیڈ روم میں جانے کے بجائے سیدھی ڈرائنگ روم میں آ گئی اور صوفے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر دھواں دھار رونے لگی۔ کچھ اتنی شدت سے کہ اس کی گھٹی گھٹی چیخیں اور سسکیاں دادی کی سماعتوں میں اترنے لگیں۔
"مم۔ می۔ ے" دوسرے کمرے سے دادی کی غوں غاں سن کر وہ ایک جھٹکے سے ہوش میں آ گئی۔ اس سے پیشتر کہ اٹھ جاتی وہ بیساکھی کے سہارے گرتی پڑتی دروازے سے الجھتی اندر آ گئیں۔
"ارے دادی! آپ کیوں اٹھ بیٹھیں۔" اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں تھام نہ لیا ہوتا تو وہ دروازے سے ٹکرا کر بری طرح فرش پہ جا گرتیں۔
"مم۔ می مینے۔" نرمین نے انہیں صوفے پر بٹھا دیا تھا۔ اور اب وہ اس کے کندھوں پر اپنا رعشہ زدہ بوڑھا ہاتھ رکھے شاید اس کے بہتے آنسوؤں کا سبب پوچھ رہی تھیں جنہیں صاف کرنے کی نوبت نہیں آ سکی تھی۔
"دادی۔' اپنی طرف سے تو اس نے خود پر ضبط کے پہرے بٹھانا چاہے تھے' مگر دل اتنا بھرا ہوا تھا کہ بے اختیار پھر سوتے پھوٹ نکلے۔ وہ ان کے لرزتے کانپتے گھٹنوں پر سر رکھ کر بلک بلک کر رونے لگی۔ ان کا بوڑھا ہاتھ ہولے ہولے اس کے گھنے بالوں کو سہلانے لگا پھر محسوس ہوا کہ دادی کی پلکوں سے ٹوٹتے ستارے بھی نرمین کے بالوں میں جذب ہو رہے ہیں۔ نرمین نے تڑپ کر سر اٹھایا اور پھر

ان کے جھریوں بھرے چہرے پہ لرزتے آنسو اپنی دونوں ہتھیلیوں سے صاف کر دیے۔

"نہیں دادی! نہیں تم کیوں روتی ہو میں جو ہوں ہر زخم سہنے کو۔ ہر دکھ بھوگنے کو۔ زمانے کی نگاہ اور زبان سے نکلا ہر تازیانہ کھانے کو۔ تم کیوں روتی ہو دادی۔"

اور اس کا اپنا چہرہ آنسوؤں کے ریلے میں جیسے تر بہ تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

"مس زرمین کہتے ہیں' انسان ٹھوکریں کھا کر سنبھل جاتا ہے اور سبق سیکھتا ہے مگر معاف کیجیے! آپ کے اندر برائی کا زہر اس بری طرح سرایت کر چکا ہے کہ آپ ڈھٹائی سے اپنی اسی روش پر گامزن ہیں۔ آپ کے متعلق اڑتی پڑتی بہت سی مشکوک باتیں میرے کان میں پڑی تھیں مگر میں نے اس کے باوجود رسک لے کر آپ کو اپنے اسکول میں جاب دے دی تھی کہ شاید آپ اپنے رنگ ڈھنگ بدل لیں مگر عادت پختہ ہو جائے تو اس کا کیا علاج۔ میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی کہ میرے اسکول سے وابستہ ٹیچر کے کردار کے چھینٹے میری عزت اور وقار کو داغدار کریں اور میرے ادارے کا ماحول خراب کریں۔ آپ کو شہر کی مشہور اور دولت مند اسامیوں کو پھنسانا ہے تو یہ کام کہیں اور جا کر کریں میرا ادارہ استعمال نہ کریں۔ یہاں اس قسم کی ملاقاتیں' "محبت ناموں" اور پیغامات کا تبادلہ اور کھلے عام بے باکی کے مظاہرے کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ آپ تشریف لے جا سکتی ہیں اور بہتر ہوگا اپنے ہاتھ سے استعفیٰ لکھ دیں ورنہ مجھے بذات خود ٹائپ کرواتے ہوئے خاصا افسوس ہوگا۔"

اوہ خدایا۔ آزمائشوں کی یہ لمبی قطار۔ کیا اس دیوار چین کا دوسرا سرا کبھی میرے ہاتھ نہیں آئے گا

ایک بار پھر۔ ایک بار پھر وہی انگارہ جملے وہی خنجر صفت زبان۔

ابھی کیا کہیں ابھی کیا سنیں
کہ سر فصیل سکوت جاں
وہ جو حرف حرف چراغ تھا
اسے کس ہوا نے بجھا دیا
کبھی لب ہلیں گے تو پوچھنا
سر شہر عہد وصال دل
وہ جو نکہتوں کا ہجوم تھا
اسے دست موج فراق نے

تہہ خاک کب سے ملا دیا
کبھی گل کھلیں گے تو پوچھنا
ابھی کیا کہیں' ابھی کیا سنیں
یوں ہی خواہشوں کے فشار میں
کبھی بے سبب' کبھی بے خلل
کہاں کون' کس سے بچھڑ گیا
کبھی پھر ملیں گے تو پوچھنا

مجھے تو آنسو کبھی اچھے نہیں لگتے تھے نہ اپنی آنکھ میں نہ کسی کی آنکھ میں۔ میں تو خوشی' اعتماد اور اعتبار کے دیس کی باسی تھی۔ مجھے تو روشنیاں اچھی لگتی تھیں۔ پھر مجھے اندھیروں میں کس نے دھکیل دیا۔ میں تو ہر رخ پہ خوشیاں ہی دیکھنا چاہتی تھی۔ پھر میری خوشیاں کون میرے چہرے سے نوچ کے لے گیا یہ کون میرے منہ پہ گناہگاری کی سیاہیاں پھیر گیا ہے۔ میں تو سچائیوں کا احترام کرنے والی تھی پھر میری ذات کی سچائیاں کیوں دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں میں نے حق سچ اور انصاف کی راہ پہ ثابت قدمی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے لیے زنداں میں چار قیامت کے مہینے ویرانے میں بسر کر دیے مگر دنیا والوں نے اس چھوٹے سے زنداں سے مجھے ایک بڑے زنداں میں کیوں ڈال دیا ہے جہاں چاروں اطراف بھانبڑ ہی بھانبڑ ہیں جہاں شک کے ناگ اپنی دوشاخی زبانیں نکالے میری روح کو لحہ لحہ ڈستے ہیں۔

آہ۔ یہ ماضی۔ یہ ماضی کے ہیولے کبھی میرا پیچھا چھوڑ دیں گے؟

وہ ایک بار پھر غم روزگار سے نبرد آزما تھی کمپوزنگ سنٹر سے ملنے والے اٹھارہ سو روپے بھلا کیا ساتھ دے سکتے تھے' اس سے تو راشن پانی کے خرچے بھی پورے نہیں ہوتے تھے۔

اب اس نے ٹیچنگ کے بجائے کسی دفتری جاب کے لیے تلاش شروع کر دی' مگر مایوسی جیسے اس کے مقدر کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ ہر جگہ "تجربہ" تھال میں سجا کر پیش کرنا پڑتا تھا۔ پھر رشوت' سفارش' پہنچ وہ کس کس محاذ پر لڑتی۔

دادی کی طبیعت دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی مخصوص ایکسرسائز نہ کر سکنے کے باعث ان کی دونوں ٹانگیں پھولنا شروع ہو گئی تھیں۔ قوت گویائی پہلے سے بھی کم رہ گئی تھی۔ ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ صدمے سے چلی جانے والی قوت گویائی کے واپس آنے کے امکانات بہرحال موجود ہوتے ہیں۔ اس سلسلے

میں کیس مخصوص تھراپی اور میڈیسن وغیرہ کے ذریعے رفتہ رفتہ نارمل ہوسکتا ہے اور وہ سارے جتن بھی اسی لیے کر رہی تھی۔ اس کی اولین خواہش تھی کہ دادی کی گویائی لوٹ آئے۔ پتھروں کے اس دیس میں کوئی تو اس کی سن کر تسلی کے دو میٹھے بول اس کی جھولی میں ڈالنے والا ہو۔ اس دن بھی دادی کو خاصی تکلیف تھی ٹانگوں میں' ساتھ بخار بھی تھا۔ دوپہر تک تو وہ ان کے پاس بیٹھی ان کو دباتی رہی ان سے باتیں کرتی رہی مگر دو بجے اسے کمپوزنگ سینٹر جانا تھا کہ اب ایسی نوکری کو ہاتھ سے گنوانے کی حماقت نہیں کر سکتی تھی۔

''دادی! میں جگ' گلاس اور ڈونگے میں سادہ چاول ادھر آپ کے بستر کے ساتھ میز پر رکھ کر جا رہی ہوں تاکہ آپ کو تکلیف نہ ہو۔ کوشش کروں گی جلدی لوٹ آؤں۔ اس حالت میں آپ کو چھوڑ کر جانے کو تو دل نہیں مانتا مگر کیا کروں۔ آج تنخواہ ملنی ہے۔ جس سے آپ کے لیے دوائیں لانی ہیں۔''

جواب میں دادی نے ہاتھ کے اشارے سے اور منہ سے غوں غاں کر کے کچھ سمجھانے کی کوشش کی جسے وہ سمجھ گئی کہ اب وہ ان کے اشاروں کی زبان سے کس قدر واقف ہوگئی تھی۔ ''آپ کہتی ہیں۔ دوائیں نہ لاؤں۔ خرچا ہوگا اور پھر کھانے پینے کے لیے کہاں سے آئے گا مگر دادی پیاری! اللہ مالک ہے آپ کے لیے ہی تو سب کچھ کرتی ہوں تاکہ آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں ورنہ اس سیاہ کار' غلاظت میں لتھڑے بے کار وجود کی سلامتی کے لیے کس کافر نے کھپنا تپنا تھا۔ بس دادی جلدی سے ٹھیک ہو جائیں آپ کے سوا میرا ہے ہی کون پھر تو پیچھے میرا بدصورت کریہہ ماضی ہی رہ جائے گا۔ میری جان کا عذاب۔''

اس کے گلے میں جیسے پھندے لگنے لگے۔ کسی زمانے میں شاعری کی کتاب میں پڑھی ہوئی نظم کے چند شعر اس کے ذہن میں چک پھیریاں کھانے لگے۔

اپنے ماضی کے تصور سے ہراساں ہوں میں
اپنے گزرے ہوئے ایام سے نفرت ہے مجھے
اپنی بے کار تمناؤں پہ شرمندہ ہوں
اپنی بے سود امیدوں پہ ندامت ہے مجھے
میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہنے دو
میرا ماضی مری ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں
میری امیدوں کا حاصل' میری کاوش کا صلہ
ایک بے نام اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں

📖

کمپوزنگ سینٹر سے واپس آتے آتے خاصی دیر ہوگئی تھی کیونکہ مطلوبہ روٹ کی بس دیر سے ملی تھی۔

سست روی سے بلاک کی سیڑھیاں طے کر کے وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہوئی تو سوا چھ بج رہے تھے سردیوں کا موسم تھا اس لیے سوا چھ بجے ہی رات کی سیاہ تاریکی پھیل گئی تھی۔

بیڈروم میں آ کر بیگ اور چادر اتارنے کے بعد اس نے جھلائے ہوئے کوفت زدہ انداز میں سینڈل اتارے اور پاؤں ایک دوسرے سے مسلتی کاہلی سے سیدھی ہو کر دادی کی طرف متوجہ ہوئی۔

''دادی۔ دادی۔'' پھر ذرا دھیان سے دیکھا اور دھک سے رہ گئی۔ دادی بستر پر موجود نہیں تھیں۔

''دادی۔'' اس کا دل جسم کے پنجرے میں جیسے پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔ ''دادی۔ آپ کدھر ہیں۔'' وہ پاگلوں کی طرح اٹھ کر انہیں ادھر ادھر تلاش کرنے لگی۔

اس کا دل کسی انجانے خدشے سے دھڑ دھڑائے جا رہا تھا حواس باختہ سی ننگے پاؤں باتھ روم کی طرف لپکی اور دروازے پر ہی اوندھے منہ گری دادی کو دیکھ کر جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔

ڈرتے ڈرتے انہیں سیدھا کر کے دل کی دھڑکن چیک کی۔ اس کا اپنا دل اس قدر زور سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی کسی آن پسلیاں توڑ کر باہر آن گرے گا۔ ان کے دل کی دھڑکن دھیمے دھیمے نامحسوس سے انداز میں رک رک کر چل رہی تھی۔ اس کی جان میں جان آئی پھر جیسے تیسے کر کے انہیں کچھ اٹھا کر کچھ گھسیٹ کر پلنگ پر ڈالا اور ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگی۔ یکلخت اس کو احساس ہوا اس طرح دادی زندگی سے مزید دور ہوتی جا رہی ہیں۔ انہیں اسپتال لے جانا انتہائی ضروری تھا۔

''مگر اس وقت کیا کروں۔ کس طرح انہیں لے کر جاؤں۔'' اس کے تو ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ صحیح معنوں میں حواس جواب دینے گئے۔

ٹیکسی اس ویران سنسان علاقے میں کہاں سے ملتی اور بالفرض مل بھی گئی تو بھی چھٹی منزل سے گراؤنڈ تک کس طرح انہیں لے جا پاؤں گی۔ میری ''شہرت'' کے طفیل کوئی پڑوسی بھی مدد کرنے کا مجاز نہیں ہوگا۔

اس کے اندر بھونچال سا آ گیا تھا پھر لگا جیسے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

''مجبوری میں تو حرام بھی جائز ہو جاتا ہے۔'' وہ کچھ سوچ کر اپنے بیگ کی جیبیں کھنگالنے لگی۔ اس وقت کا بے دھیانی سے گھسیڑا جانے والا کاغذ کا وہ بے کار پرزہ اس کے خیال میں اب کتنا متاعِ جاں

محسوس ہو رہا تھا۔

بالآخر کار ڈل ہی گیا جسے جھپٹ کر بیگ سے جھانکتا پچاس کا نوٹ کھینچ کر وہ اندھا دھند سیڑھیوں کی طرف لپکی تھی۔ فلیٹس سے کچھ دور مارکیٹ کے نام پر بنی دو چار دکانوں کے ساتھ۔ پی سی او تھا۔ اس نے افراتفری میں موبائل نمبر ملایا۔

"یس عمر دراز خان پیرزادہ اسپیکنگ۔" چند ساعت بعد اس کی بارعب گونجیلی آواز جیسے ایئر پیس پر چھا سی گئی وہ کچھ دیر تک خشک لبوں پر انگلیاں پھیرتی بولنے کے لیے اپنے مختل حواس قابو میں کرتی رہی۔

"السلام علیکم۔ میں نرمین بات کر رہی ہوں۔" اس نے دھیمے سے مغلوب لہجے میں کہا۔

"اوہ اچھا۔ کیوں خیریت تو ہے نرمین!" اتنا تو وہ جانتا تھا کہ اتنی رات گئے اور اتنی مدت بعد اس طرح اس سے کانٹیکٹ کسی خوشگوار صورتحال میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سو اس کے لہجے میں واضح طور پر تشویش امڈ آئی تھی۔

"وہ دادی۔ دادی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ بے ہوش پڑی ہیں۔" وہ سب قرار و تاب کھو کر بری طرح بکھر گئی۔

"ڈونٹ وری نرمین! ہم ابھی اور اسی وقت آ رہے ہیں۔ تم حوصلہ کرو۔" اس کے بھرائے ہوئے لہجے اور آنسوؤں میں گھلی سسکتی آواز نے عمر دراز خان کے اندر جیسے چابی سی بھر دی تھی۔ وہ بہت بے چین سا ہو کر گویا ہوا کے دوش پہ اڑتا ہوا پہنچا تھا۔

"اوہ انہیں فی الفور اسپتال لے جانا ہوگا۔" ایک سرسری سے جائزے سے ہی وہ دادی کی مخدوش حالت کے بارے میں جان گیا۔

"تم دروازے وغیرہ لاک کر کے گاڑی میں بیٹھو۔ ہم انہیں نیچے لے کر آتے ہیں۔"

دادی کو اپنے دونوں بازوؤں میں احتیاط سے سنبھال کر وہ بہ سرعت سیڑھیاں طے کرنے لگا تھا۔ جب وہ اس کے پیچھے گرتی پڑتی آ رہی تھی تو بہت سے گھروں سے جھانکتے چہروں نے دور تک ان کا پیچھا کیا تھا مگر اس وقت اسے کسی شے کی پروا نہیں تھی۔

ہاسپٹل والوں نے دادی کی حالت کے پیش نظر فوراً سے پیشتر آئی سی یو میں داخل کر لیا۔ عمر دراز خان پیرزادہ کی سیاسی و سماجی اور معاشی اعتبار سے مستحکم شخصیت کی موجودگی بذاتِ خود ہاسپٹل کی انتظامیہ کی خصوصی دیکھ بھال اور پھرتیوں کا باعث بن گئی تھی۔ سچ ہے پیسہ اور عہدہ بولتا ہے۔ مریضہ کے وی آئی پی روم کے ساتھ ان کے "لواحقین" کے لیے بھی الگ کمرے کا فوراً سے پیشتر انتظام کرد

گیا تھا جہاں وہ دونوں اس وقت موجود تھے۔ پوری رات جیسے آنکھوں میں کٹ گئی۔ وہ نڈھال سی لب بستہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کبھی بے قرار ہو کر اٹھ کھڑی ہوتی اور پریشانی کے عالم میں مٹھیاں بھینچ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگتی۔

"دادی ٹھیک ہو جائیں گی ناں عمر دراز خان! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

بالآخر وہ مہر سکوت توڑ کر بے تابی سے کہہ کر خوفزدہ سے انداز میں اسے دیکھنے لگی اس پریشانی کے عالم میں اس کا وجود بہت مضبوط سہارا محسوس ہو رہا تھا۔

عمر دراز خان نے سر اٹھا کر بغور اس کا متورم چہرا دیکھا۔ اندیشوں نے جیسے اس کا سارا وجود نچوڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ آہستگی سے اس کے قریب آیا اور دھیرے سے اسے بے ساختہ شانوں سے تھام لیا۔

"انشاء اللہ ضرور ٹھیک ہو جائیں گی۔ تم فکر نہیں کرو۔" وہ بہت رسان سے تسلی دے رہا تھا۔

وہ بے اختیاری کی سی کیفیت میں اس کے سینے پر پیشانی ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کڑے وقت میں تسلی کے دو بول اور اپنائیت بھرا لمس کس قدر جاں فزا اور تقویت بخش ہوا کرتا ہے۔ نرمین کو پہلی بار شدت سے احساس ہوا تھا۔

"بی بریو۔ شاباش۔" اس نے انگلی کی پوروں سے اس کے اشک صاف کرتے ہوئے اس کا سر تھپتھپایا۔

صبح آٹھ بجے خوشخبری سننے کو ملی کہ مریضہ کو ہوش آ گیا ہے۔ کچھ دیر بعد پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دی جائیں گی۔ تب ان کے گھر والے ان سے مل سکیں گے۔

عمر دراز خان نے بے ساختہ سکون کا گہرا سانس لیتے ہوئے اس کی سمت دیکھا جس کے رخ پہ آن کی آن میں مسرت کے تمام جگنو چمک اٹھے تھے۔

"نرمین! تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ آؤ ناشتا کر لو۔ دادی جان اب بالکل ٹھیک ہیں۔" وہ دادی کے بستر پر سرہانے بیٹھی ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیے جانے کون سے قصے سنا رہی تھی جب پشت سے عمر دراز خان نے آواز دی تھی۔ وارڈ بوائے اس کے حکم پر ناشتا ٹیبل پر لگا کے جا چکا تھا۔

"مجھے کوئی خاص بھوک محسوس نہیں ہو رہی۔" اس نے یونہی عذر کر دیا۔ اس کا دل دادی کے پاس سے اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ جیسے اندیشہ ہو کہ اٹھے گی تو دادی دوبارہ آنکھیں موند لیں گی۔ دادی نے اس کے ہاتھ پہ دباؤ ڈال کر جیسے عمر دراز خان کی بات ماننے کی تاکید کی۔

"نہیں بھئی۔ یہ غلط بات ہے۔ پیٹ سے بھلا کیا دشمنی۔ چلو آؤ۔" اس کے انداز میں قدرے تحکم

تھا مگر اس نے برا نہیں مانا۔ بالآخر وہ آ گئی۔ اس نے بڑے اصرار سے ناشتا کرایا۔

"اسمبلی میں بہت ضروری میٹنگ ہے جس میں شرکت لازم ہے۔ دو تین گھنٹے لگ جائیں گے اس دوران فصیح تمہارے پاس رہے گا پھر بھی کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو موبائل نمبر پر فوری رابطہ کرنا۔ اوکے۔" اس کے جانے کے بعد فصیح آیا تو باس کی حسبِ ہدایت فروٹ جوس کے پیکٹ' دودھ کے پیکٹ' یخنی' سوپ اور جانے کیا کیا کچھ ایک ذخیرے کی شکل میں ہمراہ لے کے آیا تھا۔

دوپہر تک عمر دراز خان واپس آ چکا تھا۔ شام تک وہ ہمراہ رہا۔ اس کی موجودگی میں ڈاکٹرز کے وفود' نرسیں اور وارڈ بوائے وقفے وقفے سے چکر لگاتے رہے۔

"یہ ساتھ ہی ٹوائلٹ ہے تم شاور لے کر لباس تبدیل کر لو۔" ساتھ ہی اس نے ریڈی میڈ سوٹ کا لفافہ اس کی طرف اچھال دیا۔ "راستے میں ہمیں خیال آیا تمہیں یقیناً فریش ہو کر لباس بدلنا ہوگا۔ سو جو بوتیک سامنے نظر آیا وہیں سے افراتفری میں لے لیا۔"

خیال رکھنے کا یہ انداز کس قدر انوکھا تھا۔ اس نے خجل سا ہو کر دزدیدہ نگاہوں سے دادی کی طرف دیکھا۔ ان کی کھلی آنکھوں میں اطمینان کی لہریں تھیں۔ وہ چپ چاپ باتھ روم کی جانب مڑ گئی۔

"دادی جان بالکل ٹھیک ہیں۔ فصیح ان کے پاس بیٹھے گا۔ اتنی دیر میں ہم رات کا کھانا کھا آتے ہیں۔ یہ سامنے ہی ریسٹورنٹ ہے۔"

"نہیں۔" اس نے قطعی انداز اختیار کیا مگر اسی وقت دادی نے ہاتھ کا اشارا کیا۔ وہ کچھ جھنجھلا سی گئی لیکن بہرحال دونوں طرف کے اصرار نے اسے پابہ زنجیر کر دیا۔

"ڈاکٹر بتا رہے تھے اگر ان کی طبیعت سنبھل گئی تو دو تین دن بعد ڈسچارج ہو جائیں گی۔" کھانے کے دوران وہ بتا رہا تھا۔

"اچھا...... اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" اس نے صدقِ دل سے دعا دی۔

"تم نے مصیبت میں میری مدد کی اس کے لیے میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ کیا تم ایک نیکی میرے ساتھ اور کر سکتے ہو؟ میرے پاس ہاسپٹل کے ڈیوز کلیئر کرنے اور میڈیسن وغیرہ کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ کیا تم مجھے کچھ رقم ادھار دے سکتے ہو؟ میں انشاء اللہ جلد تمہیں لوٹا دوں گی۔" اس نے بڑی سادگی سے دریافت کیا۔ جب ناک ہی نہ رہے تو پھر کیا حجاب۔ گردن میں خم تو اسی وقت آ گیا تھا جب اس سے مدد مانگنے کے لیے اس کا نمبر گھمایا تھا۔ اب نام نہاد پردہ داریوں سے کیا حاصل۔ جواب میں وہ نظر بھر کے اسے دیکھتا ہوا بے ساختہ مسکراہٹ چھپا نہ سکا۔

"ہمارے تو اور بھی بہت سے ادھار نکلتے ہیں تمہاری طرف۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہ کھاتہ الگ ہے۔" اس کے لہجے میں یکایک برفیلا پن اتر آیا تھا۔ ان کے واپس لوٹنے پر فصیح باس کی ہدایت کے مطابق گھر چلا گیا۔ زرمین وقت گزاری کو یونہی ایک میگزین کھنگالنے لگی۔ کچھ دیر بعد تسلی آمیز انداز میں اٹھ کر دادی کی طرف بڑھی تو عجیب سرسراتی سی ناہموار آوازیں کان میں پڑنے لگیں۔

"دادی۔" وہ تیزی سے ان کے قریب آئی اور پھر جیسے سناٹے میں رہ گئی۔

"عمر دراز خان۔ ایک منٹ ادھر آنا۔ یہ دادی کو کیا ہو رہا ہے۔" اس کا لہجہ خوف و دہشت میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ فون پر کسی سے محوِ گفتگو تھا۔ تیزی سے ریسیور رکھ کر ادھر لپکا۔ دادی کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔

"دادی۔" زرمین کا دل ڈوبنے لگا۔ بے قراری سے ان کا ہاتھ تھاما۔ دادی نے اپنا دوسرا نحیف کانپتا ہاتھ پاس کھڑے عمر دراز خان کی طرف بڑھایا جو نرس کو بلانے کے لیے بیڈ کے ساتھ لگا بٹن پش کر رہا تھا۔

"جی دادی اماں! ہم ادھر ہی ہیں آپ کے پاس۔" اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھوں میں دے دیا۔ دادی نے اس کے ہاتھ پر زرمین کا سنہری ملائم ہاتھ رکھ کر دونوں کے ہاتھوں کے اوپر اپنا منحنی سا بوڑھا رعشہ زدہ ہاتھ رکھا۔ ایک اطمینان بھری نگاہ دونوں کے چہرے پر ڈالی اور اپنا مفہوم نگاہوں سے سمجھا کر سکون سے آنکھیں موند لیں۔ ہمیشہ کے لیے۔

"دادی۔" ایک دلدوز چیخ کے ساتھ وہ بے ہوش ہو کر لپک کر سہارا دیتے ہوئے عمر دراز خان کے بازوؤں میں آ رہی تھی۔

اس کی "شہرت" کا گراف مزید اونچا ہو کر "اعلیٰ سطح" کو چھونے لگا تھا۔ کتنے لوگوں نے اسے عمر دراز خان کی گاڑی میں ہاسپٹل میں' ریسٹورنٹ میں' دادی کی فوتگی کے موقع پر اور اس کے بعد باقاعدگی سے اس کے فلیٹ کا وقت بے وقت چکر لگاتے خبر گیری کرتے دیکھا تھا۔ ڈھکے چھپے انداز میں اخبارات میں بھی اسکینڈل اچھالا جانے لگا تھا۔ عمر دراز خان کو تو جیسے ازل سے اس بات کی کوئی پروا نہیں رہی تھی مگر زرمین "شہرت" کی یہ کرچیاں اپنی لہولہان پلکوں سے چن رہی تھی۔

"تمہارا انتقام پورا ہو گیا ہے۔ دیکھ لو اتنا لہو تو تمہارے جسم سے بھی نہ بہا ہوگا جتنا ان آنکھوں سے

بہہ چکا ہے۔تم تو ''سود'' تک وصول کر چکے ہو۔اب خدا کے واسطے میرا پیچھا چھوڑ دو۔مجھے سکون سے مر تو جانے دو۔کیا لینے آتے ہو میرے پاس۔کس قابل چھوڑا ہے مجھے۔اب کیا رہ گیا ہے جسے لوٹنے کی آس میں ہو۔بس کرو اب۔''

اس دن بھی حسب معمول وہ شام کو اس کے فلیٹ پر آیا تو وہ بالآخر چیخ پڑی۔

''ریلیکس۔ریلیکس۔''اس نے آہستگی سے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر اسے صوفے پر بٹھادیا اور پھر خود بھی نزدیک ہی بیٹھ گیا۔

''اچھا ہوا تم نے خود ہی بات چھیڑ دی۔ہم بھی اسی کے منتظر تھے مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کریں۔ہم اس لیے باقاعدگی سے یہاں آتے ہیں کہ تمہاری دادی اماں اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت ہم پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے تمہیں ہمارے سپرد کر گئی ہیں اور اب تمہاری خبر گیری ہمارا فرض بن گئی ہے۔تم یہاں بالکل اکیلی ہو اور ہمارا دھیان اسی پوائنٹ پر لگا رہتا ہے۔اس لیے ہم نے طے کیا ہے کہ اب تمہیں اپنے ساتھ لے چلیں گے باقاعدہ شرعی رسومات ادا کر کے۔''

جواب میں بلا کے تلخ اور سرد انداز میں اسے گھورنے لگی۔

''کیوں۔''ڈرامے کرتے ہو عمر دراز خان! اپنی حیثیت دیکھو اور میرا مقام دیکھو۔''

تم تو اس معاشرے کے بڑے پسندیدہ' اعلا مروجہ اخلاقی اقدار کے پابند اور اثر و رسوخ کے باعث حاصل ہونے والی ''عظمتوں'' کے علمبردار ہو۔عزت دار کہلائے جاتے ہو۔میرے پاس کیا ہے۔عزت سلامت ہوتے ہوئے بھی جی بھر کے بے عزت ہوئی ہوں۔میری ''شہرت'' کے قصے تو اتنے پھیل چکے ہیں کہ اب ارد گرد کے لوگ مفت مشورے دینے لگے ہیں کہ

گھر کو بے حیائی اور فحاشی کا اڈہ بنانے سے بہتر ہے بازار کے بالا خانوں کو رونق بخش دو۔مجھ کالک زدہ وجود کا تعفن کون برداشت کرے گا۔مجھے اس زنداں میں رہنے دو۔یہ تمہارے سنہری پنجرے۔سے کہیں بہتر ہے۔یہاں میں اپنی مرضی سے سر پٹک پٹک کر جان تو دے سکتی ہوں ناں۔ایک مرتی ہوئی بوڑھی روح سے کیے گئے وعدے کو نبھانے کے لیے مجھ سے نکاح کے دو بول پڑھوا کر تم اپنا سیاسی کیریر بچانے کے لیے گھر کے تاریک کونے میں ڈال دو گے مجھے گوارا نہیں اور دنیا کو خبر کر کے یہ بندھن جوڑنا گویا رسوائی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے مترادف ہوگا۔لوگوں کی نگاہوں کا تمسخر ان کے شکوک اور الزامات کا واضح ثبوت بن کر ان کا سامنا کرنا میرے بس میں نہیں ہوگا اور پھر تم کیوں یہ گند سمیٹو۔ایک بے بس' بے کس' بے سہارا اور بے سرو سامان لڑکی جب اپنے دامن میں اس قدر ''شہرتوں''

کے داغ لیے ہو تو کون ''عزت دار'' اس کے سر پر چادر ڈالنے کو معاشرے کے مقابل ڈٹ کر کھڑا ہوتا ہے۔''وہ بے پناہ دکھ کے احساس سے شدت سے رو دی۔

عمر دراز خان نے تاسف اور ملول نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم نے دیکھا زمین! تم اپنی ذات کی تمام تر سچائیوں اور نیکیوں کے باوجود معتوب ٹھہری ہو اور ہم جو جرم میں برابر کے شریک ہیں بلکہ اصل مجرم ہیں ہم اپنی تمام تر بداعمالیوں کے باوجود سب کی نظروں میں معزز اور معتبر ٹھہرے ہیں جو بات تم پر الزام بنا کر ڈالی جاتی ہے سب کچھ جاننے کے باوجود ہم سے براہ راست منسوب کرنے کی کسی میں جرأت نہیں ہوتی' حالانکہ سب کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں مگر پانی ہمیشہ نشیب کی طرف ہی بہتا ہے۔ہم اس معاشرے میں اعلیٰ معاشی و سماجی استحکام رکھتے ہیں اس لیے اٹھتی ہوئی انگلیاں ہماری بلند و بالا شخصیت کے رعب داب اور جاہ و جلال کے آگے خود بخود جھک کر برابر ہو جاتی ہیں۔سچ تو یہ ہے زمین کہ عزت' شرافت' سچائی' مساوات اور توازن کے جن اعلا اخلاقی اصولوں کا تم پرچار کر رہی ہو یہ اب ہماری سوسائٹی کے لیے اجنبی ہو گئے ہیں۔یہاں سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ ''پیسہ اور پہنچ لڑا کر کام نکالو'' اور دھاندلی کے اس عظیم اصول پر سب ہی افراد حسب توفیق مضبوطی سے کاربند رہتے ہیں۔زمین! آج ہم تمہیں بتائیں کہ ایک زمانے میں ہم بھی تمہارے وضع کیے گئے اصولوں پر چلا کرتے تھے۔

ہم تین بھائی اور ایک بہن ایک غریب سی بیوہ کی اولاد تھے جس نے ہمیں شرافت و نجابت اور اخلاق و انصاف کا درس دیا تھا جس نے راتوں کو چراغ کی روشنی میں دوسروں کے کپڑے سی سی کر اور دن کو لوگوں کے گھروں کی صفائیاں ستھرائیاں کر کر کے ہمیں پالا تھا۔بڑے ارمان تھے اس کے دل میں' مگر ہوا کیا۔ہمارا بڑا بھائی کالج میں گیا۔بہت اصرار کے باوجود وہ کسی تنظیم کا ممبر نہیں بنا۔اسے بس اپنی پڑھائی سے غرض تھی۔کالج کی ہی دو مخالف تنظیموں میں آپس میں خون خرابہ ہو گیا۔بات کالج کی چار دیواری سے نکل کر عدالت تک جا پہنچی۔ہمارا بھائی بھی موقع کا عین شاہد تھا اس نے جا کر سچ اگل دیا اور سچ کی سزا یہ ملی کہ اس تنظیم کے پیچھے اعلا سیاسی شخصیت نے اسے پراسرار طریقے سے قتل کر ڈالا اور ہماری بہن کو۔''اس نے شدت جذب سے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔

''ہماری بیوہ ماں تڑپنے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ہم تو انتہا درجے کے بے بس اور لاچار تھے مگر اس بات نے ہمارے جوان ہوتے لہو کے اندر بہت سی حقیقتوں کے رنگ بھر دیے۔

ہم نے سوچ لیا کہ غریبوں کو کیڑے مکوڑے سمجھ کر ختم کر دینے کا اختیار رکھنے والی کرسیوں تک ضرور

رسائی حاصل کریں گے۔ ہمارے ملک میں دو طرح کے ڈاکو پائے جاتے ہیں۔ ایک تو جنگل کے ڈاکو ہیں اور دوسرے وہ لٹیرے ہیں جو کرسیوں پر بیٹھ کے عوام کو دیدہ دلیری سے لوٹ رہے ہیں۔ سو ہم نے کالج لائف میں قدم رکھتے ہی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک مضبوط سیاسی شخصیت کی ''تربیت گاہ'' میں ''داخلہ'' لے لیا۔ اس نے ہمارے اندر کے ''جوہر'' جانچ کر ہمیں کندن بنا دیا۔ اس کے اشاروں پر ناچتے ہوئے اس کی معیت میں اس کو فالو کرتے کرتے ہم اپنا مقام خود بناتے گئے اور بالآخر منسٹری تک جا پہنچے۔ چور دروازے نے ہمیں اس مقام تک پہنچا دیا جس کا میں ایک بے کس ولاچار بیوہ کا بچہ کبھی تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ دراصل ہمارے ہاں گناہ وثواب کے پیمانے بڑے مختلف ہیں ہم کتابوں میں کچھ پڑھتے ہیں اور عملی زندگی میں کچھ کرتے ہیں۔

ہمارا معاشرہ دوغلے پن کا شکار ہے جو جرم ''بڑا آدمی'' کرتا ہے اس سے اغماض برتا جاتا ہے اور اسے فراخدلی سے معاشرے کے کسی عام سے معمولی سے بے حیثیت سے شخص کے سر تھوپ دیا جاتا ہے مگر ہاں کسی ''عام آدمی'' سے سرزد ہوا معمولی سا غلط فعل ساری عمر کے لیے سیاہ طوق بن جاتا ہے۔''

''تو تم نے کیا انوکھا کارنامہ کیا؟ تم بھی تو ان ہی میں شامل ہو گئے ہو جو اپنے جرم کی صلیبیں کمزوروں کی گردنوں میں ڈالنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ماضی میں تم نے مظالم سہے اور اب خود ظالم بن کر معاشرے سے انتقام لے رہے ہو۔ کیا کمال دکھا رہے ہو؟ نہیں عمر دراز خان! درحقیقت ہونا تو یہ چاہیے کہ جس عظیم کرب اور ظلم کا آپ شکار ہوئے ہیں' با اختیار بن کر اس سے دوسروں کو بچانے کی سعی کی جائے اور اگر ایسا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوں تو لوٹ مار اور ظلم وستم کے اس بازار کو گرم کرنے والے گروہ میں شمولیت اختیار نہ کی جائے اگر آپ باز رکھنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو کم از کم باز رہ تو سکتے ہیں ناں۔ تم اپنی محرومیوں اور دکھوں کے بدلے کمزوروں سے لیتے پھر رہے ہو۔ دھاندلی کے جس زہریلے اصول نے تمہیں ڈسا' تم اب اس پر عمل پیرا ہو کر دوسروں کی زندگیوں میں زہر گھولتے پھر رہے ہو؟ پیسے اور پہنچ سے کام لے کر دوسروں کی پرسکون زندگیوں کو جہنم زار بنا رہے ہو۔ میں تو پورا پورا زخمی ہونے کے باوجود بہرحال مطمئن ہوں کہ ضمیر اپنی جگہ زندہ وتابندہ ہے مگر تم بے ضمیری کی گرد لیے کس طرح اپنے آپ کو روشن دل ودماغ رکھنے والے گروہ میں شامل کر رہے ہو۔

مجھے تو آج بھی اپنے کیے پہ افسوس نہیں۔ میں سمجھتی ہوں اگر اس دن وقتی طور پر گردن بچانے کے لیے تم سے سمجھوتا کر لیتی انصاف اور عدل وتوازن کے اصولوں کو پسِ پشت ڈال دیتی تو آج مجھے کہیں وہ جگہ نہ ملتی جہاں بیٹھ کر اپنی مردہ ضمیری پر چند آنسو ہی بہا سکتی۔ کیا ہوا جو آج کانٹوں پہ گھسیٹی جا رہی ہوں۔ سرِ عام پتھراؤ کیا جا رہا ہے میری ذات پر۔ میرا اندر تو روشن ہے ناں۔

میرے ہمراہ پچھتاووں اور ضمیر کی ملامتوں کا بوجھ تو نہیں ہے ناں۔''

وہ کچھ دیر یونہی دم بخود بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا پھر ایک دم اٹھ کر بنا کسی سوال جواب کے نکل کھڑا ہوا۔

ایک ہفتہ گزر گیا مگر وہ پلٹ کر دوبارہ نہ آیا۔ البتہ اس دوران فصیح باقاعدگی سے شام کو دروازے پر کھڑے کھڑے اس کی خیر خیریت اور اشیائے ضرورت کے بارے میں اپنے باس کی ہدایت کے مطابق پوچھتا رہا اور سودا سلف وغیرہ وافر مقدار میں بے کہے پہنچا دیتا۔ ایک دن اسی کے ہاتھ عمر دراز خان کی طرف سے ایک سفید لفافہ وصول ہوا۔ زرین نے کھول کر پڑھا۔ ساحر لدھیانوی کی بڑی پرسوز سی برجستہ نظم درج تھی۔

تو بھی کچھ پریشان ہے
تو بھی سوچتی ہو گی
تیرے نام کی شہرت' تیرے کام کیا آئی
میں بھی کچھ پشیماں ہوں
میں بھی غور کرتا ہوں
میری کام کی عظمت' میرے کام کیا آئی
تیرے خواب بھی سونے
میرے خواب بھی سونے
تیری میری شہرت سے
تیرے میرے غم دونے
تو بھی اک سلگتا بن
میں بھی اک سلگتا بن
تیری قبر تیرا فن
میری قبر میرا فن
اب تجھے میں کیا دوں گا
اب مجھے تو کیا دے گی

تیری میری غفلت کو
زندگی سزا دے گی
تیرے نام کی شہرت' تیرے کام کیا آئی

''تیرے نام کی شہرت'' پڑھ کر کاغذ تہ کرتی وہ دھیرے سے بڑبڑائی تھی۔ ''خیر تیرے نام کی ''شہرت'' نے میرا کام تو خوب تمام کیا ہے کہ نہ جی سکتی ہوں نہ مر سکتی ہوں۔ عجب عالم برزخ میں لا کھڑا کیا ہے مجھے۔''

تقریباً پندرہ دن بعد وہ اس کے روبرو تھا اور اس کے انداز اور تیور بہت قطعی قسم کے تھے۔

''یہاں کوئی ضروری سامان ہے تو اسے ہمراہ لے لو۔ فرنیچر وغیرہ فصیح بکوا دے گا۔ کل مالک مکان کو فلیٹ خالی کر کے دینا ہے۔''

''مگر کیوں؟'' وہ اس اچانک افتاد پر ہراساں ہوگئی۔

''ہماری بات طے ہو چکی ہے پہلے سے' کل چار تاریخ ہے اور اس سے یہی طے ہوا تھا۔ اب تم تیاری کر لو۔''

''مگر میں کہاں رہوں گی؟'' وہ نئے سرے سے بے سائبان ہونے پر دکھ سے ساکت سی رہ گئی تھی۔

''آپ ہمارے ساتھ چلیں گی۔''

''مگر کہاں؟'' وہ ہنوز بوکھلاہٹ کا شکار تھی۔

''پہلے ہم سعودی عرب جائیں گے وہاں اللہ اور اس کے رسولؐ کے گھر میں حاضری دیں گے اپنے کردہ و ناکردہ گناہوں کی معافی مانگیں گے۔ اپنی سیاہ اعمالیوں پر ندامت کے اشک نذر کریں گے پھر لندن میں مستقل رہائش پذیر ہو جائیں گے' وہاں پہلے سے گھر خریدا جا چکا ہے' سرمائے کی ہمیں کمی نہیں ہم وہاں کوئی چھوٹا موٹا بزنس اسٹارٹ کر لیں گے۔''

''اور یہاں؟'' وہ ہونق سی اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

''ہمارا ریزائن اب تک چیف منسٹر صاحب کی ٹیبل تک پہنچ چکا ہوگا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا' باز رکھ نہیں سکتے تو باز رہ تو سکتے ہیں۔ اپنی سیاہ اعمالیوں میں اضافہ کر کے ضمیر کا بوجھ بڑھانے سے دل کا سکون و قرار کہاں نصیب ہوتا ہے۔'' وہ بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔

''تو کیا ہم ملک چھوڑ جائیں گے ہمیشہ کے لیے۔'' اس کا دل ڈوبنے لگا۔ ''نہیں میں ایسا نہیں

چاہوں گی۔ فرار تو مسئلے کا حل نہیں ہوا کرتا۔''

''ہم فرار نہیں ہو رہے۔'' اس نے سر ہلا کر زور دے کر تصحیح کی۔ ''ہم عارضی طور پر منظر سے ہٹ رہے ہیں اور یہ قدم ہم نے تمہارے احساسات کو مدنظر رکھ کر اٹھایا ہے۔ وہاں ہمارے اور تمہارے بیچ کے بندھن کو کوئی تمسخر' طنز اور استہزاء سے نہیں دیکھے گا۔ کوئی تمہیں تمہارے ماضی کا حوالہ دے کر شرمسار نہیں کرے گا۔ وہاں ہم عام لوگوں کی طرح زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزار سکیں گے۔ نہ کوئی منسٹر کی بیوی ہونے کے ناتے تمہارے افعال و اعمال اور حرکات و سکنات پر نظر رکھے گا نہ تمہاری اور ہماری نجی لائف کو اسکینڈلائز کرنے کی نوبت آئے گی۔ کچھ عرصے تک ہم دونوں منظر سے دور رہیں گے تو خود بخود اس واقعہ کی شدت کم ہوتی جائے گی اور رفتہ رفتہ لوگوں کے ذہنوں سے یہ داستان فراموش ہو جائے گی۔ یاد رکھو زمانہ بڑا بھلکڑ ہوا کرتا ہے۔ اسے روز ایک تازہ داستان چاہیے ہوتی ہے۔ وہ کیا ہے کہ

ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

ہم اپنے بچوں کے ہمراہ واپس وطن لوٹیں گے تو ہم سے منسوب داستانوں کی بازگشت بھی سنائی نہیں دے گی اور یہ جو چند سال ہم باہر گزاریں گے' اس میں نہ صرف خود اچھی طرح سیٹ ہو جائیں گے بلکہ ہمارے بچوں کے ذہنوں پر بھی ہمارے ماضی کا کوئی عکس نہیں پڑے گا۔

جب ہم واپس لوٹیں گے تو تم دیکھنا ہر چہرا نارمل ہو کر ملے گا کسی آنکھ میں تمہارے لیے کوئی استہزا اور تشکیک نہیں ہوگی کہ زمانہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا بھولتا جاتا ہے' تب تک گزری داستانوں کے تمام نقوش مدہم پڑ چکے ہوں گے اور ہم بھی سیاسی و سماجی وابستگیوں سے چھٹکارا حاصل کر کے ایک عام شخص کی طرح خوش و خرم بھرپور زندگی گزارنے کے قابل ہو جائیں گے اور اب خدا کے واسطے کچھ اور نہ کہنا۔''

اس کے کچھ کہنے کو پھڑپھڑاتے لبوں پر بے ساختہ اس نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''ہماری بھیجی ہوئی نظم پڑھی تھی؟'' وہ مسکرا کر اس کا چہرہ جانچ رہا تھا۔ ''اس کا آخری بند کچھ مطابقت نہیں رکھتا۔ ہم تمہیں بہت کچھ دیں گے۔ اپنا سب کچھ۔ اپنا آپ تو بہت عرصہ ہوا اسی ویرانے میں ہم تمہارے سپرد کر چکے ہیں۔ ہاں تم ہمیں کیا دو گی۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کنجوس

تو ہمارے معاملے میں تم سدا سے رہی ہو۔" وہ شرارت سے اسے چھیڑ رہا تھا۔

"اچھا یہ ٹکٹ سنبھالو۔ ہماری کل صبح کی فلائٹ ہے اور اب فوراً سے پیشتر چلو۔ ادھر پرل کانٹیننٹل ہوٹل کے ایک کمرے میں فصیح قاضی اور گواہوں کو دولہا دلہن کی اتنی طویل غیر حاضری کی جانے کون سی وجوہات کے طومار باندھ رہا ہوگا۔"

توبہ کس قدر جلدی مچا رہا تھا یہ شخص۔

"نکاح کا فریضہ ہم اسی سرزمین پر انجام دے کر جائیں گے' البتہ شب عروسی اور ہنی مون منانے کے مراحل یورپ جا کر طے کیے جائیں گے۔" اس نے اس کا سنہری گداز ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے کر ایک بھرپور گہری بولتی نگاہ اس پر ڈالی۔

"ویسے دل تو چاہتا ہے یہ مراحل اسی ویرانے میں جا کر طے کیے جائیں جہاں تمہاری موجودگی نے گل و گلزار کھلا دیے تھے۔" نگاہ' لہجے اور لمس تینوں پرشوق جذبات میں گندھے ہوئے تھے۔ حیا سے اس کی حالت غیر ہوگئی۔ اس کے نصیب کی صبح بالآخر طلوع ہوگئی تھی۔

٭٭٭

میں نے شام ہاری ہے

"**اوکے** ڈیڈی! پھر میں اور راحیلہ جا رہے ہیں گیٹ بند کر لیجیے گا۔" ثمین عجلت میں چابی گھماتی ہوئی باہر نکلی تھی۔

"ایک منٹ ٹھہرنا ثمین! یہ لسٹ لیتی جاؤ واپسی میں جنرل اسٹور سے کچھ چیزیں لیتی آنا۔ اب میں کہاں جاؤں گا۔" ڈیڈی نے سستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا کام بھی اس کے ذمے لگا دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ ہماری واپسی آٹھ ساڑھے آٹھ تک ہوگی۔"

"رات کے کھانے تک پہنچ جاؤ گی؟ انتظار کریں تم لوگوں کا؟" یمنیٰ نے اپنی نک سک سے تیار' اسمارٹ خوش رو اور پراعتماد لڑکیوں پر ایک نگاہِ فاخرانہ ڈال کر بہت محبت سے دریافت کیا تھا۔

"نہیں بالکل بھی نہیں۔ آپ لوگ کھانا ضرور کھا لیجئے گا۔ بغیر انتظار کیے۔" راحیلہ نے جھٹ پیش بندی کے طور پر کہہ دیا تھا۔ مبادا ماں باپ ان کے انتظار میں بھوکے بیٹھے رہیں۔

"شیخ صاحب! آپ کا بچوں کو پالنے کا طریقہ مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ آپ لوگوں نے اپنی اولاد کو بالکل بے لگام چھوڑا ہوا ہے۔ اوپر سے الگ گاڑی دے کر ڈرائیونگ سکھا دی کہ جہاں ان کا دل چاہے

آزادانہ منہ اٹھائے چل پڑیں۔''

ثمین کے گاڑی نکال کر لے جانے کے بعد جب شیخ صاحب گیٹ بند کر کے دوبارہ ابراہیم صاحب کے پاس اپنی نشست پر بیٹھے تو بڑی دیر سے ماحول کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ابراہیم صاحب کی تنگ نظری اور محدود سوچ اظہار کا روپ دھارے بغیر نہ رہ سکی۔

''ایسی بات نہیں ہے بھائی صاحب! ہمارے بچے کسی غلط جگہ نہیں جا سکتے۔ ہمیں اپنے بچوں پر پورا پورا اعتماد ہے۔''

یمنیٰ کو اپنے بہنوئی کا انداز فکر بہت کھلا مگر مصلحت کوشی کے پیش نظر دل کے جذبات چھپا کر خاصی نرمی سے ان کی بات کے جواب میں رد عمل کا اظہار کیا۔

ابراہیم صاحب کی پیشانی پر شکنوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ وہ بولے تو ان کا لہجہ حد درجے استہزائیہ اور کٹیلا تھا۔

''آج کل کے ماں باپ بھی عجب طرح کے ماڈرن ازم کا شکار ہو گئے ہیں۔ فیشن زدہ طبقے کی فہرست میں اپنا نام لکھوانے کی دھن میں سب ادب آداب قاعدے قانون اور اخلاق واصول فراموش کر دیتے ہیں۔ بچوں کو سر چڑھا کر بے جا آزادی دے کر انہیں بدتمیز خود سر اور منہ پھٹ بنا کر پیش کرنا گویا ان کی مجبوری بن گیا ہے۔ آخر تہذیب حاضر کے داعی جو ٹھہرے۔''

''معاف کیجئے گا بھائی صاحب۔ آپ کی سوچ سراسر تعصب اور کوتاہ نظری پر مشتمل ہے۔ نہ تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے طبقاتی خانوں کا کمپلیکس ہے اور نہ اپنی اولاد کو اس جنون میں مبتلا دیکھنے کا شوق ر[ہا] ہے۔''

شیخ صاحب کو اپنے لہجے کی تلخی چھپانے میں بہت دشواری ہو رہی تھی۔ بیگم کے بہنوئی ہونے کے ناتے وہ ابراہیم صاحب کی ہرزہ سرائی برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

''اپنی اولاد پر نظر رکھنی چاہیے۔ آج کل آگ لگی ہوئی ہے زمانے کو شیخ صاحب۔'' ابراہیم صاحب کا انداز ناصحانہ پن لیے ہوئے تھا۔ ''پھر لڑکی ذات کو تو بالکل بھی ڈھیل نہیں دینی چاہیے۔ ذرا کھلی ہ[وا] نہیں ملی تو فوراً سے پیشتر پر پرزے نکال کر اماں باوا کی عزت سر بازار خاک میں ملانے کا باعث نہیں بن[تی]۔ بڑی کچی مخلوق ہے۔ میٹھی باتوں اور سنہری بہلاووں میں آ جانے والی۔ بھلا اس کو اعتبار کی زنجیر سے کیسے باندھا جا سکتا ہے۔ بہت ناقابل اعتبار شے ہوتی ہے عورت' کڑے پہروں میں نہ رہے تو چوک م[یں] عزتیں نیلام ہو جائیں۔''

شیخ صاحب خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئے۔ ظاہر ہے مہمان تھے۔ گھر آئے ہوئے تھے۔ بیگم کے رشتے دار تھے' وہ مصلحتاً ان کی بات کا منہ توڑ جواب دینے سے احتراز کر گئے۔ تاہم اتنا ضرور کہا۔

''ابراہیم صاحب۔ اولاد کھلونا نہیں ہوتی تجربہ گاہ میں رکھا کیمیکل نہیں ہے جس پر فارمولا اپلائی کر کے اس کو مختلف انداز میں اپنی پسند کے مرکب میں تبدیل کیا جا سکے۔'' وہ لہجے کو تلخ ہونے سے نہ بچا سکے۔

''یہ تو آسمانی تحفہ ہوتی ہے۔ گھر کی رونق' دل کا چین' روح کی خوشی۔ بھلا آنگن کی خوشبو بند مٹھیوں میں مقید کی جا سکتی ہے؟''

''آپ نے جانے کن ہواؤں میں رہتے ہیں۔'' ابراہیم صاحب نے ہاتھ ہلا کر بیزاری اور طنز سے اپنے ہم زلف کو دیکھا۔ ''میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ کھلاؤ سونے کا نوالہ مگر دیکھو شیر کی نظر سے۔''

''حالانکہ یہ سراسر خلاف فطرت قانون ہے۔ قطعی اور ناقابل برداشت۔ میں تو اس محاورے کو ایک ظالمانہ روش سے تعبیر کرتا ہوں۔ آپ بے شک اولاد کو روکھی سوکھی کھلائیں مگر اس کے دل ذہن کو مطمئن روشن اور ان کی روحوں کو محبت کی روشنی سے بھرپور رکھیں۔ بظاہر سجا بنا کے چاندی کے پنجرے میں سونے کی غذا کھانے والوں کے دل مردہ ہوں تو تن کی آرائش سے کیا حاصل۔ جس سکھ کو رگ جاں محسوس نہ کر سکے وہ سکھ کہاں رہتا ہے بلکہ جی کا آزار بن جاتا ہے۔ دل خوش ہو تو زندگی کا روکھا پھیکا روپ بھی سہانا لگتا ہے۔ روح تشنہ ہو تو جام و مینا میں بھی کشش نہیں رہتی۔''

''کس بحث میں الجھ گئے بھائی صاحب! آیئے باہر بیٹھتے ہیں لان میں۔'' ابراہیم صاحب کی بیگم شائستہ اپنے شوہر کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں سے گھبرا کر بہنوئی سے ملتجی ہو کر بات پلٹتے ہوئے بول پڑیں۔

''ہاں بھئی۔ آپ بھی عجیب ہیں شیخ صاحب! بات کو لے کر ہی بیٹھ جاتے ہیں۔'' یمنیٰ نے بھی اپنی بہن کے چہرے کی گھبراہٹ اور بہنوئی کی پیشانی کی شکنوں سے بات کی سنگینی کا اندازہ لگا کر شیخ صاحب کو خفگی سے ٹوکا۔ ''دیکھیں تو۔ مالی گلابوں کی کیاری کی گوڈی کر رہا ہے۔ اس کے پاس کھڑے رہیں۔ اناڑی زمانے بھر کا ہے۔ میں نے سیاہ گلابوں کے اتنے نایاب پودے منگوائے ہیں۔ کہیں ناس نہ مار ڈالے ان کا۔''

''اچھا جناب۔'' شیخ صاحب بلا چون و چرا اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''آیئے ابراہیم صاحب لان میں بیٹھتے ہیں۔'' وہ خوش دلی سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ جو شیخ صاحب کی جی حضوری پر طنزیہ نظروں سے

انہیں دیکھ رہے تھے۔

ابراہیم صاحب عورت اور اولاد کو جوتی کی نوک پر رکھنے والوں میں سے تھے۔ کسی کو ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ ان کے خیال میں گھر کا سربراہ گھر کے ہر معاملے میں فیصلہ کرنے کا مکمل طور پر مجاز ہوتا ہے اور بیوی اور بچے اس کی رضا و خوشی کے خلاف سانس بھی نہیں لے سکتے تھے۔

''جی نہیں۔ میں اب نہاؤں گا۔'' وہ چڑ کر بولے پھر کرختگی سے بیوی سے مخاطب ہوئے۔

''شائستہ میرے کپڑے نکال کر استری کرو جلدی سے۔'' ان کا لہجہ کھردرا اور تحکمانہ تھا۔ یوں جیسے بیوی کو نہیں ملازمہ کو حکم دیا ہو۔ شائستہ سر جھکا کر تعمیل کے لیے کمرے میں چلی گئیں۔ وہ ان خواتین میں سے تھیں جو ہر معاملے میں شوہر کی جنبش ابرو کی منتظر رہتی ہیں۔ ان کا مرد مکمل طور پر ان پر حاوی تھا۔ نہ صرف بیوی پر بلکہ بچوں پر بھی مکمل کنٹرول رکھتا تھا۔ خاص طور پر بڑے بیٹے حارث اور اس سے ڈیڑھ سال چھوٹی گلناز کی تو ایک ایک سانس پر نظر رہتی تھی۔ حالانکہ بیٹا اب سولہویں برس میں تھا مگر باپ کے جابر اور درشت رویوں کی بدولت ذہنی اعتبار سے بہت ناپختہ تھا۔ باپ کو دیکھتے ہی قدموں سے جان نکلنے لگتی اور ایک چنگھاڑ پر پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ ابراہیم صاحب کا جب دل چاہتا حارث کو دھنک کے رکھ دیتے۔ ایک دو سال پہلے تک تو گلناز بھی ان کے جسمانی تشدد کی زد میں رہی تھی مگر اب جب سے وہ بڑی ہوئی تھی۔ ان کا ہاتھ کچھ جھجکنے لگا۔ البتہ تھپڑ اور لہجے کی فرعونی سختی اپنی جگہ برقرار تھی۔

وہ لوگ اپنی خالہ کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ یمنٰی کی ساس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ عیادت کے لیے سارا خاندان آیا۔ مجبوراً ابراہیم صاحب کو بھی پنڈی آنا پڑا۔ مگر وہ اپنے اطوار اسلام آباد نہیں رکھ کے آ سکتے تھے۔ سو وہ برقرار تھے۔

بات بے بات بیوی کی سب کے سامنے تذلیل اولاد پر ہاتھ اٹھانا اور ذرا سی بات پر جھاڑ کے رکھ دینا۔ اپنے رعب میں رکھنے کے چکروں میں ان کے جذبات و احساسات اور عزت نفس کو مسل کے رکھ دینا گویا وہ اپنا اولین ترفریضہ اور حق سمجھتے تھے۔

کہنے کو وہ پی ایچ ڈی کیے ہوئے تھے مگر انسانی جذبات کی الف سے بھی واقف نہیں تھے۔ ان کے نزدیک عورت ایک ناقص العقل اور کم تر مخلوق تھی جس کا واحد کام مرد کی تابعداری اور دلداری ہوتا ہے۔ اور مرد عورت کو جس حال میں رکھے عورت کو اس کا سپاس گزار ہونا چاہیے۔

اور یہ ابراہیم صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں موم کی ناک جیسی خصوصیات رکھنے والی عورت ملی

تھی۔

حد درجہ صابر، قانع اور پردہ پوشی کے ہنر سے آشنا۔

ابراہیم صاحب کی زبان تو جو شعلے اگلتی تھی ان کے ہاتھوں کی جارحیت اور تشدد کے باعث شادی کے ان سترہ سالوں میں کتنی ہی بار شائستہ موت کی دہلیز چھو آئی تھیں۔ خاندان بھر میں ابراہیم صاحب کی فرعون صفتی اور سنگدلی کے چرچے تھے۔

مگر وہ شوہر پرست عورت لب سیے رکھتی اولاد کو بھی باپ کی تعظیم و تعمیل کا درس گھول کے پلاتی رہتی تھی۔ گلناز سے تین سال چھوٹی زرگل تھی اور اس سے تقریباً ساڑھے نو سال بعد ماہ گل اور احمد جڑواں پیدا ہوئے تھے جو ابھی بہت چھوٹے تھے۔ ویسے تو سب بچوں میں صبر و ضبط کا مادہ موجود تھا مگر زرگل سب سے زیادہ حساس، کم گو اور زیرک تھی۔ وہ کم عمری سے ہی گھر کے جیل نما ماحول سے مانوس ہو چکی تھی۔ گلناز کے ضبط کا پیمانہ البتہ کبھی کبھار چھلک اٹھتا تھا۔

''ثمین آپی! میں اندر آ جاؤں۔'' حارث کے جھجکتے ہوئے انداز پر اپنے کمرے کی وارڈ روب بند کرتے ہوئے ثمین نے پلٹ کر دلچسپی سے دیکھا۔

''ہاں۔ ہاں۔ ضرور۔'' اس نے بخوشی اسے اندر آنے کی دعوت دے دی۔ اس کے لہجے میں نرمی اور محبت کے زیر اثر حارث اس کے کمرے میں آ گیا اور کچھ ہچکچا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''دراصل مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ یونہی پانی پینے کی غرض سے باہر نکلا تو راہداری سے گزرتے ہوئے آپ کے کمرے کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ اس لیے میں ادھر آ گیا۔ کہیں آپ کا سونے کا موڈ تو نہیں ؟''

''ارے نہیں بھئی۔ ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں۔ میں ایک بجے سے پہلے کبھی نہیں سوتی اور ویسے بھی گرمیوں میں تو گیارہ بجے تک لوگ باہر واک کر رہے ہوتے ہیں۔ تم نے بہت اچھا کیا جو ادھر آ گئے۔ میں بھی بور ہو رہی تھی۔ مل کے گپ شپ لگاتے ہیں۔ تم لوگ شاید جلدی سونے کے عادی ہو۔ ورنہ میرا تو بہت دل چاہتا ہے اس ٹائم سب مل کر کوئی گیم کھیلیں یا باتیں کریں۔''

وہ بہت عام سے انداز میں کہہ رہی تھی مسکرا کر اسے دیکھتی ہوئی۔

''ہمارے گھر میں دس بجے کے بعد سب کو اپنے اپنے کمروں جا کر آرام کرنے کا حکم مل جاتا ہے۔ ابو جی کو رات کو دیر تک جاگنا سخت ناپسند ہے۔'' حارث کے لہجے میں عجیب سی اکتاہٹ تھی۔ ثمین ایک لمحے

کو چپ سی رہ گئی۔۔اپنے سخت گیر اور جابر خالو کی شخصیت سے بخوبی واقف تھی۔

''اچھا چلو خیر۔فی الحال تو تم لوگ مہمان ہو۔ ہمارے یہاں تو یہ قوانین لاگو نہیں ہوتے۔آؤ کارڈز کھیلتے ہیں۔شوق رکھتے ہو نا؟''

''جی۔'' حارث کا چہرا مسرت سے گلنار ہو گیا۔

ذرا دیر بعد وہ دونوں بہت جوش اور انہماک سے کارڈز کھیلتے ہوئے زمانے بھر کی بے سروپا باتوں پر بحث کررہے تھے۔ ہنس کھیل رہے تھے لطف اندوز ہو رہے تھے۔کارڈز بیڈ پر پھیلائے بیڈ کے ایک سرے پر حارث تھا اور دوسری طرف ثمین بیٹھی ہوئی تھی۔

پھر جیسے ایک برق کوندی تھی۔کوئی خوفناک طوفان اٹھا تھا۔

''تم یہاں کیا کررہے ہو آدھی رات کو؟'' ابراہیم صاحب نے دبے لہجے میں غرّا کر اس کا دایاں کان اپنی کرخت انگلیوں میں دبوچا تھا۔ان کی قہر برساتی نظروں سے وہ سکتے کے عالم میں بیٹھا رہ گیا۔

''وہ۔ وہ ابو جی۔'' وہ تھر تھر کانپتے ہوئے حواس باختہ ہو کر انہیں دیکھ رہا تھا۔

''چلو ذرا کمرے میں۔تمہاری تو میں اچھی طرح خبر لیتا ہوں۔'' انہوں نے دانت پیس کر ایک زور دار تھپڑ اسے رسید کیا۔

''خالو جان۔ پلیز۔'' حیران پریشان کھڑی ثمین تڑپ کر حارث کی سمت بڑھی تھی۔ وہ ان کی غضب ناک کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔ بھلا جوان لڑکے پہ اس طرح کسی کے سامنے ہاتھ اٹھانا اور اس کی عزت نفس مجروح کرنا کہاں کی انسانیت تھی۔

''ہم لوگ یونہی وقت گزاری کے لیے کارڈز کھیل رہے تھے۔ نیند نہیں آرہی تھی۔اور حارث کو میں نے خود روکا تھا' وہ تو سونے جارہا تھا۔'' وہ یہی سمجھی تھی کہ حارث کو اس وقت جاگتے پا کر آگ بگولہ ہو رہے ہیں۔

''بی بی! تم اپنے کام سے کام رکھو تو مہربانی ہوگی۔'' ان کی سرد نظروں نے ایک لحظہ کو ثمین کو ٹھٹھکا کر رکھ دیا۔کس قدر غیریت بھرا اجنبی لب ولہجہ تھا۔

وہ اسی طرح بیٹے کو پکڑے ہوئے قدم بڑھانے لگے۔ساتھ میں باز پرس جاری تھی۔

''آدھی رات کو لڑکی کے کمرے میں اس کے بستر پر بیٹھے کیا کر رہے تھے۔۔بے شرم۔ بے غیرت۔ کیا سمجھتے تھے میری نظروں میں دھول جھونک کے رنگ رلیاں منا لوگے۔ پاگل سمجھا ہوا ہے باپ کو مجھے تو تم لوگوں کی رگ رگ کی خبر رہتی ہے۔''

اور حارث کے ساتھ ساتھ ثمین کو بھی یہی محسوس ہوا جیسے زمین اپنے مدار سے ہٹ گئی ہو۔ وہ دونوں کانوں پر ہاتھ رکھے شدید رنج سے زمین پر بیٹھ گئی وہ حارث سے کم از کم دس بارہ سال بڑی تھی پھر وہ تو ابھی نوخیز لڑکا تھا۔ چودھویں برس میں تھا۔انجان۔ناواقف' معصوم اور سادہ ذہن کا مالک۔

حارث تو جیسے زمین میں گڑا جارہا تھا۔ اگلے دو دن تک وہ ثمین کے سامنے نہیں آیا کہ اس سے نظر ملانے کے قابل چھوڑا کب تھا باپ نے۔

تیسرے دن ثمین سے دو سال چھوٹا احمر اچانک بنا کسی اطلاع کے امریکہ سے گھر آن پہنچا۔

وہ امریکہ میں زیر تعلیم تھا۔ اونچے لمبے' باتونی شوخ اور خوش مزاج سے خوبصورت نوجوان کو دیکھتے ہی ابراہیم صاحب کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں کھنچ گئی تھیں۔انہوں نے گلناز کو بلا کر سختی سے حکم سنا دیا۔

''خبردار جو کمرے سے باہر۔لڑکے کے آس پاس نظر آئیں مجھے۔''

وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے فلمی ہیرو کی طرح اسمارٹ اور دلکش پرسنالٹی والے شریر سے کزن سے مل کر آرہی تھی۔ دل میں مسرت اور ہیجان کی نامانوس لہریں اٹھ رہی تھیں۔ زندگی بہار کے جھونکے کی مانند لطیف تر محسوس ہو رہی تھی۔ مگر باپ شاید اس سے پہلے اس کے بنجر و ویران دل میں کھلتے خوابوں کے گلستان سے واقف ہو گیا تھا۔

وہ حد درجے سہم گئی۔ دل میں باپ کی دہشت ایسی بیٹھی کہ ثمین کے ہزار اصرار کے باوجود رات کو کھانے کی ٹیبل پر نہیں آئی تھی۔

اور اگلے دن ابراہیم صاحب نے کوچ کا حکم سنا دیا۔

''بھائی صاحب! ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی ایک ہفتہ ہی تو ہوا ہے۔'' یمنیٰ بیگم نے بصد التجا انہیں روکنا چاہا تھا۔

''بہت رہ لیا۔اب اپنے گھر کو بھی دیکھنا ہے۔'' انہوں نے کھردرے خشک لب و لہجے میں جواب دیا۔ پیشانی پر ہمہ وقت براجمان رہنے والی ناگواری کی شکنیں ہنوز جگمگا رہی تھیں۔ انہوں نے مروتاً بھی اخلاق برتنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

بہنوئی کے اکل کھرے انداز پر یمنیٰ بھی چپکی رہ گئیں۔اب اور کہتیں بھی کیا۔ حالانکہ جانتی تھی شائستہ کا بہت دل چاہ رہا ہو گا مزید رہنے کو مگر شوہر کے موڈ کے پیش نظر وہ بلا چون و چرا سامان باندھنے لگیں۔

ابھی کل رات ہی تو فیصلہ سناتے ہوئے شوہر صاحب نے فرمایا تھا۔

''بیگم! تمہاری بہن کے جوان بیٹے کی آمد سے مجھے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہماری جوان بیٹی ہے۔آج

کل کی نسل میں تو یوں بھی شرم وحیا نہیں رہی وہ لڑکا باہر سے پڑھ کے آیا ہے۔ نہ آنکھ میں لحاظ ہے نہ چہرے پر شرافت۔ مجھے تو کل پوری رات نیند نہیں آئی۔ بار بار گلناز کے کمرے کے آگے ٹہلتا رہا ہوں۔ بس بہت ہو لی۔ کل سامان باندھ لو۔ پھر اپنے صاحبزادے کے کرتوت تو دیکھ ہی چکی ہو۔ ٹین سے پینگیں بڑھا رہا ہے۔ سخت بدلحاظ اولاد ہے تمہاری طرح تمہاری ادائیں اور بازاری پن آج تک نہیں گیا۔ اولاد کو بھی اسی رستے پر چلانا چاہتی ہو کیا؟''

اور وہ پتھر کی مورت بنی حسب معمول چپ چاپ سنتی رہیں سر جھکائے' لب سیے سب الزام سن لیے۔ شدت سے احتجاج کرتا دل البتہ رو رو کر کہہ رہا تھا۔

''ابراہیم صاحب! کبھی تو شک اور بدگمانی کی بھیانک عینک اُتار کر دنیا کو دیکھیں۔ جو کچھ آپ سوچتے رہتے ہیں' محض آپ کے اپنے ذہن کی اختراع ہے۔ اور چونکہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو کبھی زندگی میں اپنی غلطی ماننے کا فعل سرانجام نہیں دیتے۔ اس لیے جس آنکھ سے دنیا کو دیکھتے ہیں اسی کو درست قرار دے کر سب کو اسی آنکھ سے زندگی دکھانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے خود بھی عذاب میں رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی عذاب میں رکھتے ہیں۔ ورنہ یمنی کی اولاد تو ایسی ہے کہ لوگ آرزو کیا کرتے ہیں۔ کامیاب' پُراعتماد' زندہ دل اور محبت بھرے جذبات رکھنے والی۔ کبھی اپنی اولاد کی طرف نگاہ کریں۔ انہیں کیا دیا ہے آپ نے۔ خوف' بداعتمادی' بے اعتباری' سراسیمگی' دہشت مایوسی' ناکامی' بے چارگی۔

شائستہ کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ مگر لبوں پر حسب معمول ضبط کے کڑے پہرے تھے۔

اب تو عادت سی ہو گئی تھی۔ اپنے دل کو مار کر اپنی انا کو کچل کے' اپنی خودداری کو تیاگ کر شوہر کی منت و خوشامد اور جی حضوری کرنے کی۔

وقت' کچھ اور آگے بڑھتا گیا۔

مگر ابراہیم صاحب کے رویوں کی سرد و سنگلاخ چٹان کو نہیں پگھلنا تھا سو نہ پگھلی۔ وہی سخت گیر انداز' وہی خون خشک کر ڈالنے والے جارحانہ تفتیشی تیور' وہی کڑک دار لہجہ اور وہی۔ جذبات کے لمس سے عاری سپاٹ چہرہ۔

گھر میں فون تھا مگر ماسوائے ابراہیم صاحب کے کوئی اس سے فائدہ اٹھانے کا مجاز نہ تھا۔ فون تالے میں بند رہتا تھا۔ اول تو بچوں کے کلاس فیلوز میں سے ابراہیم صاحب کے تفتیشی اور کرخت انداز سے کترا کر کوئی فون نہیں کرتا تھا اور بالفرض کوئی کر بھی لیتا تو لمبی چوڑی وضاحتوں کے بعد فون کرنے اور

فون سننے والے کو یہ سہولت حاصل ہوتی مگر اس طرح کہ ابراہیم صاحب ایکس ٹینشن کے ذریعے اپنی بیٹی یا بیٹے کا پورا فون سنتے تھے کہ کہیں ان کی اولاد غلط قسم کی دوستیاں تو نہیں کر رہی۔

بچوں کو دوستوں یا کلاس فیلوز کے ہاں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اور جو بھولے بھٹکے کوئی آ جاتا تو کسی نہ کسی بہانے سے وہ سر پر سوار رہتے۔ اگر گلناز یا زرگل کی دوست ہوتی تو شائستہ کو پاس بیٹھ کر باتیں سننے اور دھیان رکھنے کا آرڈر دیتے تھے۔ کبھی بلا جواز ڈرائنگ روم میں آ کر حارث کو اس کے دوست کے سامنے کسی بے محل بات پر ڈانٹ کر رکھ دیتے۔

جانے دوسروں کی عزت نفس تباہ کرنے میں انہیں کیا لطف آتا تھا۔ کون سی حس کی تسکین ہوتی تھی۔ یقیناً پس پردہ وہ احساس کمتری کا جذبہ کارفرما تھا جسے دبانے کے لیے وہ اپنے آپ کو برتر اور حاکم مختار سمجھ بیٹھے تھے اور اس کے عملی ثبوت کے طور پر اپنی بیوی اور اولاد کو اپنے قدموں میں جھکانے کے خواہش مند رہتے تھے۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اپنے گھر کو زچ رکھتے تھے۔ شائستہ شادی سے پہلے بہت سوشل قسم کی زندہ دل اور ہمدرد دل رکھنے والی خاتون ہوا کرتی تھیں۔ میل ملاپ بڑھانا اور محلے داروں کی خبر گیری رکھنا جیسے خود پر فرض سمجھا کرتی تھیں۔ مگر ابراہیم صاحب کی زوجیت میں آ کر ان کے حکم کی تعمیل میں ان کے جذبات کا گلا گھونٹنا ہی پڑا۔ اب یہ عالم تھا کہ پاس پڑوس تو کجا اپنے عزیز رشتے داروں کی خوشی غمی میں شریک ہونے تک کی نوبت نہیں آتی تھی کہ ابراہیم صاحب ساری دنیا سے کٹ کر صرف اپنے گھر کی سلطنت تک محدود رہنا اور رکھنا پسند کرتے تھے۔

بچوں کا بچپن خوف' پریشانی اور اعتماد و مسرت سے یکسر محروم فضا میں بسر ہوا۔ لڑکپن حسرت اور ناآسودگی کی نذر ہوا۔ گلناز حارث اور زرگل اپنے اپنے جذبات ایک دوسرے سے کہہ سن کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے۔ حارث بڑے جوش سے کہتا تھا۔

''دیکھنا جب بڑا ہو کر گھر بساؤں گا تو بہت خوشگوار ماحول دوں گا گھر والوں کو۔ جہاں اپنی مرضی سے اٹھنے بیٹھنے' کھانے پینے' سونے جاگنے اور آنے جانے کی مکمل آزادی ہو۔ ابو جی کی طرح گھر کو سینٹرل جیل ہرگز نہیں بناؤں گا جہاں سکون اور خوشی کا سانس لینے کو ترستے رہ جاتے ہیں۔'' اس کے خیالات بہت روشن تھے۔

ابراہیم صاحب کے خیال کے مطابق لڑکی لڑکے کو بیس سال کی عمر سے پہلے پہلے بیاہ دینا بہت ضروری تھا۔ وگرنہ اولاد بقول ان کے خدانخواستہ والدین کے نام پر بٹہ بھی لگا سکتی ہے۔ آج کل کے نوجوانوں کا کیا بھروسہ۔ سو جیسے ہی گلناز نے اٹھارہ کے سن میں قدم رکھا ان کی راتوں کی نیندیں حرام

ہونے لگیں۔ طرح طرح کے اوہام کا شکار ہوگئے۔ جنہیں بتا بتا کر بیوی کا دل بھی ہولاتے رہتے۔ چونکہ ان کے پاس پڑوس اور عزیز رشتے داروں سے تعلقات ناروا کھنچے کھنچے رہے تھے اس لیے کوئی بھی ان کی طبیعت کے پیشِ نظر گلناز کے لیے رشتے کی بات لے کر نہیں آیا۔ ابراہیم صاحب نے خود سے بھی دو چار رشتے دیکھے مگر کوئی ڈھنگ کا نہیں مل رہا تھا۔ سب ان کے گھر کے جابر و قاہر ماحول سے خائف تھے۔

بالآخر جب گلناز نے بیسویں برس میں قدم رکھا تو ابراہیم صاحب صحیح معنوں میں ہوش میں آ گئے۔ ہوش ٹھکانے لگے تو دبے لہجے میں ایک روز بیوی سے کہنے لگے۔

''وہ تم نے بہت پہلے کسی سے سرسری سی بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ یمنیٰ اور تمہارا ارادہ ہے آپس میں رشتے داری بڑھانے کا۔'' ان کا اشارہ احمر کی طرف تھا۔

''وہ تو بہت پہلے کی بات تھی۔'' شائستہ آزردگی میں گھرنے لگیں۔

''مگر اب بھی تو بات بڑھائی جا سکتی ہے۔''

وہ عادت سے مجبور ہو کر تنک گئے۔ ماتھے پر تیوریاں گہری ہونے لگی تھیں۔

''اب کا میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔'' شائستہ دامن بچا گئیں۔

''تم کسی کے ذریعے کہلواؤ اس کو۔'' ابراہیم صاحب تحکمانہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ شائستہ کا دل جل کر خاک ہونے لگا۔

بھلا ایسا کون سا پردہ تھا۔ بھی خاندان والے ابراہیم صاحب سے واقف تھے۔ ظاہر ہے شادی صرف لڑکی سے تو نہیں کی جاتی۔ پورے خاندانی سسٹم کو دیکھا بھالا جاتا ہے۔ ابراہیم صاحب کے مزاج اور طرزِ تربیت سے بھی توبہ تلا کرتے دامن بچا جاتے تھے۔ پھر ان کی حاکمانہ اور درشت طبیعت کی وجہ سے بچوں کو کزنز وغیرہ سے گھلنے ملنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ کوئی مردانہ کزن آتا تو گلناز اور زرگل گویا نظر بند کر دی جاتی تھیں۔ ابھی پچھلے دنوں احمر دو دن کے لیے کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد آیا تھا اور شائستہ کے انتہائی اصرار پر ان کے ہاں ٹھہرا تھا۔ ابراہیم صاحب کے نظریں تھانیدار کے مخصوص جذبات کا روپ دھارنے لگی تھیں۔ ہر لحظہ لڑکیوں کی نگرانی' ماہ گل' احمد اور حارث کو بلاوجہ احمر کے سامنے جھاڑ کے رکھ دیتے تھے۔ گھڑی گھڑی گلناز اور زرگل کے کمرے کے گرد چکر لگاتے رہتے۔ احمر سے حارث اور احمد کو بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ بقول ان کے امریکہ پلٹ آزاد روش امیر زادہ' لڑکوں کے ذہن پراگندہ کر سکتا تھا۔ احمر رخصت ہوا تو گھر والوں کی جان میں جان آئی اور اس جبری نظر بندی سے نجات ملی۔

حارث جوں جوں جوانی کی سرحدیں چھوتا ہوا آگہی حاصل کر رہا تھا اس کے دل میں باپ کے غیر انی طرزِ عمل کے خلاف شدت سے مزاحمت ابھرنے لگی تھی۔ اب وہ کبھی کبھی جواب دے ڈالتا۔ راہیم صاحب غضب کا آسمان چھوتے ہوئے شائستہ پر چڑھائی کر دیتے تھے۔ پھر بکتے جھکتے جونہی گھر ے باہر نکلتے' حارث اپنا غصہ نکالنے کو تن فن کرنے لگتا۔ انتقاماً وہ زیادہ تر وقت باہر گزارنے لگا۔ ایسے کوں سے زیادہ بننے لگی جو جارحانہ اور جوشیلے طور طریقوں کے مالک تھے۔ حارث کے اندر مچلتی بچپن کی ردمیاں' بے بسی اور احساسِ ذلت منفی روش پہ چلنے سے تسکین پانے لگیں۔ اکثر وہ گلناز اور زرگل اپنے ل کی بھڑاس نکالنے کو اکٹھے بیٹھ کے اپنے اپنے دکھ روتے۔ زرگل بولنے سے زیادہ سننے پہ زور دیتی۔ ں بھی اس نے اپنے دل کو ہر طرح کے جذبات سے عاری بنا کر ساری توجہ پڑھائی کی سمت مبذول کر لی تھی۔ وہ میٹرک کے امتحانات کی تیاری کر رہی تھی۔

''وہ زرگل اپنی دوست کے ہاں جانے کی اجازت مانگ رہی ہے۔ پچھلی گلی میں رہتی ہے۔''

ایک شام شائستہ شوہر کی عدالت میں سراسیمہ سی درخواست پیش کر رہی تھیں۔ جسے سنتے ہی ابراہیم صاحب کی تیوریاں خونخوار ہوگئیں۔ اور چہرے پر غیض کی سرخی لہرانے لگی۔

''کیا کرنا ہے وہاں اس کو۔ اور یہ دوستیاں کب سے پال لیں اس نے۔'' ان کا لہجہ کڑک دار تھا۔

''دوست کہاں کلاس فیلو ہے۔ اس سے بہت ضروری نوٹس لینے ہیں۔'' وہ لجاجت سے بیٹی کی وکالت کرنے لگیں۔ مگر ان کے شک کا کیا علاج۔

''یوں آدھی رات کو منہ اٹھا کے جانے کی کیا تک بنتی ہے۔ دن کو نہیں یاد تھا اسے؟''

وہ خوامخواہ برافروختہ ہونے لگے۔ عادت کے مطابق۔ حالانکہ ابھی شام کے پانچ بجے تھے۔ اور مغرب ہونے میں بھی کچھ وقت باقی تھا۔

''صبح پتا کروایا تھا۔ وہ بچی گھر پر نہیں تھی۔''

''کل منگوا لینا۔'' انہوں نے سرد مہری سے ہاتھ ہلایا۔

''پرسوں پیپر ہے اس کا۔ اس کو ضروری چاہئیں۔'' شائستہ کو بیٹی کا مستقبل عزیز تھا سو ہمت کر کے بات آگے بڑھانے لگیں۔

''ہونہہ۔ ایک تو ان کی پڑھائیاں جان کو آ گئی ہیں۔ سارے زمانے سے انوکھی ہیں ناں جیسے۔'' وہ بیزار ہو کر بڑبڑانے لگے۔ ''سب سمجھتا ہوں میں کم بختو کا گھر میں دل نہیں لگتا۔ باہر جانے کی لگی رہتی ہے۔ کون کون ہوتا ہے اس لڑکی کے گھر میں؟''

اب تفتیش نیا رخ اختیار کر گئی تھی اور باہر دروازے سے لگی زرگل کی آنکھوں میں بے بسی کا پانی بھرنے لگا۔ اف اللہ زندگی گزارنا بھی تو کس قدر دشوار ہے یہاں۔

”ظاہر ہے اس کے ماں باپ بہن بھائی ہوتے ہوں گے۔“ شائستہ شوہر کی حد درجہ شکی اور بدگمان فطرت سے عاجز سی آ گئی تھیں۔

”کس کے ساتھ جائے گی وہ؟“ بالآخر ردوکد کے بعد سن ہی لی اس قہر کے دیوتا نے۔

”احمد ساتھ چلا جائے گا۔ یہ پچھلی گلی میں پہلا گھر ہی تو ہے۔“ شائستہ نے شکر کا سانس لیتے ہوئے بہ عجلت کہا۔

”کیا مطلب ہے؟ جوان لڑکی کو اکیلے بھیجو گی باہر گلی میں؟“ انہوں نے جلبلا کر بیوی کو گھورا۔ ”تم ساتھ جاؤ دونوں کے۔ اور ہاں حارث سے بھی کہو وہ بھی ہمراہ جائے گا اور ان کے گھر کے گیٹ پر کھڑا رہے گا۔“ انہوں نے حتمی لہجے میں کہا۔

”پوری فوج ہی کیوں نہ لے جائیں۔“ صحن میں جھاڑو لگاتی گلناز نے دانت کچکچا کر باپ کے کمرے کے کھلے دروازے سے آتی آواز پر ردعمل دکھاتے ہوئے زرگل کو دیکھا تھا جو حسب عادت ضبط وتحمل کی دیوار بنی ساکت کھڑی تھی۔

حارث اس مضحکہ خیز ڈیوٹی پر سخت بھنایا تھا مگر باپ سے جرح کون کرتا۔

”شائستہ میری تو شروع سے یہی خواہش رہی تھی بھائی صاحب کے مزاج کے باوجود میرے دل میں تمنا تھی کہ گلناز کو اپنی بہو بناؤں گی مگر اب وقت اور حالات بدل گئے ہیں۔ تمہیں پتا ہے پچھلے چند سالوں سے ہم لوگ امریکہ شفٹ کر گئے ہیں۔ احمر یہاں سیٹل ہے۔ ثمین بھی اپنے گھر کی ہو چکی۔ میرے بچوں کے مزاج اور عادات سے تو تم واقف ہی ہو گی۔ ہم نے انہیں صاف ستھرے شفاف پراعتماد ماحول میں بڑی محبت اور شفقتوں سے پالا ہے۔ ان کی رائے کا بھرپور احترام کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ خدا نے اولاد کے کسی معاملے میں ہمیں مایوس نہیں کیا۔ احمر سے پہلے میں نے شیخ صاحب سے بات کی تھی۔ انہوں نے صاف گوئی سے کہہ دیا کہ یہ رشتہ قطعی بے جوڑ ہوگا۔ ہمارے اور ابراہیم صاحب کے طرز تربیت میں بہت فرق ہے۔ انہوں نے جس طرح بچوں کی پرورش کی ہے اس ماحول میں پلنے والے بچے بذات خود نفسیاتی لحاظ سے بے حساب ذہنی الجھنوں کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ اُن میں اعتماد آگے بڑھنے کی صلاحیت اور زندگی گزارنے کے لیے مخصوص سماجی سرگرمیوں کا فقدان ہے بہرحال تم احمر

سے پوچھ لو۔ پھر میں نے احمر سے پوچھا کہ تم خالہ کے ہاں دو دن گزار کے آئے ہو۔ گلناز کے بارے میں کیا خیال ہے۔ احمر سنتے ہی ہنس پڑا۔ ممی جس ماحول میں وہ بچے رہتے ہیں وہاں ماسوائے اس کے وہ سانس اپنی مرضی سے اندر کھینچتے ہیں اور ان کے ہاں آزادی کا کوئی تصور ہی نہیں پایا جاتا۔ وہ لڑکی میرے ساتھ کیا چلے گی اگر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر آئینے میں ایک بار روبرو ہو کر اپنی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی ہمت کر لے تو بڑی بات ہے۔ کہاں امریکہ کی تیز رفتار زندگی اور کہاں زمانہ جاہلیت کے گھر کا نقشہ پیش کرتا وہ ماحول۔ آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے۔“ میں معذرت خواہ ہوں شائستہ! مگر کیا ہو سکتا ہے۔“

یمنی تو اپنا موقف بیان کر کے معذرت کرتی ہوئی بیٹے کے ہمراہ واپس امریکہ لوٹ گئیں مگر ابراہیم صاحب کے گھر میں یہ واقعہ عظیم طوفان کا پیش خیمہ بن گیا۔

چند سال پیشتر خوابوں کی دنیا میں قدم رکھنے والا شہزادہ جب ان کے گھر آیا تو گلناز کے تخیل کی دنیا میں نئے گلاب کھلنے لگے تھے۔ وہ جذبہ جسے محسوس کر کے وہ پہلے پہل ٹھٹک کر خود میں سمٹ جایا کرتی تھی۔ اب بیکراں ہو کر جسم و جاں کی پھیلی ہوئی طلب کی ہتھیلیوں میں سمٹ آیا تھا۔ پھر خبر ہوئی کہ اس سلسلے میں شائستہ نے یمنی کو کہلوایا ہے اور باپ بھی خواہش مند ہے تو آرزوؤں کے گلزار مہک اٹھے جن کی خوشبو اسے مست کر گئی تھی۔ کتنے ہی تمناؤں کے چراغ لو دینے لگے تھے۔

مگر پھر سب چراغ، پھول اور خوشبوئیں ماند پڑ گئیں۔ ہر رنگ پھیکا پڑ گیا خود اس کی زندگی کی طرح۔ وہ گم صم رہنے لگی۔ راتیں آنسوؤں سے بھیگی رہتیں اور صبحیں یاس آمیز خامشی کی نذر ہونے لگیں۔

کچھ عرصہ بعد یہ خامشی عجیب سی، اضطراب آمیز دیوانگی میں ڈھلنے لگی۔

گلناز کے تیور اور لب و لہجہ تلخ اور جارحانہ ہوتا گیا۔ کبھی کبھی جنون کے عالم میں چیزیں توڑ دیتی۔ بات بے بات الجھ پڑتی۔ اور کبھی بیٹھ کے رونے لگتی۔

شائستہ کی جان پر بن آئی۔ شوہر سے بیٹی کے بگڑے تیور چھپانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے تھے، مگر کب تک۔

یہ طوفان آ کر رہا۔

”کیا بات ہے، کیا آج تمہاری آنکھوں میں موتیا اتر آیا تھا۔ جو دھیان سے سالن نہیں بنایا۔ نمک کی پوری شیشی الٹ دی ہے گویا۔“ پہلا نوالہ لیتے ہی ابراہیم صاحب کو جلال آ گیا تھا۔ وہ کھانے کی میز سے رکھ کر واپس مڑتی گلناز کو پکار کر کاٹ دار لہجے میں بولے تھے۔

جواب میں گلناز نے عجیب غصیلے انداز میں بے باکی سے ان کی سرخ انگارہ نگاہوں میں دیکھا' پھر قدرے تیز لہجے میں بولی۔

''خود بنالیا ہوتا۔''

''ہائیں۔'' ابراہیم صاحب تو ایک طرف خود شائستہ بھی اس کے حد درجہ گستاخانہ انداز پر ششدر گئیں۔

''بدتمیز' بدلحاظ لڑکی۔ کیا بکواس کررہی ہو؟۔''

ابراہیم صاحب پل بھر میں شعلہ بن کر بھڑکنے لگے۔ خطرناک تیوروں سے اس کی سمت بڑھے تھے' کہ اس نے کھانے کی ٹرے اٹھائی اور دوسرے لمحے ساری ٹرے ابراہیم صاحب پر الٹ دی۔

''گلناز۔!'' شائستہ کا سانس اوپر کا اوپر' اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ الٰہی خیر۔ باپ بیٹی کے معرکے رشتے کا تقدس بچالینا۔ وہ تھر تھر کانپتے ہوئے مشتعل گلناز کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھیں۔ مگرا ئیں ابراہیم صاحب اس تک پہنچ چکے تھے' ان پر جیسے خون سوار تھا تڑاخ تڑاخ' گلناز کے پھول رخساروں پر طمانچے برسادیے۔

''خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا؟''

الاماں۔ وہ خوبصورت سی لچکیلی شاخ کی مانند لڑکی کسی غیر مرئی نادیدہ طاقت کے زیر اثر برق بن گئی تھی' کمرے کی ایک ایک چیز اٹھا کر باپ پر اچھالنے لگی۔

پھر کہیں سے ماچس ہاتھ آگئی۔ بیڈشیٹ کو تیلی دکھادی۔ شکر ہوا کہ حارث اور زرگل' شائستہ کے اور باپ کی للکار سن کر اندر لپکے۔ حارث نے ابراہیم صاحب کے ساتھ مل کر جنون میں ہوش وحواس بے گانہ بنی گلناز کو بازوؤں میں جکڑ کر مزید اقدام سے باز رکھا۔

زرگل نے ہانپتے ہانپتے بیڈشیٹ پر پانی کا جگ ڈال کر آگ بجھائی۔ تھوڑی سی تاخیر بھی جا ہوسکتی تھی۔

''ہائے ظالم۔ سنگدل' برباد کردیا سب کچھ۔ وہ دیکھو جل رہا ہے سارا گھر۔ شعلے اٹھنے دو نا۔ بجھاتے ہو انہیں۔ جلنے دو۔ تم سب بھی جل جاؤ۔ مرجاؤ سارے' کیا فائدہ زندہ رہنے کا۔ مجھے بھی ما وہ دیکھو لوگ ہنس رہے ہیں۔ آگ پر پانی نہ ڈالو۔ لوگوں کو ڈالو اس میں۔''

اور پھر اسی طرح چیختے ہوئے وہ حارث کے توانا بازوؤں میں بے ہوش ہوگئی۔ جنون میں اپنے اور دوپٹے سے غافل ہوگئی تھی۔

اس کی بے ہوشی طول پکڑ گئی تو لامحالہ حارث ڈاکٹر کو بلالایا۔

اس نے عمومی چیک اپ کے بعد فوری طور پر کسی نیوروسرجن سے رابطہ کرنے کو کہا۔ تین چار دن تک وہ اسپتال میں رہی۔

پھر ہوش میں تو آگئی مگر ان لوگوں کے لیے وہ بے ہوش ہی تھی۔ وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی' دنیا کی تلخیاں اب اس کے دل وذہن پر اثر انداز نہیں ہوسکتی تھی۔ ہر غم سے نجات مل گئی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق انتہائی ہیجانی دباؤ کے باعث دماغ کی ایک شریان پھٹ جانے سے خون اندرونی حصے میں جم گیا تھا۔ جو ایریا متاثر ہوا تھا' وہ براہ راست یادداشت اور حساس اعصابی نظام کو کنٹرول کرتا تھا۔

اب وہ آزاد تھی۔ ہر فکر وغم سے۔

وہ پاگل ہوچکی تھی۔

بیس برس کی خوبصورت بھرپور دوشیزہ۔ جو دیوانی ہوکر لباس وحجاب سے بے پرواہ باہر نکل پڑتی تھی' جسے اب واحد علاج کے طور پر کمرے میں بند رکھنا پڑتا تھا۔ اتنا تیز گھاؤ تھا کہ ابراہیم صاحب کی پرجلال جابرانہ ہستی ڈول گئی۔ سارا طنطنہ تفکر میں ڈھل گیا۔ گھریلو معاملات میں کنٹرول خود بخود ڈھیلا پڑ گیا۔ اب وہ زیادہ تر خاموش اپنے کمرے میں پڑے رہتے۔

ایسے میں حارث کو موقع مل گیا۔ ماں تو پہلے ہی رگ جاں بنا کر رکھتی تھی' باپ کے کرتوتوں کے پھل نے جوان بہن کی زندگی برباد کرڈالی۔ تو باپ سے تنفر اور بے زاری مزید بڑھ گئی۔ اب وہ ان کے کمرے میں بھی قدم نہیں رکھتا تھا۔ کبھی سامنا ہوتا تو منہ پھیر کے گزر جاتا۔

احمد اور ماہ گل تو پہلے ہی باپ کے ڈر سے سہمے ایک کونے میں دبکے رہتے تھے۔ وہ کہاں پاس آتے تھے۔

بس ایک زرگل تھی جو کھانے کی ٹرے' چائے' یا پانی پہنچانے کا فریضہ سرانجام دینے کی غرض سے دن میں دو بار کمرے میں جھانک لیتی یا پھر غموں کی ماری شائستہ تھیں جو ان کی ایک پکار پر اب بھی وفا کی دیوی بنی سر جھکائے آجاتی تھیں۔

گھر میں قبرستان کا سا سناٹا طاری رہتا تھا۔ جسے صرف گلناز کی دیوانہ وار بے ہنگم چیخیں کبھی کبھار توڑ ڈالتی تھیں۔ حارث نے تو جیسے گھر میں ٹکنا خود پر حرام کرلیا تھا۔

سارا دن گھر سے باہر رہتا۔ ایم۔ اے کر کے اس نے ایک اخبار میں ڈھائی ہزار روپے کی جاب کرلی۔ حالانکہ ابراہیم صاحب نے بہت واویلا کیا' مگر حارث اب تابعداری کی منزلوں سے آگے گزر

چکا تھا وہ مقامی رپورٹر بن کر مطمئن تھا۔ باپ کی سرزنش پر کان دھرنے کی زحمت بھی نہیں کی۔
ابراہیم صاحب ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔ ان کے اقتدار کا سورج ڈوب چکا تھا۔
اور پھر ایک دن اسی طرح چپکے سے آنکھیں موند گئے۔ ناآسودہ۔ پیشمان' پریشان اور نامراد۔
گھر میں ان کے جانشین کے طور پر گویا حارث گدی سنبھال چکا تھا۔

وہ پچھلی گلی میں اپنی کلاس فیلو رفعت سے ملنے گئی تھی احمد کے ہمراہ' وہ بی اے کر چکی تھی' اور اب کر
جاب کے سلسلے میں رفعت سے بات کر کے آرہی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ ایک رفاہی ادارے مین انتظا
سنبھالنے کے لئے لڑکی کی پوسٹ آئی ہے اخبار میں۔ زرگل جلد از جلد کام سے لگنا چاہتی تھی' گویا کہ
ٹیوشنز وغیرہ تو وہ تین چار برسوں سے کر ہی رہی تھی۔
''کہاں سے آرہی ہو تم۔؟'' وہ سہ پہر چار بجے کے قریب سوچوں میں ڈوبی گھر پہنچی تو حارث نے
ناگواری سے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے سختی سے پوچھا۔
''رفعت کے ہاں گئی تھی بھائی۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیتے ہوئے چادر اتاری۔
''بہت ضروری تھا جانا کیا؟'' وہ چبا کر بولا۔ تیور کڑے تھے۔
''ضروری تھا تو گئی تھی۔'' وہ کچھ برہمی سے اسے دیکھنے لگی۔
باپ کے بعد اب بھائی کسر پوری کر رہا تھا۔ سچ ہے باپ پہ پوت' نسل پہ گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑ
تھوڑا۔
حالانکہ ایک زمانے تک وہ باپ کے عتاب کا نشانہ رہا تھا۔ اور اب جب خود با اختیار بنا تھا
لاشعوری طور پر باپ کا عہدہ سنبھال لیا تھا۔ وہی جاہ و جلال اور شکی فطرت' ماہ گل کبھی چھت پر کھڑی نظ
آجاتی تو بلا جھجک تھپڑوں سے تواضع کر دیتا۔ زرگل کالج کے علاوہ گھر سے باہر جانے لگتی تو ہزار قدغن لگا
تھا۔ وہی ترشی' وہی تندی' یقین نہیں آتا تھا' یہ وہی حارث ہے جو کہا کرتا تھا کہ۔
''دیکھنا جب میری باری آئے گی تو میں بہت خوشگوار ماحول دوں گا گھر والوں کو' جہاں اپنی مرض
سے آنے جانے' اٹھنے بیٹھنے کی آزادی ہو' ابو جی کی طرح سینٹرل جیل ہرگز نہیں بناؤں گا۔''
مگر وقت آنے پر اپنا زمانہ بھول بیٹھا تھا۔ خاص طور پر ماہ گل اور احمد کے ساتھ بالکل اسی طرر
سلوک کرتا تھا۔ جیسے ابراہیم صاحب گلناز کے اور اس کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ سب دعوے وقت کے
دریا میں بہا دیئے تھے۔

وہی بات تھی کہ۔

وہ جن کو شکوہ تھا اوروں کے ظلم سہنے کا
خود ان کا اپنا بھی انداز جارحانہ تھا

زرگل اس کے کڑے تیوروں سے کچھ زیادہ مرعوب نہیں ہوتی تھی۔ خصوصاً جب سے اس کے ''
رنامے'' کھلے تھے۔
وہ اخبار میں کلچرل رپورٹر تھا۔ نت نئی چٹخارے دار خبریں اور اسکینڈلز گھڑنا اس پر ختم تھا۔ کسی ''بڑی''
یت کو رنگ رلیاں مناتے دیکھ لیا' اور خبر لگانے سے قبل اس کو آگاہ کر دیا۔ بس وارے کے نیارے
ہاتے تھے۔ وہ شخصیت عزت بچانے کے لیے اس کا منہ بھر دیتی تھی نوٹوں سے۔ اسی طرح کسی سے
لے کر کسی دوسرے کے خلاف خبر چھاپ کر دام کھرے کر لیتا تھا۔ وہ اسکینڈل ڈھونڈنے کے لیے
محنت کرتا تھا۔ ثبوت کے طور پر ساتھ ملوث شخصیات سے رابطہ کرتا تھا' اس لیے من چاہا ''صلہ'' حاصل
ہاتا تھا جہاں نت نئے اسکینڈلز جن میں سیاسی' سماجی اور فلمی اسکینڈلز بھی شامل ہوتے تھے۔ اس کے
ار کی مقبولیت میں اضافہ کر رہے تھے۔ وہاں اخبار کے مالک کی نظروں میں اس کا مقام بنتا جا رہا تھا۔
زرگل کچھ عرصہ قبل اس گورکھ دھندے سے آگاہ ہوئی تھی۔ اس نے ماں اور بھائی کے سامنے بہت
یلا مچایا۔ بھائی کو لتاڑا' مگر وہ ڈھٹائی سے مکر گیا۔ الٹا اسے جھوٹا ٹھہرانے لگا۔ مگر وہ حقیقت جان چکی
ا۔ اب حارث کے بھرّے میں نہیں آتی تھی۔ وہ اب اس سے پیسے بھی نہیں لیتی تھی جو وہ جیب خرچ
طور پر اسے ہر ماہ دیا کرتا تھا۔
''یہ ناجائز کمائی ہے۔ میں اس میں حصہ دار نہیں بنوں گی' اور سن لیں۔ میں بی اے کے بعد جاب
روں گی۔''
شائستہ اور حارث نے آسمان سر پر اٹھا لیا' مگر وہ پیچھے نہیں ہٹی۔ اور آج بھی اسی سلسلے میں رفعت
ے مشورے کے بعد حتمی فیصلہ کر کے اٹھی تھی۔ صبح وہ حارث کے جانے کے بعد ''امن گاہ'' نامی رفاہی
رے کے ایڈریس پر پہنچ گئی۔ یہ بے سہارا معاشرے میں تنہا رہنے والی اور جاب کرنے والی لڑکیوں کا
لمن تھا۔ ماحول ہوسٹل کی طرح تھا۔ ایک مشہور سماجی شخصیت بیگم سرفراز نے خواتین کی بہبود کے لیے یہ
رہ کھولا تھا۔ انتظامِ کلی طور پر ایڈمن انچارج مسز سبحانی کے ذمے تھا' انہیں دیگر انتظامی امور کے لیے
معاون لڑکی کی ضرورت تھی۔ ضروری معاملات طے کر کے اسے جاب پر رکھ لیا گیا۔

وہ بہت سکون اور اطمینان کے جذبات لیے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ قطع نظر اس بات کے کہ حارث نے سن کر کیا طوفان مچانا تھا۔ اور ماں کے بگڑے تیور کیسے بحال کرنے تھے' وہ طے کر چکی تھی کہ پیچھے نہیں ہٹے گی۔

امی شاید سو رہی تھیں۔ ماہ گل نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے کھانا کھا کر صحن میں جھا لگانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ باہر بیل ہوئی۔

''حارث گھر پر ہو تو اسے بلا دیجیے گا۔'' بظاہر بڑے مہذب اور بے نیاز انداز میں درخواست کی تھی۔ مگر درخواست گزار کا چہرہ دیکھ کر کاٹ دار نگاہ ڈال کر رہ گئی تھی۔

سانولی رنگت' سیاہ پرکشش آنکھوں اور مضبوط قد و قامت والا یہ لاپرواہ بنا کھڑا شخص اجلال احمد حارث کا ساتھی۔ دونوں ایک ہی اخبار میں کام کرتے تھے۔ حارث کے اخباری ساتھیوں اور یار دوستوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ خصوصاً ابراہیم صاحب کی وفات کے بعد وہ جیسے ساری پچھلی حسرتیں نکال رہا تھا۔ جی بھر کے من مانی کرتا تھا۔ جب سے حارث کے کرتوتوں کا پتا چلا تھا' وہ اس کے اخباری دوستوں سے بھی خار کھانے لگی تھی۔ اور اجلال تو ویسے بھی اسے پسند نہیں رہا تھا۔ نظر باز اور بدتمیز سا۔ بات کم گھورتا زیادہ تھا۔ گو کہ اس کی نظروں میں سوقیانہ پن نہیں ہوتا تھا' مگر جس طرح جو شیلے انداز میں جماتا۔ وہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑا دیتا تھا۔ اجلال سے چڑنے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ حارث کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتا تھا۔ تین چار سال سے دوستی تھی ان میں۔

''اگر وہ تشریف رکھتا تو میں آپ کو یہاں کھڑی نظر نہ آتی۔'' چھپاتے چھپاتے بھی لہجے کی تلخی جھلک پڑی تھی۔

''اوہ۔'' اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے ایک اچٹتی نگاہ زرگل پر ڈالی۔ نظر میں کچھ ایسی معنی خیز حدت تھی۔ کہ وہ ہونٹ بھینچ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

چہرے پر ناگواری کی لالی جھلکنے لگی تھی۔ وہ غصہ دباتے ہوئے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

''کب تک آ جائے گا' کچھ بتا کر گیا ہے۔'' وہ کی رنگ ہاتھ میں تھماتا ہوا سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''مجھ سے زیادہ آپ بہتر جانتے ہوں گے۔ یار غار جو ٹھہرے۔'' وہ لفظ چبا چبا کر بولی۔ لہجے کی کاٹ تھی۔ ''وہ جس قسم کے کاموں میں مصروف رہتا ہے' وہاں گھر سے باہر رات گزارنی پڑ جائے بھی اس کے لیے کیا مضائقہ۔''

''تم بہت ناراض معلوم ہوتی ہو۔ بی۔ اے کے بعد کیا ارادہ ہے تمہارا؟'' وہ اس کا استہزائیہ انداز نظر انداز کر کے نرمی سے دریافت کرنے لگا۔

''آپ نے مزید کوئی بات کہنی ہے تو بتایئے۔'' اس کے کہنے کا مقصد تھا کہ حارث کے نام کوئی پیغام دینا ہے تو دو' ورنہ میں دروازہ بند کرنے لگی ہوں۔ اس کے آنکھوں میں چمک بیدار ہو گئی۔

''کہنے کو کہہ گزروں' مگر کیا تم سننے کی تاب لا پاؤ گی؟'' وہ براہ راست اس کی پھیلی ہوئی خوبصورت آنکھوں میں دیکھتا ہوا متبسم لہجے میں استفسار کر رہا تھا۔ اس کے انداز کی شرارت نے زرگل کو تپا کے رکھ دیا۔ ابھی کچھ کہنے کو تھی کہ پیچھے سے چپل گھسیٹنے کی آواز سن کر چونکی۔ امی اس طرف آ رہی تھیں۔

''کون ہے دروازے پر؟'' وہ دروازے کی طرف آئیں تو اجلال نے جھٹ سلام داغ دیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد وہ اپنی نسان سنی گاڑی میں روانہ ہو گیا۔ شائستہ جانتی تھیں اسے۔ وہ اکثر حارث سے ملنے آتا رہتا تھا۔

زرگل امی کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے صحن میں بوسیدہ سے تخت پر ان کے ہمراہ بیٹھ گئی۔ بالآخر بات شروع ہو گئی۔ کہ بہر حال کنارے تو لگنا ہی تھا معاملہ۔

امی بہت خفا ہو رہی تھیں۔ انہیں بیٹے کی ناراضگی کا خوف تھا۔

''اللہ کا واسطہ ہے زر۔ ماں کی حالت پر رحم کھاؤ۔ کیوں اس عمر میں کانٹوں پر رول رہی ہو۔ میری لیر لیر زندگی تیرے سامنے ہی تو رہی ہے۔ پہلے اپنے مرد کے مظالم سہے۔ پھر جوان بیٹی کا غم۔ اور اب بیٹے کے تیور۔ کہاں تک امتحان لو گے میرے صبر کا تم لوگ۔ بخش دو اب مجھے۔ اور سہنے کی تاب نہیں رہی مجھ میں۔ جانتی تو ہو اچھی طرح حارث بھی باپ پہ گیا ہے۔ آپے سے باہر ہو جائے تو قیامتیں اُٹھا دیتا ہے۔''

وہ بے چارگی اور آزردگی کے ملے جلے انداز میں شاکی لہجے میں اس سے مخاطب تھیں۔

زرگل نے ایک بے بس ترحم آمیز نگاہ ماں پر ڈالی۔

''امی۔۔!'' اس نے آہستگی سے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا' اور دردمندی سے بولی۔

''خدا گواہ ہے۔ یقین کیجیے میں اپنی ذاتی غرض و غایت یا ضرورت کے لیے یہ قدم نہیں اٹھا رہی۔ یہ سب کچھ کرنے کی وجہ ہماری اجتماعی بہتری ہے امی! آپ ایک لمحے کو ماما کے جذبات پس پشت ڈال کر ایک منصف کی نگاہ سے حارث بھیا کی مصروفیات کا جائزہ لیں۔ سچ بتائیں' کیا آپ کے ذہن میں یہ سوال کبھی نہیں ابھرا کہ ایک معمولی سا مقامی رپورٹر ہونے کے باوجود وہ اتنے ٹھاٹھ باٹھ سے کیسے رہ لیتا ہے۔ پانچ پانچ ہزار کا ایک سوٹ خریدتا ہے۔ ہونڈا کا موٹر سائیکل ابھی پچھلے سال اس نے خریدا ہے۔

کھانے پینے رہنے کے لیے عمدہ اور قیمتی اشیاء کا استعمال۔ ایک ایک ہزار کے پرفیوم استعمال کرتا ہے چال ڈھال سے کسی بگڑے ہوئے رئیس کا سا تاثر دیتا ہے۔ والٹ میں ہزار ہزار کے نوٹ یوں بھرے رہتے ہیں، جیسے وہ محض کاغذ کے معمولی سے ٹکڑے ہوں، یہ سب کہاں سے آتا ہے۔ مقامی رپورٹر کی تنخواہ حد سے حد تین ہزار ہوتی ہے، چلو سینئر ہو جانے کی وجہ سے ایک ڈیڑھ ہزار مزید بڑھ گئی ہوگی، ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا سوچا جاسکتا ہے۔ پھر یہ شان و شوکت یہ عیش۔ آخر اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے، اور کیسے کما کر لاتا ہے۔"

امی ایک لمحے کو چپ سی رہ گئیں، یہ بات تو ممتا کے وسوسوں میں نمایاں ہو کر تیرتی رہتی تھی۔

"امی! اگر حارث بھیا اس روش پر نہ چل رہے ہوتے تو آپ کے سر کی قسم، میں روکھی سوکھی کھا لیتی، مگر قدم گھر سے باہر نکالنے کا نہ سوچتی کہ مجھے شروع سے ہی صبر و ضبط سے بری بھلی برداشت کر لینے کی عادت رہی ہے، مگر حارث بھیا کی کمائی ناجائز ہے، کھلی بلیک میلنگ ہے، جس کا پیسہ ہم استعمال کرتے ہیں۔ ایسے میں کوئی تو ہو جو ڈولتی کشتی کو سہارا دے سکے۔ گلناز آپی کا حال آپ کے سامنے ہے۔ ماہ گل اور احمد بہت چھوٹے ہیں، ایسے میں اور کون ہے جو حالات کو سنبھالا دے سکے۔ صرف یہ سوچ کر قدم گھر سے نکالے تھے میں نے۔ امی پلیز! مجھے اپنی رضامندی کی مضبوطی عطا کریں۔ میں ہر محاذ پر لڑوں گی۔"

"حارث کو کیسے سمجھاؤں گی میں۔" وہ کچھ کچھ قائل ہو کر ہارے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگیں۔

زرگل کے اندر اطمینان پھیلنے لگا۔ ان کا ہاتھ دبا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نظر انداز کر دیں امی! سن کے خاموش رہیں۔ مجھے بھی یہی پالیسی اپنانا ہوگی۔ اسے مالک و مختار بن کر احساس نہیں، تو ہم تو شعور رکھتے ہیں۔ بس آپ اپنا دل صاف کر لیں اور کل مجھے اپنی دعاؤں کے ہمراہ رخصت کیجئے گا۔ جاب کا پہلا دن ہے کل۔"

حارث نے بہت ہلڑ مچایا تھا۔ چیخ چلا کر اپنی برہمی کا اظہار کیا، مگر زرگل کان لپیٹے ڈھٹائی سے سنتی رہی۔ دو چار دن بعد بالآخر حارث کو بادل نخواستہ اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا۔ کہ وہ ماہ گل، احمد یا ماں کی طرح زرگل کو ایک جارحانہ نظر سے چپ نہیں کروا سکتا تھا۔ خوف زدہ نہیں کر سکتا تھا۔

حالانکہ زرگل شروع سے بہت صابر، کم گو اور بے ضرر لڑکی رہی تھی، مگر تعلیم کے بخشے ہوئے اعتماد اور ذہانت کے آگے حارث بے بس رہ گیا تھا۔ تاہم اب زرگل اس کی چشم عنایت سے محروم ہو چکی تھی۔ اول تو مخاطب ہی نہ کرتا، اور جو کرنے پر مجبور ہو جاتا تو بھی انتہائی تحقیر و تنفر سے لبریز انداز میں شعلے برساتے انداز میں بات کرتا۔

زرگل جیسے ہر شے سے بے پرواہ ہو کر اپنی دھن میں مگن رہتی تھی۔

📖

اخبار کے ہال میں ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ آدمی تو بہت تھے مگر سب کے سب کاموں میں مصروف تھے۔ ایک کونے میں پیسٹنگ ٹیبل پر کاپی پیسٹرز قینچیاں گم اسٹک اور بٹر پیپرز کھڑکاتے مسطر پر بٹر پیپر پھیلا رہے تھے۔ ادارتی اور تفریحی صفحات کی پیسٹنگ سر شام ہی شروع کر دی جاتی تھی۔ کہ دوسرے شہروں میں ڈاک بھیجنا ہوتی تھی۔ سات بجے تک ڈاک کا کام نپٹا کر لوکل پیپر کی تیاری شروع ہوتی تھی۔ پیسٹنگ ٹیبل سے ذرا فاصلے پر بیضوی ترتیب میں لکڑی کے جڑاؤ ٹیبل لگے ہوئے تھے، جہاں صفحات کے انچارج کمپیوٹر روم سے آنے والے بیانات اور سرخیاں پروف ریڈرز سے چیک کروانے کے بعد خود ایک بار دیکھ کر فائنلائز کر کے کاپی پیسٹر کے حوالے کر رہے تھے۔ اسی جگہ اکا دکا رپورٹر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ معاً ریسپشن سے فون کال ہال میں پاس کی گئی۔ اجلال فون کے قریب تھا، اس نے ریسیور اٹھایا، اور پھر میسج سن کو حارث کو بلایا۔ حارث کیمرہ سیکشن میں کیمرہ مین کو تصویریں دیتے ہوئے مطلوبہ سائز نوٹ کروا رہا تھا۔ مصروف سے انداز میں اسی طرح تصویریں ہاتھ میں پکڑے فون تک آیا تھا۔

"چیف سیکریٹری رؤف علی بات کریں گے۔" دوسری طرف سے پی۔ اے کی مودبانہ آواز سنائی دی۔

"رؤف علی۔ اوہ۔" حارث کے ہونٹوں پر ابھر آنے والی مسکراہٹ آنکھوں تک پہنچ گئی۔ وہ محتاط سا ہو گیا۔ ایک نظر ہاتھ میں پکڑی تصویر پر ڈالی۔ رؤف علی کے ساتھ شہر کی مشہور ماڈل گرل ناظمہ نہایت نازیبا حالت میں تھی۔ یہ سین کسی گیسٹ ہاؤس کا تھا۔

تین دن سے حارث اس چیف سیکریٹری کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ تب "گوہر مقصود" ہاتھ میں آیا تھا۔

"مسٹر حارث! میں رؤف علی بات کر رہا ہوں۔" تھوڑی دیر بعد ایئر پیس پر ایک سرد جھنجھلائی ہوئی کوفت زدہ آواز ابھری، انداز میں تحکم نمایاں تھا۔ مگر چھپاتے چھپاتے بھی پس پردہ پریشانی اور دھڑکا حارث کی زیرک حسیات سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔

وہ بڑے فرحت انگیز انداز میں مسکرایا۔

"جی سر! حکم کیجئے، بندہ کو کیسے یاد فرمایا۔" اس نے سادہ و معصوم انداز میں سوال کیا۔

"بکواس بند کرو۔" وہ دبے انداز میں غرایا تھا۔

حارث اس کی غراہٹ کے پس پردہ ہلکورے لیتے ہوئے خدشات سے بہت حظ اٹھا رہا تھا۔ ایسے

مواقع پر وہ ہمیشہ بہت لطف اندوز ہوتا تھا۔
حارث کی اذیت پسند طبیعت کھل کھل جاتی تھی۔

"تم نے وہ ثبوت کہاں سے حاصل کیے ہیں؟" وہ دانت پیس کر پوچھ رہا تھا' لہجہ مدھم تھا کہ ایسے مواقع پر رازداری برتنے کے لیے یہی حکمت عملی اپنانی پڑتی ہے۔

"سر! آپ کی خوشبو کی کشش لے گئی ہمیں بھی کھینچ کر۔" حارث نے اتنے گرم جوش انداز میں محبت سے کہا' جیسے مرید بننے میں بس ذرا سی کسر تو رہ گئی تھی۔

اس کا دل اونچے اونچے قہقہے لگانے کو مچل رہا تھا۔ چیف سیکریٹری کی نگاہ میں یقیناً کل کے اخبارات میں لگنے والی تباہ کن سرخیاں اور ہوشربا تصاویر گھوم رہی ہوں گی۔ چیف سیکریٹری کے ادھ موا ہونے کے خیال سے وہ مخمور ہوا جا رہا تھا۔

اصل میں اس نے چیف سیکریٹری ہی کے لیول کا ایک اور بندہ پھانسا تھا۔ پچھلے ہفتے' حسب معمول ثبوت حاصل کر کے ان تصاویر کی ایک کاپی اس بندے کو ارسال کی جس نے تصاویر دیکھتے ہی حسب توقع اخبار میں فون کھڑکا دیا۔ ہوتا تو یہی تھا کہ حارث اس بندے سے ڈیل کر کے اپنی ڈیمانڈ بتاتا تھا۔ اور مطلوبہ رقم حاصل کرنے کے بعد تصاویر ضائع کر دیا کرتا تھا۔ مگر اس بندے کے ساتھ معاملہ مختلف ہو گیا۔ وہ شخص چیف سیکریٹری رؤف علی کے بہت خلاف تھا اس نے چال چلنے کے لیے حارث کو بھی ساتھ ملا لیا۔

"تم صرف پچاس ہزار طلب کرتے ہو۔ میں تمہیں اس سے دگنی رقم دے سکتا ہوں' مگر کام تمہیں اس کے الٹ کرنا ہو گا' یعنی یہ رقم اسکینڈل نہ چھاپنے پر نہیں بلکہ اسکینڈل چھاپنے پر ملے گی۔" اس شخص کی پیش کش پر حارث ایک لمحے کو متذبذب ہو گیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بات کی وضاحت کرنے کو کہا۔

پھر اس نے بتایا تھا کہ چیف سیکریٹری کی بھی ناظمہ سے بہت دوستی ہے۔ "تم اس کی ناظمہ کے ساتھ تصویر اور اسکینڈل چھاپ دو تو منہ مانگا انعام دوں گا۔ تم جانتے ہو' میرا ذاتی شوروم ہے۔ تم چاہو تو سوزوکی کار اپنی پسند کی لے سکتے ہو' اس کام کے عوض' میں اس حد تک بھی پیش کش کر سکتا ہوں۔"

اور حارث کو تو جیسے بیٹھے بٹھائے قارون کا خزانہ مل گیا تھا۔ وہ تو ویسے بھی بڑے عرصے سے گاڑی خریدنے کے چکروں میں تھا۔ لالچ نے آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ اور یہ کام وہ کر گزرا تھا۔ اس کے لیے دو تین دن گھر سے باہر رہنا پڑا تھا۔ کل کے اخبار میں رؤف علی کا سارا کچا چٹھا کھل جانا تھا۔ اسی لیے وہ حارث پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ حارث کی آنکھوں میں نئی نکور گاڑی لشکارے مار رہی تھی۔ کل وہ اس کی ملکیت ہو گی۔

چیف سیکریٹری نے بہتیری آفرز کیں' مگر اس نے پائے جنبش سے ٹھکرا دیں۔ بھلا وہ اسے کیا دے سکتا تھا' زیادہ سے زیادہ چالیس پچاس ہزار۔

اگلے روز بڑے اہتمام سے اسکینڈل شائع ہوا۔ چیف سیکریٹری کی شامت آ گئی۔ وہ معطل کر دیا گیا تھا۔ "مسٹر حارث! یاد رکھنا میں انتقام لوں گا۔ تم نے اپنی سی کر لی۔ اپنا وار کر گزرے ہو۔ اب میرا وار برداشت کر کے دکھانا پھر میں مرد مانوں گا۔" اگلی شام کو رؤف نے حارث کو فون کیا تھا۔

"اوہو۔ ہو سر جی! اتنا غصہ کیوں کرتے ہیں۔" وہ بڑے چڑانے والے انداز میں محظوظ ہوتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"تم انتظار کرو مسٹر حارث!" غراتے ہوئے وحشیانہ پُراسرار لہجے میں کہہ کر فون پٹخ دیا گیا تھا۔

"آئے۔ ہائے۔ بے چارہ۔" حارث نے ٹانگیں لمبی کر کے پھیلاتے ہوئے بے چارگی سے سر ہلایا' اور پھر ایک دم ہنس پڑا۔ تصور میں رؤف علی کا تلملاتا چنگھاڑتا غضب ناک چہرہ گھوم رہا تھا۔ حضرت اپنی ہی بوٹیاں نوچ رہے ہوں گے۔

"کاش میں یہ نظارہ دیکھ سکتا۔" وہ پھر ہنسا تھا۔

انقلاب وہیں آتا ہے جہاں بنیاد کمزور ہوتی ہے' وہ درخت سب سے پہلے جڑ سے اکھڑتا ہے جس کی بنیادیں کمزور رہی ہوں۔

انقلاب بات زمانہ۔ مثلاً ماحول' حالات' شخصیات اور طرز عمل کی تبدیلی کی شدتیں۔ سب سے زیادہ کمزور دل گردے والے بندے پر اثر انداز ہوتی ہیں مضبوط اعصاب والے بہر حال سہہ لیتے ہیں۔ سو فطری امر ہے جو بنیاد ہل جائے' کمزور پڑ جائے۔ اس پر مکان تعمیر کرنا ریت کا گھروندہ بنانے کے مترادف ہوا کرتا ہے' کیونکہ۔

گلناز بہت کمزور اعصاب کی مالک تھی' بہت جلدی تھک بھی گئی۔ حوصلہ چھوڑ کر ستانے کے لیے بے خبری کی سرمست و سرشار وادیوں کی مکین بن بیٹھی۔ انہیں تنہا اور خالی کر کے۔

زرگل کے اعصاب کی پختگی اور اس کا سیلف کنٹرول اس کی راہ میں حائل ہو گیا تھا جیسے۔

وہ تو بس اپنے ہی دائرے میں گم رہنے والی لڑکی تھی۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے لیے سوچتی تھی۔ ہمیشہ اپنی ذات کی نفی کر کے سوچ کے دھارے' اپنے فرائض کی سمت موڑ دیا کرتی تھی۔

بظاہر کسی تاریخی قلعے کی طرح ویران' خاموش اور ساکن نظر آنے والی زرگل کے اندر ایک حساس دل

آباد تھا۔ جو وہ وقت سے پہلے ہی میچور ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ وہی صورت حال تھی کہ

بچپن اس طرح گزرا کہ کھلونے نہ ملے
اور جوانی میں بڑھاپے سے ملاقات ہوئی

اس نے جب ''امن گاہ'' میں قدم رکھا' تو شروع شروع میں بہت سے لوگوں نے اس کے چہرے پر رقم سادگی' سکوت اور جاذبیت کو بھولپن اور معصومیت جان کر فائدہ اٹھانے کے لیے ہمدردی اور تعاون و تسلیم کے جال پھینکے تھے۔ میڈم سبحانی کا دست راست انعام علی تو اب تک اس ''کیس'' پر لگا ہوا تھا منتہا پانے کے لیے۔ اس کے علاوہ ہوسٹل میں قیام پذیر ملازمت پیشہ لڑکیوں کے ملنے جلنے والوں' چاہنے والوں اور ملاقاتیوں میں سے بھی کچھ نے کوشش کی تھی۔ مگر وہ ردعمل کے طور پر چپ کا اسرار میں لپٹا مجسمہ بنی اپنے کام میں مگن رہتی تھی۔

مگر ایک شخص ایسا تھا جس کے لیے ہتھیار ڈالنا اس کی غیرت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ بدستور لگا ہوا تھا۔ اس مہم پر۔ مکمل یقین اور زعم کے ساتھ۔

اس کا اکثر ''امن گاہ'' آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میڈیم سبحانی سے خاصی دوستی تھی۔ شروع شروع میں زرگل کو یہاں دیکھ کر یکدم ٹھٹک سا گیا تھا۔ بلکہ قدرے ناخوشگوار اور فکرمندانہ انداز میں اس کی ملازمت پر خیال آرائی کی تھی۔

''بھلا تمہیں جاب کرنے کی کیا ضرورت تھی' حارث کیسے مان گیا۔ کیا اس کو پتا ہے۔''

''یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔'' وہ آرام سے اس کے استفسار کا جواب گویا پی گئی تھی۔ وہ بھی سر جھٹک کر چل دیا۔ کسی بات کے لیے وہ اس پر دباؤ نہیں ڈالتا تھا۔ وہ کتنی ہی تلخی اور کرختگی سے بات کرتی' اجلال کا انداز پرسکون اور متبسم رہتا تھا جیسے لطف لے رہا ہو۔

اس دن بھی جانے کہاں سے۔ خوار ہوتا ''امن گاہ'' کے استقبالیہ پر نمودار ہوا تھا۔

''میز بانو! ہوشیار ہو جاؤ۔'' بشاش آواز اور ٹیبل پر انگلیوں کی دستک نے بے طرح کسی سوچ میں ڈوبی زرگل کو چونکا دیا۔ وہ نشست بدلتے ہوئے سیدھی ہوگئی۔ اور ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈال کر خوامخواہ سامنے پڑے رجسٹر پر جھک گئی۔

''کتنی آرام دہ جاب ہے۔ پتا نہیں یہ ''سماجی'' لوگوں کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آجاتا ہے' جو ایسے ادارے کھول کو مفت ملازم افورڈ کر لیتے ہیں۔'' وہ مقابل کے مزاج اور برداشت سے قطع نظر دو ٹوک

خیال آرائی کرنے کا شائق تھا۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ زرگل کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں بننے کا عمل شروع ہو چکا ہے مگر وہ بدستور چپ تھی اور اس کی یہی چپ تو اجلال کو بے رحمی سے گفتگو کرنے پر اکساتی تھی۔ ایک قفل تھا جو ٹوٹتا ہی نہ تھا۔

''احتساب کا عمل اس معاشرے پر لاگو کیا جاسکتا تو سب سے پہلے آپ جیسے پر گرفت نہ ہوتی کیا۔؟ ایک کلرک کے گریڈ کی تنخواہ پانے والے معمولی رپورٹر نئے ماڈل کی قیمتی گاڑی میں گھومتے ہیں۔ فائیو اسٹارز ہوٹلوں میں ڈنر کرتے ہیں۔ امپورٹڈ جوتے اور کپڑے استعمال کرتے ہیں' ان سے پوچھنے والے کہاں سوئے ہوئے ہیں؟''

وہ اپنی تلخی چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکی تو آہستگی سے کہہ بیٹھی۔ جواب میں اجلال کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری' اس نے اپنا وزن ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر منتقل کرتے ہوئے ایک بھرپور نگاہ اس کے تپے ہوئے چہرے پر ڈالی تھی۔

''ضروری تو نہیں اس فیلڈ میں آنے والے سبھی لوگ جدی پشتی فقیرانہ حالت میں رہے ہوں۔ یہ گاڑی' جوتے کپڑے اور آن بان موروثی اور خاندانی بھی تو ہو سکتی ہے۔ ویسے ''تجزیہ'' برا نہیں لگا۔ اس میں مزید جان پڑ جاتی۔۔ اگر تجزیاتی نگاہ گردن سے تھوڑا اوپر چہرے پر اور آنکھوں کے رنگوں پر بھی کچھ لمحے غور فرما لیتی۔ کچھ علامتی افسانے ان میں رقم تھے۔ انہیں بھی پڑھ لیا ہوتا۔'' بات کرنے کا انداز تو ہلکا پھلکا ہی تھا مگر نگاہ اور لہجے کا اتار چڑھاؤ کچھ ایسی بے باکانہ حدت لیے ہوئے تھا کہ وہ کٹ کر رہ گئی۔ خود کو جواباً کچھ بولنے سے لاچار محسوس کرنے لگی۔

اجلال اس کے گالوں پر اترتی آتشیں حرارت کو محسوس کر رہا تھا۔ جب وہ حیا بار ہوتی تھی تو اس کے چہرے پر انوکھے ہی نظارے دیکھنے کو ملتے تھے۔ پلکیں' تیز تیز جھپکاتی اٹھاتی گراتی ہونٹوں کے کونے چباتی' بوکھلاہٹ میں کان کے پاس کی لٹ کو خوامخواہ پیچھے اڑستی ادھر ادھر دیکھتی نگاہ بچاتی ہوئی وہ دیکھنے کی چیز لگتی تھی۔

''آپ کو کچھ اور کہنا ہے؟'' وہ ناگواری دبا کر ایک دم خشک لہجے میں بولی۔

''کیا تم سننے کی تاب لاؤ گی؟'' اس کے جان چھڑانے والے سپاٹ انداز پر اجلال کو سابقہ ملاقات یاد آگئی۔ وہ حسب سابق اسی نگاہ اور لہجے میں جواب دیتے ہوئے گویا تنگ کرنے کی انتہائی حدود کو چھو گیا۔

زرگل نے ایک برہم نگاہ اس پر ڈال کر کچھ کہنا چاہا پھر سر جھٹک کر رجسٹر آگے کر لیا گویا مکمل طور پر اس

کی موجودگی کی نفی کرنا چاہی تھی۔

"جب گھر سے باہر نکل کر میدان عمل میں کودتے ہیں تو جذبات کے اتار چڑھاؤ کو بھی گھر بھول آیا کرتے ہیں۔

یہ زندگی ہے اور مسئلے مسائل اس کا جزولاینفک ہیں۔ان پر پریشان ہونا یا پریشان کرنا کسی طرح بھی ان سے نجات نہیں دلا سکتا۔"

"میں یہ سبق بہت پہلے پڑھ چکی ہوں۔ بہتر ہوگا آپ خود پر ان کو لاگو کر کے دیکھیے۔ خاص طور پر اپنی رومینٹک نیچر پر۔" اس کی سنجیدگی نے زرگل کو ایک لمحے کو متحیر کر دیا تھا پھر وہ بگڑ کر بول اٹھی۔

وہ جواب میں بے اختیار مسکرایا۔

"تم نے یہ بات کہہ کر دوبارہ اپنی جذباتیت کا ثبوت پیش کر دیا ہے۔"

"رومینٹک ہونے سے کیا مراد ہے؟ کیا تم مجھے اس اصطلاح کا مطلب سمجھا سکتی ہو؟" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر سوال کیا پھر اس کے نظر چرانے پر خود ہی جواب میں شروع ہوگیا۔

"رومانیت سے مراد ہے حس لطیف کے عمل کو کس شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ رومان پسندی دراصل آپ کی ذات کی حساسیت کو ظاہر کرتی ہے کہ آپ فطری رویوں سے کس طرح انسپائر ہوتے ہیں۔ ہر شخص کسی نہ کسی حد تک رومانٹک ہوتا ہے حسن فطرت کے دلکش سرسبز نظارے سب کی نظر کو بھاتے ہیں۔ ہنستے کھیلتے پھول سے بچے کسے برے لگتے ہیں۔ خوبصورتی سے سجا بنا خوشگوار ماحول کس کو اچھا نہیں لگتا۔ یہ فطری حساسیت چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں اور رویوں کو محسوس کرنے سے پتا چلتی ہے۔ کیا آپ کے پرخلوص دوست کا محبت بھرا ایک جملہ ایک مسکراہٹ ایک چھوٹا سا تحفہ آپ کے دل میں روشنی نہیں بھر دیتا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر سمجھ لیجیے وہ شخص پیدائشی طور پر "دل" سے محروم رہا ہوگا۔

اگر احساس کی لطیف شدتیں رومینٹک ہونے کے الزام سے منسلک ہیں تو ہاں میں رومینٹک ہوں۔"

اس نے اس کی بے پروائی سے استعمال کی گئی رومینٹک کی اصطلاح پر اتنا لمبا چوڑا وضاحتی بیان داغا کہ فی الواقع زرگل کہہ کر اب پچھتا رہی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ موصوف اس ضمن میں مقالہ پیش کر دیں گے ورنہ احتیاط کرتی۔

"معاف کر دیجیے بھول گئی تھی کہ اخبار والے خود کو برحق ثابت کرنے کے لیے پاتال کھنگال ڈالتے ہیں۔"

وہ پیشانی پر ہاتھ رکھ کر جان چھڑانے والے انداز میں کہہ کر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ پانچ بجنے کو تھے۔

اس کا ٹائم ختم ہوگیا تھا۔ دیر ہو جاتی تو۔ خوامخواہ حارث کا پارہ چڑھنے لگتا تھا۔ کہتا کچھ نہیں تھا اس کو۔ بس چیزوں کی شامت آجاتی یا خوامخواہی ماہ گل اور احمد پر برس پڑتا۔

"حق تو پھر بھی تسلیم کرتے ہیں لوگ۔" وہ دزدیدہ نگاہ ڈال کر معنی خیزی سے بولا اور اس کے ساتھ ہی باہر چلا گیا۔

"کاغذی ثبوت تو نہیں دکھا سکتا البتہ حلف اٹھا سکتا ہوں تمہاری تسلی کے لیے یہ گاڑی "صحافتی کمائی" سے نہیں والد صاحب کی کمائی سے خریدی گئی ہے۔ پیٹرول البتہ اپنی جیب سے ڈالتا ہوں مگر اتنا تو معاف ہوسکتا ہے ناں۔ آؤ تمہیں گھر چھوڑ دوں۔"

ٹھنڈے سایہ دار درخت کے نیچے کھڑی اپنی چمکتی دمکتی نسان سنی کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ قریب سے گزر کر فٹ پاتھ پر قدم رکھتی زرگل سے مخاطب ہوا تھا۔

"شکریہ۔" اس نے کچھ توجہ نہ کی۔ بے تاثر لہجے میں جواب دے کر آگے بڑھ گئی۔ اجلال نے کچھ لمحے کو جاتی زرگل کی پشت پر نظر جما کر کچھ سوچا' پھر سر جھٹک کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

زرگل کو خوش قسمتی سے جلد ہی ویگن اسٹاپ سے گاڑی مل گئی۔ گھر کے پاس ہی اسٹاپ پر اتری تو شام ڈھل رہی تھی۔

"زر! وہ۔ وہ گل ناز۔" جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی۔ پچھاڑیں کھاتی شائستہ بیگم کی ردی حالت دیکھ کر اس کے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی۔

"کیا ہوا آپی کو؟" اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ دل کسی اندیشے تلے دبا دھک دھک کرنے لگا تھا۔

"الٰہی! کون سی آزمائش ٹوٹی ہے اب کے۔"

مئی کا نرم گرم مہینہ تھا۔ دوپہریں سنسان ہونے لگی تھیں۔ لوگ دوپہر کو لمبی تان کے سوتے تھے کہ اب دن ڈھلنے میں بہت وقت لگتا تھا۔ شائستہ کی بھی آنکھ لگ گئی۔ گلناز اپنے دھیان میں باہر کے دروازے کے سامنے بنی سیمنٹ کی سیڑھی پر آن بیٹھی تھی۔

"یہی ہے ناں حارث کا گھر۔ اور یہ لڑکی بھی غالباً اسی گھر کی لگتی ہے۔" رؤف علی گاڑی میں اپنے ہمراہ نامی گرامی غنڈوں کو بھی لایا تھا۔

"ہاں استاد! لگتا تو یہی ہے۔ شاید بہن یا بیوی ہوگی۔"

پچیس چھبیس سال کی بھرپور لڑکی گلابی لان کے کپڑوں میں دوپٹے سے قطعی بے نیاز اپنے لمبے

ریشمی بالوں کو پھیلائے مگن سی ان سے کھیل رہی تھی ہونٹوں پر رسیلی مسکراہٹ تھی۔

یہ لڑکی حارث کے گھر کی تھی۔ رؤف علی کچھ دیر مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچوں کے تانے بانے بنتا رہا پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ دو آدمی اترے۔ انہوں نے گلناز کو بازو سے پکڑا اور جیپ کی طرف لے آئے۔

وہ معصوم کیا جانتی تھی' اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ہنستی ہوئے بلاچون وچرا گاڑی میں بیٹھ گئی۔

رؤف علی غنڈوں کو حارث کے گھر لوٹ مار کروانے کے لیے لایا تھا مگر گلناز کو دیکھ کر ارادہ بدل دیا۔ جو چیز وہ اس کے گھر سے لوٹ کر لے جا رہا تھا وہ روپے پیسے اور زیورات سے کہیں زیادہ قیمتی تھی۔ اس سے اچھا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ انتقام لینے کے لیے۔

گاڑی ایک دھچکے سے آگے بڑھ چکی تھی۔ اس کا رخ گیسٹ ہاؤس کی طرف تھا۔ جہاں وہ کمرا بک کروا چکا تھا۔

حارث کو اطلاع مل گئی تھی۔ آج وہ سابق چیف سیکریٹری صاحب دوبارہ ''موج میلہ'' کرنے کے لیے کمرا بک کروا چکے ہیں۔ حارث پہلے سے موجود تھا۔ آج وہ جی بھر کے رؤف علی کو زچ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ریسپشنسٹ کو کہہ دیا تھا کہ جیسے ہی عالی حضرات اپنی مہمان کے ہمراہ کمرے کی طرف جائیں مجھے بتا دینا آج وہ کمرا بند ہونے سے پہلے ہی رؤف علی کے روبرو ہو کر اس کو سلگتا چیختا منہ چھپاتا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ نظر بچا کر گیسٹ ہاؤس کے پچھلے اسٹور میں جا چھپا تھا۔

کچھ دیر بعد لڑکے نے اسٹور کے دروازہ آہستگی سے بجا کر جائے وقوعہ پر پہنچنے کا اشارہ دیا۔ وہ بے دھڑک نکلا اور لڑکے کے بتائے ہوئے کمرے کا دھاڑ سے دروازہ کھول دیا۔

بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے رؤف علی کو دیکھ کر جیسے اس کی رگ رگ سے چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں۔

''رؤف علی'' ایک وحشیانہ غراہٹ اور غضبناک چنگھاڑ کے ساتھ وہ اس کی طرف لپکا۔ رؤف علی نے صورت حال کا اندازہ لگاتے ہوئے پھرتی سے ریوالور نکال لیا مگر حارث اس سے کہیں زیادہ چوکنا نکلا۔ اس نے گلناز پر پہلی نگاہ پڑتے ہی اپنا اعشاریہ بتیس بور کا پستول نکال لیا تھا۔ رؤف علی کو مہلت ہی نہ مل سکی۔

ٹھائیں ٹھائیں ٹھائیں

تین گولیاں شعلوں کی طرح رؤف علی کے وجود کو ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر گئی تھیں۔ آواز نہ صرف

ٹ ہاؤس بلکہ اس کے اردگرد کے رہائشی مکانات میں بھی گونجی تھی۔ ایک افراتفری سی مچ گئی۔

حارث رکا نہیں تھا۔ برق کی سی تیزی سے گلناز کو کندھے پر لاد کر کے باہر گاڑی میں ڈالا۔ اور آندھی فان کی طرح اپنی ایف ایکس اڑاتا گھر پہنچا۔ گلناز کو گیٹ سے اندر دھکیل کر اسی اندھا دھند انداز میں ڑی بھگاتا وہ بڑھتا چلا گیا تھا۔

اس نے چھپنے کی کافی کوشش کی۔ مگر دو روز بعد پولیس اس تک پہنچ ہی گئی۔ گواہوں کی کمی نہ تھی۔ عینی ہدین تھے۔ پھر آلہ قتل کی موجودگی اور پوسٹ مارٹم رپورٹ۔ سیدھا سادہ واضح قتل کا کیس تھا۔ وہ رفتار ہو گیا۔ اخبار بھی اس ضمن میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ اس خبر کی تصدیق کے اگلے روز چیف ایڈیٹر ہدایت پر اخبار میں یہ خبر لگا دی گئی تھی کہ حارث ابراہیم کا اس اخبار سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ وہ یہ جاب وڑ چکے ہیں لہٰذا وہ ادارے کے ملازم نہیں ہیں۔ اخبار کی ریپوٹیشن کا مسئلہ تھا اس لیے چیف ایڈیٹر نے مت عملی اپنائی تھی۔

بے زمین لوگوں کو
بے قرار آنکھوں کو
بدنصیب قدموں کو
جس طرف بھی لے جائیں
راستوں کی مرضی ہے
بے نشان جزیروں پر
بدگمان شہروں میں
بے زباں مسافر کو
جس طرف بھی بھٹکا دیں
راستوں کی مرضی ہے
روک لیں' یا بڑھنے دیں
تھام لیں' یا گرنے دیں
وصل کی لکیروں کو
توڑ دیں یا ملنے دیں

راستوں کی مرضی ہے

اجنبی کوئی لا کر ہمسفر بنا ڈالیں

ساتھ چلنے والوں کی راکھ بھی اڑا ڈالیں

یا مسافتیں ساری

خاک میں ملا ڈالیں

یہ نظم جیسے اس گھر کی تقدیر کے اوپر ہی لکھی گئی تھی جہاں من کی مرضی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا پہلے باپ پھر بھائی اور پھر تقدیر کی غلامی۔ گھر والوں کا کردار تو بے جان مہروں اور خاموش تماشائیوں سے زیادہ اور کچھ نہیں رہا تھا۔

"امی! پلیز دوا لے لیں۔" وہ بہت نرمی سے ماں پر جھکی تھی جو تین دن تک ہوش و حواس کی دنیا سے غافل رہی تھیں۔ غنودگی سے لمحاتی طور پر جاگتیں تو پہلی پکار حارث کے لیے ہی لبوں پر مچلتی تھی۔

مگر وہ اب یہاں کہاں۔ وہ تو سلاخوں کے پیچھے تھا۔ وقت سے دولت و طاقت چھین لینے کے چکروں میں عمر کا سودا کر بیٹھا تھا۔

"کیا کروں گی دوا کھا کر؟" انہوں نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی اور بے زار کن لہجے میں بولیں۔

"لے جا اپنی اس دوا کو۔ زہر لا دے تھوڑا سا میرے لیے۔"

"امی! کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپ کو کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا بنے گا۔ کیا ہم آپ کے کچھ نہیں لگتے؟" اس نے بہت دکھ سے ماں کا نچڑا ہوا خزاں رسیدہ چہرہ دیکھا تھا۔ اندر کہیں غم کے بھالے سے اتر رہے تھے۔ شائستہ نے ایک دم آنکھیں کھول دیں پھر مضطرب سے تھکے تھکے انداز میں ہولے سے اٹھ بیٹھیں۔ سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"گلناز کہاں ہے زر؟" انہوں نے یکلخت ہراساں ہو کر بیٹی کا چہرہ دیکھا تھا۔

"کمرے میں ہے۔ دروازہ لاک کر دیا ہے میں نے۔" اس نے ماں کو اطمینان دلاتے ہوئے دوا پلائی۔ شائستہ کے چہرے پر کرب کی لکیریں بننے لگیں۔

"یا خدا! اتنی کڑی آزمائش۔ ہم تو پہلے ہی کانچ پہ لوٹتے ہیں۔ مخمل تو پہلے بھی قدموں تلے نہیں ہوتا تھا مگر اب کے تو نے انگارے ہی بچھا ڈالے۔ قدموں میں بھی اور پہلو میں بھی۔"

وہ ضبط نہ کر سکیں تو دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگیں۔ اپنے کڑیل جوان بیٹے کی بربادی کا منظر بھولتا ہی نہ تھا۔

زرگل ان کے قریب بیٹھ گئی اور ہولے ہولے جسم دبانے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا تسلی کے لیے کن الفاظ کا سہارا لے۔

"امی! بھائی نے خود اپنے اعمال کی بدولت یہ انجام مول لیا ہے۔ کتنا کہتی تھی میں ان سے اور آپ نے بھی تو نہیں روکا انہیں۔ دوسروں کی عزتیں اچھالنے کے شوق میں اپنی عزت گنوا بیٹھے۔"

"مت کر اس طرح کی باتیں۔ میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔" وہ بے بسی سے بصد منت بولیں۔

"وہ سچ ہی چھاپتا تھا۔ کیا بگاڑا تھا کسی کا اس نے۔" وہ ماں تھیں۔ ماں جو اولاد کی ہر بری بھلی کو ممتا کی عینک لگا کے دیکھتی ہے۔

"دکھ تو یہی ہے۔ خریدا ہوا سچ چھاپنے اور بنایا ہوا جھوٹ بیچنے کا دھندا ان کے نزدیک پیشہ تھا۔ پیسے لے کر بولا ہوا سچ اور نہ بولا ہوا سچ دونوں ہی نیکی سے خارج ہو جاتے ہیں۔ ایک کا پیسہ لے کر چھاپ دیتے تھے اور ایک سے پیسہ لے کر دبا جاتے تھے۔ ان کا مسئلہ سچائی کی اشاعت نہیں تھا پیسے کی مقدار سے وابستہ تھا۔ ڈیمانڈ سے کم ہوتا تو خبر لگا دیتے تھے اور زیادہ ہوتا تو خبر دبا جاتے تھے۔ اس پیشے کے تقدس کو پامال کر ڈالا تھا۔ دوسروں کی ٹوہ میں رہنا اور ان کی ذات کے انتہائی حساس اور پس پردہ حقائق کو سر عام اچھالنا تو ہمارے مذہب میں بھی جائز نہیں ہے۔ پھر وہ کون سی صحافت کر رہے تھے۔ بلیک میلنگ کی صحافت۔ اپنے پیشے اور اختیار کا ناجائز اور منفی استعمال اسی انجام پر منتج ہونا تھا۔"

"کیسی بہن ہو۔ بھائی سولی پہ لٹکنے کو ہے اور تمہیں وعظ سوجھ رہے ہیں۔" شائستہ اس کی سچی کھری باتیں برداشت نہ کر سکیں۔ جل کر بول پڑیں۔

"مجھے نہیں پتا کہ اچھا اور کیا برا۔ میرا بیٹا میرا چاند۔ میری جان جیل میں ہے۔ ہر گزرتا دن اسے پھندے کے قریب کر رہا ہے اور زندگی سے دور۔ ہائے اللہ میں کیا کروں۔ مالک مجھے حوصلہ دے۔ مر جاؤں گی میں۔ اب نہیں سہارا مجھ میں۔" وہ بلکنے لگیں۔

زرگل کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ پہاڑ جتنا حوصلہ اور برداشت رکھنے والی ماں رو رہی تھی مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ وہ خود بھی بے بس تھی۔ حارث کے اخبار کے چیف ایڈیٹر نے اسے جاب سے الگ کر کے ہر تعلق ختم کر لیا تھا۔ خاندان کا کوئی بندہ اس شہر میں نہیں رہتا تھا۔ سب دوسرے شہروں میں تھے اور کسی کو پتا بھی چلا تھا تو حال پوچھنے کے لیے نہیں آیا تھا۔

قتل عمد کا کیس تھا اور مجرم جرم کا اعتراف کر چکا تھا۔ عینی شاہدوں کے بیان کے مطابق قاتل کی

تصدیق ہو چکی تھی۔ ایسے میں کوئی وکیل بھی اتنا کمزور کیس لڑنے کے لیے آمادہ نہ ہوتا۔ عدالت کی طرف سے متعین کردہ وکیل صفائی کا انداز اس قدر ڈھیلا اور رسمی تھا کہ وکیل استغاثہ نے پہلے دور میں ہی اس ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ کچھ دن ہی رہتے تھے فیصلہ ہونے کو۔ اور اس متوقع لرزہ خیز فیصلے کے تصور مضبوط اور بلند حوصلہ شائستہ کو توڑ ڈالا۔ وہ بستر پر ڈھے ہو گئیں۔ آج تیسرے دن ان کی حالت کچھ سنبھ تھی۔

"امی! آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک ہے تو میں گلی والے جنرل اسٹور سے سودا سلف لے آؤں۔"

"تم جاؤ گی؟" وہ ایک دم ٹھٹک کر رہ گئیں۔ انداز میں تذبذب تھا۔

"اور کس نے جانا ہے اب۔ احمد چھوٹے موٹے سودے تو لے آتا ہے مگر گھر کی دوسری چیزیں کچن کا سامان کیسے لائے گا۔ اسے کچھ علم ہی نہیں ہے۔"

"یہ نوبت آ گئی ہے۔" انہوں نے سرد آہ بھری۔

"کبھی تمہارے باپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا۔ وہ بیٹیوں کو گھر کے کھلے آنگن میں نہیں دیتا تھا۔ مبادا کسی کی نظر نہ پڑ جائے اور تمہارا بھائی ہوتا تو قیامت تک تمہیں بازار میں قدم رکھنے کی اجازت نہ دیتا۔ زمین آسمان ایک کر ڈالتا۔ تم کیسے خرید کے لاؤ گی سودا۔ تمہیں تو کچھ تجربہ بھی ہے۔"

زرگل کے چہرے پر ایک دکھ بھری استہزائیہ کیفیت رقم ہو گئی۔

"وقت ہر کام سکھا دیتا ہے امی۔ کاش ابو جی نے ہمیں اعتماد بھری فضا میں سانس لینے کا موقع دیا ہوتا تو آج آپ کو یہ دھڑکے نہ لگے ہوتے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ہر کام کرنے دیا جائے مگر اتنا ضرور ہے کہ ہر طرح کے ماحول میں ہر قسم کی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے والدین کو بچے کو سیکھنے کا بھرپور موقع دینا چاہیے کہ کیا خبر زندگی کے کس موڑ پر اس ہنر کی ضرورت پڑ جائے۔ کاش انہوں نے ہمیں انسانوں کی دنیا میں رہ کر ان سے ربط ضبط بڑھانے کا موقع دیا ہوتا تو آج ہم اپنے ہی سائے سے اتنا بدگمان نہ ہوتے۔ دھڑکوں میں زندگی نہ گزارتے۔ اکیلے اس صدمے کو نہ سہہ رہے ہوتے۔ ہمارا بھی کوئی غمگسار ہوتا۔ کوئی دلاسا دینے والا' تعاون کرنے والا' حوصلہ بڑھانے والا ہمارے پاس موجود ہوتا۔ بدنصیب ہیں ہم کہ ہمارے ہمسائے تک ہم پہ ٹوٹنے والی قیامت پر پرسہ دینے نہیں آئے۔ کسی۔ کے رکھی ہوتی تو آج یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔"

وہ متاسف لہجے میں کہتی ہوئی تھیلا اٹھا کر ماہ گل کو دروازہ بند کرنے کی ہدایت کرتی ہوئی باہر نکل

"آہا۔ آیئے جناب۔ تشریف لائیں۔" شفیع جنرل اسٹور پر پہنچی تو اسے دیکھتے ہی اس کا مالک شفیع محمد لپک کر گرم جوشی سے خیر مقدم کے لیے آگے بڑھا تھا۔

وہ سر ہلاتی ہوئی اسٹور میں داخل ہو گئی اور اپنی مطلوبہ خریداری کرنے لگی۔ آج دوسری بار وہ یہاں آئی تھی۔ پہلی بار پرسوں احمد کو ساتھ لے آئی تھی۔ یہ جنرل اسٹور گھر سے کچھ فاصلے پر تھا سو ویگن اسٹاپ تک جاتے ہوئے راستے میں ہی پڑتا تھا۔ اس سے پہلے کبھی اس نے اس طرف توجہ ہی نہ دی تھی کہ کبھی ضرورت ہی نہ پیش آئی تھی۔ حارث اکٹھے ہی پندرہ دن کا سودا سلف لے آتا تھا۔ زرگل کے آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر اب تو جیسے اس کے پیر میں پہیے لگ گئے تھے۔ شکر تھا جاب کے دوران کا اعتماد اور راستوں سے شناسائی آج کام آ رہی تھی۔ وہی ماں کو لے کر پنڈی اڈیالہ جیل میں حارث سے ملوانے کے لیے لے جاتی تھی۔

"اور کیسی ہیں آپ؟" ادھیڑ عمر' پکی رنگت کا' [illegible]رے فربہی مائل اڑے اڑے بالوں والا شفیع محمد خوش اخلاقی کے مظاہرے کے طور پر اس کی طرف چلا آیا تھا۔ اتفاق سے اسٹور میں رش نہیں تھا۔ کاؤنٹر پر اس کا اسسٹنٹ بیٹھ گیا تھا۔

"بس جی اللہ کا شکر ہے۔" وہ چائے کی پتی کا ڈبا ریک سے اٹھاتی ہوئی اپنے مخصوص سرسری لہجے میں بولی تھی۔

"کیا کرتی ہیں' پڑھتی ہیں کیا؟ میں نے اکثر آپ کو یہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔" اس نے دلچسپی سے پوچھتے ہوئے جواز بھی بتا دیا۔

"نہیں جاب کرتی ہوں۔" وہ چنے کی دال والا جار ڈھونڈنے کے لیے متلاشی نگاہ ادھر ادھر دوڑاتی بے دھیانی سے جواب دے رہی تھی۔ پھر شفیع محمد نے اسی با اخلاق اور پرشوق انداز میں بہن بھائیوں کی تعداد پوچھ ڈالی۔ یہ بھی تصدیق کروالی کہ اکثر گلی میں دکھائی دینے والی پاگل سی لڑکی اس کی بہن ہے۔

"زندگی کے مسائل انسان کو چین سکون سے رہنے ہی نہیں دیتے۔ مگر کیا کریں کہ زندگی بھی تو گزارنا ہے بہرحال۔" وہ اسی بے دھیانی سے مروت بھرے انداز میں کہہ کر دیسی صابن کی ٹکیا اٹھانے لگی۔ اس کی تمام تر توجہ شاپنگ کی طرف تھی۔ سامان گھر لے جا کر اسے امی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔ پھر شام کو کپڑے دھونے تھے۔ تین دن سے وہ امن گاہ نہیں جا رہی تھی مگر کل تو بہرحال جانا ہی تھا۔ اس سے زیادہ چھٹی نہیں لے سکتی تھی۔

"اس اسٹور کے بالکل ساتھ سیاہ گیٹ والا مکان میرا گھر ہے۔ میں یہیں رہتا ہوں۔ اکیلا ہوں۔

ماں باپ تو کب کے وفات پا چکے۔ بہن بھائی اپنے اپنے گھر کے ہو گئے۔ بیوی تھی جس کا دو سال پہلے انتقال ہو گیا۔ اب بالکل اکیلا ہوں اور بہت دکھی ہوں۔''

''ہاں جی تنہائی بھی ایک بڑا دکھ ہے۔'' شفیع محمد کے ٹھنڈی یخ بستہ آہیں بھرنے پر اسے مروت میں کچھ تو کہنا تھا۔

''اور یہ تنہائی انسان کب تک برداشت کرے کبھی دل چاہتا ہے کہ کوئی ہو جو بہت نرمی اور محبت سے دل کی باتیں سنے۔ دکھ سکھ میں ساتھ دے۔ یہ تنہائی بہت ستاتی ہے مجھے۔''

پھر اس کے چہرے پر نگاہ ڈال کر مخاطب ہوا۔

''سارے دن کی تھکن اور بور روٹین بندے کے اندر سے سکون نچوڑ لیتی ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں اور آپ کا دل چاہے تو کچھ دیر کو میرے پاس آ جایا کریں۔ پاس ہی تو گھر ہے میرا۔ بیٹھ کے اچھی سے مووی دیکھ لی' چائے پی لی' تھوڑی سے گپ شپ بھی ہو جائے گی اور تھکن بھی اتر جائے گی۔ آپ کو کسی قسم کی ضرورت ہو' کوئی کام ہو' مسئلہ ہو تو مجھ سے کہیں بندہ ہی بندے کے کام آتا ہے۔''

سامان کے لفافے سمیٹتی زرگل کو ایک جھٹکا سا لگا۔

زرگل نے ایک بہت تلخ اور استہزائیہ نگاہ اس پر ڈالی اور سر جھٹک کر کاؤنٹر پر حساب کتاب کرنے آ گئی۔

''بوجھ زیادہ ہے۔ کہیں تو چھوٹے کو کہہ دوں وہ سامان گھر تک پہنچا دے گا۔'' وہ بڑی اپنائیت سے گویا ہوا تھا۔

''نہیں۔ شکریہ۔ میں اپنا بوجھ خود اٹھا سکتی ہوں۔'' اس نے بالکل کھردرے سپاٹ انداز میں دوٹوک جواب دیا اور تیزی سے تھیلا سنبھالتی ہوئی موڑ مڑ گئی تھی۔

''میں نے بہت کوشش کی حارث کے سلسلے میں مگر بات نہیں بن سکی۔ میرے ایک جاننے والے وکیل دوست کے ساتھ کافی ڈسکشن ہوئی اس نے کیس کا جائزہ لے کر اسے ہوپ لیس قرار دے دیا تھا۔ افسوس کہ ہم حارث کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ میری تو خواہش تھی بڑے سے بڑا وکیل کروا کے حارث کی گردن چھڑائی جا سکے مگر تقدیر نے ساتھ ہی نہیں دیا حارث کا۔ جس دوست کے ساتھ میری بات ہوئی تھی وہ ہائی کورٹ کا بہت مشہور اور منجھا ہوا تجربہ کار وکیل ہے۔'' وہ امن گاہ آئی تو حسب سابق اجلال سے ٹاکرا ہو گیا۔

وہ حارث کے متعلق پوچھتا ہوا فکر مندانہ لہجے میں اپنی کوشش اور ان کا مایوس کن نتیجہ سنا رہا تھا۔

''اچھا۔'' وہ مختصراً بولی۔ اس کی نظر اور لہجے سے اجلال کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ وہ اسے اس کی ''لفاظی'' اور ''دھاوا'' سمجھ کر طنزاً کہہ رہی ہے۔ مگر اجلال نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی نہ سچائی کے ثبوت کے طور پر مزید کوئی بحث کی۔ اس سے گھر والوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ وہ ٹال مٹول کے سے بے دھیان اور لاپرواہ انداز میں حسب سابق مختصراً بتانے لگی۔ آج وہ پہلے کی نسبت خاصا سنجیدہ تھا۔

''اور تم یہاں سیٹ ہو ناں۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے ناں۔''

''مسئلہ کیا ہونا ہے۔ گزارا چل ہی رہا ہے۔'' وہ بمشکل تمام بے زاری چھپا کر آہستگی سے بولی۔ اجلال کو جانے کیا بات یاد آئی تھی جو وہ جاتے جاتے ایک دم پلٹ آیا تھا۔ اس کے لہجے میں کوئی بات تھی جو اس نے نہیں بتائی تھی مگر زرگل کے دل میں کھٹک رہی تھی۔ وہ خواہش کے باوجود پوچھنا گوارا نہ کر سکی۔ تھوڑی دیر بعد سوچ میں گم اجلال خود ہی بولنے لگا۔

''زرگل! میرا خیال ہے' تم یہ جاب چھوڑ دو۔'' اجلال نے شاید پہلی مرتبہ اسے باقاعدہ نام لے کر اتنے سنجیدہ بلکہ متفکر سے فیصلہ کن انداز میں مخاطب کیا تھا۔

''کیسے چھوڑ دوں۔ کیا ڈھیر لگا ہوا ہے باہر؟'' وہ تیوریاں چڑھا کر برہمی سے اسے گھورنے لگی۔ انداز میں تلخی تھی۔

''ناظمہ بڑے عرصے سے حارث سے بدلہ لینے کے منصوبے بنا رہی ہے۔ اور اب جبکہ اسے خبر ہو چکی ہے کہ حارث جیل میں ہے وہ زیادہ آزادی اور جوش سے حارث کے گھر والوں سے...... اور پھر وہ تمہارے بارے میں جانتی ہے۔''

وہ بات ادھوری چھوڑ کر مضطرب لہجے میں بولا۔ زرگل نے کچھ خاص اہمیت نہیں دی اس کی بات کو۔

''میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟''

''تم نے نہ سہی حارث نے اس کا خاصا نقصان کیا ہے۔ شوبز میں اس کا مقام بن گیا تھا۔ عنقریب فلم لائن میں جگہ ملنے والی تھی مگر اس اسکینڈل کی وجہ سے اس کی شہرت اور مقبولیت داغدار ہو گئی ہے۔ ہر چند کہ سبھی جانتے ہیں اس فیلڈ میں کوئی پاک دامن نہیں پائی جاتی مگر یہ سب کچھ پس پردہ ہوتا ہے اپنی پارسائی کا بھرم سبھی کو عزیز ہوتا ہے۔ عوام کی نظروں میں معصومیت کا ڈرامہ رچائے رکھنا ہوتا ہے تاکہ سر آنکھوں پہ بٹھائی جاتی رہیں۔ وہ پہلے بھی دھندا کرتی تھی اور اب بھی کر رہی ہے مگر عوامی سطح پر رؤف علی

سے میل ملاپ کے کھلم کھلا شواہد سامنے آنے پر اس کے ''ان'' رہنے کے چانسز محدود ہو گئے ہیں۔ اس نقصان کا سبب حارث ہے اور ناظمہ اس کی بوٹیاں نوچنے کو بے تاب ہے۔''

ہر چند کہ اجلال کے اندیشے بجا تھے مگر زرگل انہیں اہمیت دینے سے قاصر تھی' وہ یوں بھی اس کی باتوں پر کان دھرنے کی عادی نہیں تھی۔ اسے اس قابل ہی نہیں سمجھتی تھی۔

''کیا کرلے گی وہ؟ اب میرے خلاف تو ایسا اسکینڈل بنانے سے رہی'' زرگل کے بے فکری سے کندھے اچکانے پر اجلال کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''تم انتظار میں رہنا جب وہ ایسا کر گزرے گی۔'' دانت پیستے اور شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے وہ سلگ کر بولا تھا۔

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس ادارے کی سرپرست اعلیٰ بیگم سرفراز رؤف علی کے رشتے کی بہن ہے اور کسی زمانے میں اس کی محبوبہ بھی رہی ہے۔ خاندانی جھگڑے کے باعث دونوں کی شادی نہیں ہوسکی۔ مگر بیگم سرفراز کے دل میں اب بھی اپنے محبوب کے لیے نرم گوشہ ہے۔ وہ انگلینڈ سے پاکستان آ چکی ہے اور اس واقعے کی اطلاع بھی اسے موصول ہوگئی ہے اور ناظمہ کو بیگم سرفراز کی رہائش گاہ پر آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔''

زرگل ایک لمحے کو الجھن میں پڑ گئی۔ اسے لامحالہ معاملے پر سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔

''مگر بیگم سرفراز ایک محب وطن اور ہمدرد دل رکھنے والی سماجی خاتون ہیں۔ وہ اس گورکھ دھندے میں کیوں پڑنے لگیں۔ کم از کم مجھ سے انہیں کیوں پرخاش ہونے لگی۔ وہ کل ادارے میں تشریف لائی تھیں۔ مجھ سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔''

پھر زرگل کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کل جب میڈم سبحانی سے اس کا تعارف کروایا تھا تو بیگم سرفراز کی سرد مہر آنکھیں ایک لمحے کو اس پر ٹک گئی تھیں۔

''اچھا تو آپ ہیں معروف صحافی حارث کی بہن۔'' انہوں نے کچھ چبھتے ہوئے سرد انداز میں اس کا جائزہ لیا تھا۔ اس وقت اس نے غور کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

''اسی لیے تو کہتا ہوں کہ اپنی سوچ کو اوّبجیکٹو اور ریشنل بناؤ۔ ہر شے کو جذبات کی سطحی نظر سے مت پرکھا کرو۔'' اجلال کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

''ان بڑے بڑے سیاسی و سماجی ناموں کی حیثیت کھوکھلے ستونوں سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ خیر میرا فرض تھا تمہیں آگاہ کرنا' آگے تم خود ذمے دار ہو۔ سنو دوستی میں اس قدر سوداگری بھی جرم ہے۔ گو

کہ ہم میں دوستی نہیں مگر ایک تعلق خاطر تو ہے ناں۔ اسی کے پیش نظر میری بات کا یقین کرلو۔ اس میں تمہارا فائدہ ہے۔''

''میں اپنا فائدہ خود بہتر جان سکتی ہوں۔'' اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ بہرحال انفارم کرنے کا شکریہ۔'' وہ کسی طور اس کا احسان لے کر قرض نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے اتنی ڈھٹائی سے حق جماتا ہے۔ ذرا سی مدد لے لی تو سر ہی چڑھ جائے گا۔ پھر اس کی لن ترانیوں پر زرگل کو کوئی خاص یقین بھی نہیں آیا تھا۔

اجلال نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے ایک لمحے بغور اس کا چہرہ جانچا۔ وہی بے نیازی اور نو لفٹ کے تاثرات سے مزین سپاٹ گریزپا چہرہ۔

''مرضی ہے تمہاری۔'' وہ گہری سانس لے کر مزید بحث کیے بغیر چابیاں اٹھاتا اندر میڈم سبحانی کے اسسٹنٹ انعام علی سے ملنے چل دیا۔

زرگل سر جھٹک کر اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ ان دنوں بیگم سرفراز باقاعدگی سے ادارے کی خبر گیری کے لیے آتی تھیں کچھ دنوں سے ناظمہ کا بھی آنا جانا تھا۔ غالباً وہ یہاں رہائش پذیر ہونے کا ارادہ رکھتی تھی حسن اتفاق تھا کہ جب بھی ناظمہ ''امن گاہ'' آتی' اجلال کو کسی نہ کسی طرح خبر ہوجاتی۔ وہ بھی آن ٹپکتا۔ بڑی بے تکلفی اور اپنائیت سے ناظمہ اور بیگم سرفراز سے میل ملاپ کرتا تھا۔

''ہونہہ مجھے جانے کون کون سے جاسوسی' فلمی ''ڈراوائے'' دیے جا رہے تھے' اور خود دونوں سے ایک ساتھ ''نیٹ'' رہا ہے۔ پینگیں بڑھائی جا رہی ہیں۔ بھلا مرد اپنی فطرت بدل سکتا ہے۔ یہ بھی تو بھیا کا ''ہم نوالہ ہم پیالہ'' رہا ہے۔ اپنی اصلیت دکھانا ہی تھی۔''

گزشتہ چند روز سے بیگم سرفراز' زرگل پر خاصی مہربان ہوگئی تھیں۔ اس کے رہے سہے خدشات بھی جاتے رہے۔ انعام علی آج کل بیگم سرفراز کا سایہ بنا ہوا تھا۔ اس روز بیگم سرفراز نے اسے ''امن گاہ'' کے ایک خصوصی کمرے میں بلایا۔ سجاوٹ اور فرنیچر کے اعتبار سے سے بیڈروم ہی لگ رہا تھا' مگر اس کے ایک کونے پر مووی کیمرہ رکھا ہوا تھا۔ سامان کچھ اس طرح کا تھا جیسے کسی فلم کی شوٹنگ کی تیاری ہو رہی ہو۔

''آؤ زرگل۔'' بیگم سرفراز کے بلانے پر اس کے ٹھٹکے ہوئے قدم صوفے کی سمت بڑھ گئے' جہاں وہ براجمان تھیں' ان کے انداز میں نرمی اور مٹھاس تھی۔

''ناظمہ ایک فلم میں کام کر رہی ہے' کچھ شوٹنگ یہاں ہونا تھی۔ ابھی کچھ دیر بعد آئے گی۔ میں نے

بوتیک سے اس کے ڈریسز منگوالیے ہیں۔ میں چاہ رہی تھی تم پہن کر ان کی فٹنگ دیکھ لو' تمہارا اور ناظمہ کا قدوقامت ملتا جلتا ہے۔ اگر فٹنگ ٹھیک نہ ہو تو واپس کر کے دوسرا سائز منگوالیں' وگرنہ عین ٹائم پر مصیبت پڑے گی۔ ناظمہ سے میری بڑی اچھی جان پہچان ہے۔ میں چاہتی ہوں اسے کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہ ہو۔ آفٹر آل وہ میرے ادارے میں رہائش پذیر ہونے والی ہے' کل کو وہ مشہور ہیروئین بن جائے گی' ادارے کا نام روشن کرے گی۔''

''ایک تو ان اعلیٰ ''شخصیات'' کو نام ونمود کی بہت حرص ہوتی ہے۔'' اس کے ذہن میں اجلال کا کہا ہوا فقرہ ٹکرایا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ہنس دی اور بیگم سرفراز کے دوبارہ اصرار پر کپڑے لے کے باتھ روم میں چلی گئی۔ وہ چاہتی تھیں زرگل پہن کر انہیں دکھادے۔

بلیک جارجٹ کے باریک لباس کے ہمراہ شمیز ندارد تھی۔ زرگل نے ہچکچاہٹ کے عالم میں بیگم سرفراز کی توجہ اس سمت دلائی' مگر انہوں نے تسلی سے کہا۔

''یہاں میرے علاوہ اور کون ہے۔ ایک منٹ کو تمہیں پہن کر ہی تو دکھانا ہے۔''

وہ بادل نخواستہ وہ چست اور کافی حد تک قابل اعتراض لباس پہن کر بازو سینے کے گرد لپیٹے جھجکتے ہوئے باتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکلی' اور جیسے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیر چھا گیا۔

بیگم سرفراز غائب تھیں۔ مووی کیمرہ آن تھا' اسکرین روشن تھی اور کمرے میں انعام علی کھڑا تھا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے دوبارہ باتھ روم میں گھسنا چاہا مگر انعام علی تیار تھا۔ زرگل کی نازک کلائی اس کی گرفت میں آگئی' اور وہ اسے کھینچتا ہوا عین کیمرے کے سامنے لے آیا۔

ایک لمحے کو تو اسے اپنے حواس مفلوج ہوتے ہوئے محسوس ہوئے' یوں لگا جیسے وقت قضا آن پہنچا ہو' پھر مزاحمتی توتین مجتمع کرتے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

''یہ کیا چکر ہے'' وہ غرا کر اس پر الٹ پڑی۔

''کچھ بھی نہیں۔'' اس نے بڑی سادگی معصومیت سے زرگل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''دراصل میڈم کے خیال میں تم بڑی قیامت شے ہو۔ اور یہ تو عوام کے ساتھ ظلم ہوگا کہ ایسا فتنہ ساماں حسن پردہ سیمیں پر نمودار ہو کر داد تحسین نہ پا سکے' اسی لیے یہ اہتمام کیا گیا ہے' تمہارا یہ حسن ہمیشہ کے لیے کیمرے کی آنکھ محفوظ کرلے گی۔ پھر یہ نظارہ کیسٹ کی شکل میں گلی گلی میں دیکھا جاسکے گا۔''

زرگل کے اعصاب پر جیسے کوئی بم پھٹا تھا' اسے سماعت میں سائیں سائیں کی آوازیں گونجتی محسوس

ہونے لگیں۔ ایک زبردست قسم کا خوف وہراس ریڑھ کی ہڈی میں سرائیت کر گیا تھا۔ وہ سارا کھیل سمجھ گئی' اس سے انتقام لینے کے لیے یہ کھیل رچایا گیا تھا۔

بیگم سرفراز کے محبوب کی جان لینے والے قاتل سے انتقام پورا ہوجاتا۔

اور ناظمہ شوبز میں ویلیوڈاؤن ہوجانے کا غم حارث کی بہن کی رسوائی کے ذریعے غلط کرسکتی تھی۔

سب خسارے اکیلی اس کی ذات کے لیے تھے۔ وہ بند پنجرے میں پھڑ پھڑانے والے پرندے کی طرح بے بس دکھائی دینے لگی۔ اس کے ذہن میں بچاؤ کی کوئی ترکیب نہیں آرہی تھی۔ زرگل خوف و دہشت کی تصویر بنی تھرتھر کانپتی دیوار سے لگی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ رہی تھی۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی۔

وہ محض چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ جب اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ خود زرگل کو بھی اپنے قدموں پر کھڑا ہونا دشوار ہوگیا۔ انعام علی نے جھٹک کر اپنے اعصاب کی غنودہ کیفیت سے نجات پانے کی کوشش کرتے ہوئے بدستور اس کی جانب پیش قدمی کی' مگر اس کے قدموں میں دم نہیں رہا تھا۔ بالآخر وہ لہرا کر زمین پر آرہا۔ اور اسی ثانیے زرگل بھی گلے پہ ہاتھ رکھے تیورا کر قالین پر گر چکی تھی۔ دونوں ہوش وحواس سے غافل ہوچکے تھے۔ کمرے میں پراسرار سا سکوت طاری تھا۔ مووی کیمرہ ہنوز اپنے کام میں لگا ہوا تھا شام کے چھ بج رہے تھے۔ ''امن گاہ'' پر سکوت طاری تھا۔ بیگم سرفراز' ناظمہ کے ہمراہ کب کی یہاں سے جاچکی تھیں۔ ان کے خیال میں انعام علی کافی تھا' اگلے مرحلے کے لیے۔

اجلال کے کان میں لگے جدید ترین ٹیپ ریکارڈ کے اسپیکر پر جیسے ہی خاموشی چھائی وہ پھرتی سے باتھ روم کے روشن دان کا شیشہ توڑ کر اندر آ گیا۔ اندر کا منظر اس کی توقع کے مطابق تھا۔

دونوں بے ہوش ہوچکے تھے۔

وہ پہلے انعام علی کی سمت بڑھا اور اس کے بازو میں ایک انجکشن لگا دیا۔ اب وہ مزید چھ گھنٹوں کے لیے ہوش وحواس سے بے گانہ ہوچکا تھا۔ پھر وہ مووی کیمرے اور اسکرین کی طرف متوجہ ہوا۔ ریل کھینچ کر ضائع کردی۔ کیمرے کو الٹ پلٹ کے کھول کر اچھی طرح تسلی کرلی کہ ریل کا کوئی پیس باقی تو نہیں رہ گیا۔ ریل ضائع کر کے وہ زرگل کی طرف آیا۔ وہ قالین پر بے ہوش پڑی تھی۔

صوفے پر پڑی اس کی چادر اس پر ڈال کر جگ لے کر اس کے قریب آ گیا' اور پانی کے چھینٹے منہ پر مارنے لگے۔

اس نے کمرے کے باہر کی سمت کھلنے والی کھڑکی کے راستے بے ہوش کردینے والی گیس اندر داخل کی

تھی' اس گیس کے استعمال سے دس پندرہ منٹ کی بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی۔ زیادہ طاقت کی گیس اس لیے نہیں استعمال کر سکتا تھا کہ اس سے انعام علی کے ساتھ ساتھ زر گل کو بھی نقصان پہنچتا۔ کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آ گئی۔ چند لمحے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے ہونے کا یقین کرتی رہی۔ پھر اردگرد کے ماحول پر نظر پڑی اور پھر اجلال کو سامنے پا کر وہ جیسے کرنٹ کھا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

''آ۔ آپ یہاں۔'' اس کے حلق میں کانٹے سے اُگ رہے تھے' یوں لگ رہا تھا' قوتِ گویائی کہیں رکھ کے بھول آئی ہو۔ اس کی نظروں میں بے یقین سا ہراساں استفہام تھا مگر اجلال کا ذہن باہر نکلنے کی تدبیر سوچ رہا تھا۔ وہ بہت محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ نظروں میں اضطرار آمیز ہوشیاری تھی۔

''سوال و جواب بعد میں کر لینا۔ فی الوقت یہاں سے نکلنے کی کرو۔'' وہ چوکنے انداز میں اٹھ کر دروازے تک گیا۔ آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ پھر اس کے قریب آیا۔

''باہر صرف چوکیدار ہے۔ تم اس طرح یہاں سے نکلو جیسے معمول کی طرح جایا کرتی ہو۔ اسے کوئی شبہ نہ ہونے دینا۔ چہرہ نارمل رکھنا۔ اور۔ لباس۔ اسے تو بدل ڈالو۔'' سرگوشی سے کچھ اونچی آواز میں اسے ہدایت دیتے ہوئے معاً اس کی نگاہ اس پر پڑی۔ تو ناگواری سے رخ موڑ کر تیوریاں چڑھا کر کہنے لگا۔

زر گل ابھی تک بے دھیانی میں تھی' جونہی خود پر نگاہ پڑی' کٹ کر رہ گئی۔ جی چاہا شرم سے زمین میں جا سمائے۔ وہ برق کی سی تیزی سے باتھ روم میں گھسی اور اپنا لٹکا ہوا لباس تبدیل کر کے باہر آ کر اپنی چادر لپیٹ لی۔

''میں باتھ روم کے راستے دیوار پھاند کر باہر جاؤں گا۔ تم جیسے ہی گیٹ سے نکل کر بائیں طرف مڑو گی' کونے پر میری نسان کھڑی ہو گی۔ جلدی کرو' اس سے پہلے کہ بیگم سرفراز صورت حال جاننے کے لیے اپنا کوئی آدمی بھیج دے' ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

اجلال جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے باہر نکل گیا تھا۔ اور اب گاڑی سے ٹیک لگائے فکر مند نظروں سے ''امن گاہ'' کے گیٹ کی طرف نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ ایک ایک لمحے کی تاخیر اعصاب پر گراں گزر رہی تھی۔ کہیں وہ پھنس نہ گئی ہو۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنے خدشات کو حقیقت سمجھ کر دوبارہ ''امن گاہ'' کی طرف بڑھتا' وہ گیٹ سے نمودار ہوتی دکھائی دی۔ چادر لپیٹے ایک ہاتھ میں پرس تھامے وہ نروس انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ جوں ہی بائیں طرف متلاشی نگاہ دوڑائی' اجلال بے قراری سے ہاتھ ہلاتا ہوا نظر آ گیا۔

فرنٹ سیٹ پر وہ یوں ڈھیر ہوئی تھی' جیسے قدموں میں جان نہ رہی ہو۔

''اس حالت میں گھر جاؤ گی تو گھر والے پریشان ہو جائیں گے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر خود کو ریلیکس کر لو۔'' گاڑی روز اینڈ جسمین گارڈن کے گیٹ وے پر جا کر رکی تھی۔

وہ جیسے خواب کی سی کیفیت میں بے جان قدموں سے اس کے پیچھے چلی آئی۔ وہ اپنے حواسوں میں کہاں تھی' جو اعتراض وانکار کرتی۔

یہ پارک کچھ اس قدر وسیع و عریض تھا اور کچھ ایسے زاویے پر بنایا گیا تھا کہ دور دور تک ویرانہ دکھائی دیتا تھا۔ اکادکا لوگ نظر آ رہے تھے۔

زر گل کو اپنے اڑے اڑے حواس مجتمع کرنے میں بہت دیر لگی۔ وہ دانستہ چپ چاپ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ دانستہ اس کی سمت متوجہ نہیں تھا' اسے خود کو سنبھالنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ جانتا تھا اس وقت خاموشی ہی اسے پرسکون کر سکتی تھی۔

''آپ کو کس طرح خبر ہوئی؟'' بہت دیر بعد اس نے بھیگے ہوئے شکستہ لہجے میں سر جھکا کے پوچھا۔ اب وہ نظریں ملانے کے قابل ہی کہاں رہی تھی۔

''میں نے اسی مقصد کے لیے خاص طور پر ناظمہ سے دوستی بڑھائی تھی' تاکہ ان کے عزائم سے باخبر رہوں۔ شوبز کی تتلیاں جتنی حسین ہوتی ہیں' اتنی ہی عقل سے پیدل اور عاقبت نااندیش ہوتی ہیں۔ انہیں بس داد و ستائش اور مال و متاع سمیٹنے سے غرض ہوتی ہے۔ میرے تعریف کرنے اور میریٹ میں تین روز تک لنچ اور ڈنر کروانے پر وہ خود بخود موم ہو گئی۔ باتوں باتوں میں' میں نے اس سے اگلوا لیا کہ وہ اور بیگم سرفراز کیا ڈراما کھیلنا چاہتی ہیں۔ میں نے موقع پا کر آج صبح ٹیپ ریکارڈ کمرے میں فٹ کر دیا تھا' میڈم کی حرکات و سکنات پر تو کئی دنوں سے نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ ''امن گاہ'' آئی تو اس کے پیچھے پیچھے میں بھی چلا آیا۔ ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے اندر کی صورت حال کا اندازہ ہو گیا تھا۔ موقعہ پا کر میں نے میڈم کے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد بے ہوش کر دینے والی گیس کمرے میں داخل کر دی۔ ویسے تو براہ راست حملہ کر کے بھی انعام علی کو بے دست و پا کر سکتا تھا۔ مگر اس طرح وہ مجھے پہچان لیتا' اور بیگم سرفراز تک بات پہنچنے کے بعد معاملہ سنگین ہو جاتا' اس لیے یہ احتیاط کرنا پڑی باقی صورت حال تو تمہارے سامنے ہے۔''

وہ رسان سے ہلکے پھلکے انداز میں بات مکمل کر کے سگریٹ سلگانے لگا۔

''یہاں کتنا سکون اور تنہائی ہے۔ جیسے برسوں سے بے آباد اور سنسان رہا ہو۔'' وہ اردگرد نگاہ دوڑاتا تبصرہ کر رہا تھا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

''فکر نہیں کرو۔ بیگم سرفراز مزید کچھ نہیں کر سکے گی۔ الٹا اس پراسرار صورت حال پر چکرا کر رہ جائے گی۔ انعام علی کی بے ہوشی۔ مووی کیمرہ کی توڑ پھوڑ اور چوکیدار کی بے خبری پر سمجھ جائے گی کہ تمہارے پیچھے کوئی طاقت ور فورس ہے' جو عین ٹائم پر تمہیں۔ چھڑوا کر لے گئی ہے۔ وہ تصادم سے بچنے کے لیے خاموش رہے گی' اور ناظمہ میں تو ویسے بھی دم خم نہیں ہے' وہ تو بیگم سرفراز کے سہارے اتنی بہادر بنی ہوئی تھی۔ اسے چپ دیکھے گی تو خود بھی پیچھے ہٹ جائے گی۔ مگر بہر حال چند روز تمہیں احتیاط کرنا ہوگی۔''

وہ اس کی خاموشی کو پریشانی پر محمول کرتے ہوئے نرمی سے اس کی تسلی کروا رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ تو طے تھا کہ وہ ''امن گاہ'' میں دوبارہ قدم نہیں رکھے گی۔

''تمہیں جاب کی فکر ہے ناں۔ میں نے اس کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔ میرے ایک دوست کی مسز نے حال ہی میں ایک پرائیویٹ انگلش میڈیم اسکول کھولا ہے' اسے درس و تدریس کے علاوہ انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے ایک پڑھی لکھی اور قابل بھروسا لڑکی کی ضرورت ہے۔ میں نے اس سے تمہارے تجربے اور تعلیمی کارکردگی کا ذکر کیا تھا۔ وہ بخوشی تیار ہوگئی تھی۔ مجھے چونکہ پہلے سے اندازہ تھا اس صورت حال کا' اس لیے اس سے کہہ دیا تھا کہ پوسٹ خالی رکھے۔''

اس کے انداز میں کسی قسم کا احسان' دکھاوا یا ترس بھری ہمدردی نہ تھی۔ بڑے ہلکے پھلکے معمول کے سے رواں نرم انداز میں بتا رہا تھا۔ لہجہ بڑا سادہ اور صاف ستھرا تھا۔ طنز' تمسخر یا تنک مزاجی کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس نے یہ تک نہیں جتایا تھا کہ دیکھو میری بات نہ مان کر کتنے خسارے میں رہی ہو۔ آخر وہی ہوا ناں' جو میں نے کہا تھا۔

''کیا خیال ہے گھر چلیں۔ تمہاری امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ خاصی دیر ہوگئی ہے۔''

وہ اردگرد پھیلتے اندھیرے پہ نگاہ ڈال کر کچھ تشویش بھرے انداز میں کہتے ہوئے اٹھنے کو پر تولنے لگا۔ مغرب کی اذانیں ہو چکی تھیں۔

جواب میں وہی سکوت طاری تھا۔ اجلال نے حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔

''زرگل!'' اس نے پھوار سے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''ارے یار! حوصلہ کرو۔ ہو جاتا ہے ایسا کچھ زندگی میں۔ دل پر مت لو۔ یہ سب ٹھیک ہے۔''

اس نے محض اس کی تشفی کے لیے ہاتھ بڑھا کر ہولے سے اس کا سر تھپتھپایا تھا۔ مگر دوسرے لمحے جیسے پتھر کا ہو کے رہ گیا۔

زرگل جیسے ٹوٹ کر اس کے کندھے سے آ لگی اور پیشانی ٹکا کر کچھ اس طرح پھوٹ پھوٹ کے روئی' کہ وہ امتحان میں پڑ گیا۔

اس نے گھبرا کر چپ کرانے کے لیے کچھ کہنا چاہا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ خاموش ہوگیا۔ اچھا ہے اس طرح اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔ اتنا بڑا غیر متوقع واقعہ ہوا تھا۔ اعصاب پرسکون ہونے میں وقت تو درکار تھا۔ وہ چپ چاپ تسلی کے سے انداز میں اس کا سر سہلاتا رہا۔ ساتھ ساتھ محتاط نظروں سے ادھر ادھر بھی دھیان رکھے ہوئے تھا کسی جاننے والے کی نظر پڑ گئی تو واقعی اشتہار بن جانا تھا۔

بالآخر وہ سنبھل گئی۔ اور آہستگی سے اس سے الگ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اجلال نے بغور اسے دیکھا۔ سرخ گال' سرخ آنکھیں' سرخ ناک' شفق کے ڈوبتے ہوئے الوداعی رنگوں نے اس کے سراپے کو بھی سرخ ارغوانی رنگ میں ڈھانپ لیا تھا۔ وہ اس سے نظریں چرائے ہوئے تھی۔

اجلال بھی خاموشی سے چل پڑا۔ گاڑی میں بھی مکمل سکوت رہا۔ گاڑی مانوس راستوں سے گزرتی ہوئی گھر سے کچھ فاصلے پر ویگن اسٹاپ کے پاس پہنچی ہی تھی' کہ وہ بول پڑی۔

''بس یہیں روک دیں۔'' وہ گھر کے آگے اتر کر اردگرد کے لوگوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ ادھر ہی اتر گئی۔ گاڑی سے اترنے سے پہلے ایک لمحے کو نگاہ اجلال کی سمت ڈالی وہ بھی اس سے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ نگاہوں کا تصادم ہوا وہ کھڑا رہا جب تک وہ اپنے گھر کے دروازے تک نہیں پہنچ گئی

پھر طویل سانس لے کر ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ دل پر ایک بوجھ سا پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔

نیا استری شدہ جوڑا' پسندیدہ قسم کے کھانے ٹفن میں بھر کر اسے شاپنگ بیگ میں ڈال کر وہ بڑی ترنگ سے دروازے کی طرف بڑھی تھیں' جب زرگل نے جھپٹ کر ان کا راستہ روکا تھا۔

''امی! کہاں جا رہی ہیں آپ؟'' لہجہ سراسیمہ اور خوف وہراس میں ڈوبا ہوا تھا۔

''کہاں جاؤں گی اپنے بیٹے کے پاس جا رہی ہوں۔ اسے کھانا دینے۔ وہ بھوکا ہوگا ناں۔ جیل میں ڈھنگ کا کھانا کہاں نصیب ہوتا ہے۔'' وہ تنک کر بولیں۔

''بھیا! اب جیل میں نہیں ہیں امی!۔ پلیز اندر آ جائیں۔'' وہ سسکیاں روکتے ہوئے بھرائے ہوئے

لہجے میں ماں کے ہاتھ سے ٹفن پکڑنے لگی، مگر انہوں نے ڈانٹ کر اس کے ہاتھ سے ٹفن دوبارہ کھینچ لیا۔

"لڑکی تیرا دماغ تو نہیں چل گیا۔ میرا بیٹا ادھر بھوکا بیٹھا ہوگا۔ میرے انتظار میں ہوگا اور تجھے اٹھکیلیاں سوجھ رہی ہیں۔ میں نے دو کمبل بھی ساتھ لے لیے ہیں۔ جیل کی کوٹھری کی زمین کتنی سخت ہوتی ہے، پتا نہیں میرے بچے کو نیند بھی آتی ہوگی یا نہیں۔" وہ بڑے تفکر سے آہ بھرتے ہوئے کہہ رہی تھیں، انداز میں ممتا کی تڑپ چھلک رہی تھی۔

ماں کی یہ حالت اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی کلیجے میں چھید ڈال رہی تھی۔ حارث کو پھانسی لگے پانچ دن گزر چکے تھے۔ مگر شائستہ کی حالت سنبھل کے نہیں دے رہی تھی۔

"امی! چلیں۔ اندر آئیں، میں آپ کو حارث بھائی کی تصویریں دکھاتی ہوں۔" وہ انہیں بمشکل تمام بازوؤں میں بھر کر اندر لے جانے کی سعی کرنے لگی، انہوں نے اس کو جھٹک دیا۔

"تصویریں کیوں، میں اپنے بیٹے کو دیکھوں گی۔ اپنی آنکھوں سے۔" انہوں نے تڑپ کر کہا اور شعلہ برساتی نظروں سے اسے گھورنے لگیں۔ "کیوں بار بار میری راہ میں آ رہی ہے تو۔ چل اندر بیٹھ اور کنڈی لگا لے۔ میں حارث کو دیکھ کر ابھی آتی ہوں۔"

"امی! وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔" وہ بلک بلک کر رو دی۔ اور ماں سے لپٹ کر دھاڑیں مارنے لگی۔ یوں لگ رہا تھا کہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ شائستہ کی پر جوش کیفیت اس کی سسکیوں سے ہولے ہولے سرد پڑنے لگی۔ ان کے اعصاب ڈھیلے ہو گئے۔

"حارث یہاں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے۔" انہوں نے خواب کی سی کیفیت میں سوال کیا۔ اس سوال نے جیسے اس کے کلیجے پر گھونسا برسا دیا۔

"امی۔ امی۔ امی۔ وہ" اور پھر اسے خود پر قابو نہ رہا۔ لفظوں نے زبان کے ساتھ چھوڑ دیا اور حواس ضبط کا درس بھولنے لگے۔ شائستہ نے ایک لمحے کو حیرانی سے بلکتی سسکتی بیٹی کو دیکھا۔

"تو کیوں پریشان ہے، بتا ناں مجھے، کیا ہوا میرے حارث کو۔ میرے چاند کو۔" وہ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بے قراری سے پوچھ رہی تھیں۔

"باپ سے ناراض رہتا تھا۔ اسی لیے کبھی گھر بھی نہیں آتا تھا۔ کہیں وہ اب ہم سے تو ناراض نہیں ہو گیا؟" وہ خود کلامی کے سے انداز میں مضطربانہ بیٹی کا سر تھپکتے ہوئے پرسوچ انداز میں کہہ رہی تھیں۔

"امی! حارث بھیا اس دنیا سے جا چکے ہیں۔" اس کی چیخیں نکل گئی تھیں۔

"کیا بکتی ہو تم۔" انہوں نے ایک دم اسے اپنے سے علیحدہ کرتے ہوئے تڑپ کر کہا۔ چہرے پر

ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ جیسے وہ یقین و بے یقینی کے گرداب میں پھنس کر رہ گئی تھیں۔ وہ پھر ماں سے لپٹ گئی اور پھر۔

وہ لرزہ خیز حقیقت شائستہ پر آشکار ہو ہی گئی۔

"حارث! میرے بچے! میری جان" ان کی دھاڑیں، آہیں اور پکاریں آسمان کا کلیجہ شق کرنے لگیں۔ پاس پڑوس سے لوگ آ گئے۔ کچھ خواتین نے مل کر انہیں سنبھالا۔

بستر پر لٹایا اور پانی وغیرہ پلا کر حوصلہ دلاسا دینے لگیں اور زرگل بے جان سے انداز میں آنگن میں لگے نیم کے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر ڈھے گئی اور دونوں گھٹنوں میں منہ چھپا کر سیل غم اشکوں کی صورت میں بہانے لگی۔

کوئی معمولی واقعہ تو نہ تھا۔ کڑیل جوان بھائی پھانسی کے پھندے سے گزر کر ان سے بہت دور جا چکا تھا کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔ ہمیشہ کے لیے، بے سائبانی عطا کر کے، پہلے وہ جیل میں تھا تو کچھ سہارا تھا۔ یہ تسلی تھی کہ وہ زندہ ہے۔ نگاہ کے سامنے ہے مگر اب۔ اف یہ ظالم دور۔ یہ غم۔ یہ اضطراب۔

درد گر آدمی ہوتا
تو گریباں پکڑ کر کہتے اُسے
اس طرح کرتے ہیں لاچاروں سے؟
اس طرح رہتے ہیں بے چین دلوں کے اندر؟
دل میں رہنا ہے تو کچھ ٹھیک سے رہنا سیکھو
ہم تمہیں سہتے ہیں کچھ تم بھی تو سہنا سیکھو
ایک تھوڑی سی خوشی آئے تو جل جاتے ہو
درد گر آدمی ہوتا۔

پھر وحشتوں، کٹھنائیوں کا ایک سلسلہ سا چل نکلا۔

زرگل پہلے پہل تو خوف و وحشت سے نڈھال ہو کر گھر میں بند رہی تھی۔

"امن گاہ" میں پیش آنے والے اس روح فرسا واقعے کے بعد اس کا سارا حوصلہ پانی ہو گیا تھا۔ گھر سے باہر پاؤں نکالنے کے خیال سے ہی سانسیں رکنے لگتیں پھر اس کے چار دن بعد حارث کو پھانسی ہو گئی۔ قہر در قہر ٹوٹا تھا۔ ماں ہوش سے بیگانہ ہوئی۔ ماہ گل اور احمد خوف و ہراس اور سراسیمگی کے مارے ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر روتے رہتے۔ گلناز غریب تو پہلے ہی خود سے بے خبر رہتی تھی،

سواسی کو ہمت کرنا تھی۔ بھائی کے رسوائے زمانہ انجام کے بعد چند روز کی رسمی تعزیت کے بعد کسی اپ
پرائے نے قریب پھٹکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لوگ یوں دیکھتے' جیسے وہ کسی اور دنیا کی مخلوق ہوں
چھوت کے مریض ہوں۔ کوئی ملتا بھی تو بدک کر پرے ہٹ جاتا۔ ایک تماشا سا بن گیا تھا۔

امی کی حالت سنبھلی تو حارث کے چالیسویں پر آنے والے اجلال سے پرائیویٹ اسکول
ایڈریس لے کر اگلے روز سر پر کفن باندھے نکل کھڑی ہوئی۔ پہلے محلے کے بچے اس کے پاس ٹیوٹ
پڑھنے آجاتے تھے' مگر جب سے حارث گرفتار ہوا تھا' والدین نے بچوں کو ہٹا لیا۔ اس لیے آمدنی کا
ذریعہ بھی ختم ہو چکا تھا۔

''کائنات پبلک اسکول'' کی ہیڈ مسز مسعود اجلال کے ریفرنس کی بدولت خاصی گرم جوشی سے
ملیں۔ ضروری معاملات طے کرنے کے بعد اسے پانچ ہزار تنخواہ پر رکھ لیا گیا۔

''آپ کا ہوسٹل کا انتظام سنبھالنے کا خاصا تجربہ رہا ہے' اور درس و تدریس بھی ساتھ ساتھ جار
رکھا ہے آپ نے' اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ کی بدولت بہت مختصر عرصے میں یہ اسکول چل نکلے
گا۔'' اور اس نے مسز مسعود کو مایوس نہیں کیا۔

جیسے تیسے دن گزر رہے تھے۔ مگر اسے گلناز کی طرف سے بہت پریشانی تھی۔ ایک بار اجلال ۔
تجویز دی تھی۔ کہ انہیں پاگل خانے میں داخل کرادو۔ مگر یہ سنتے ہی وہ بھڑک اٹھی تھی۔ وہ مر کے بھی ا
نہیں سوچ سکتی تھی۔ کم از کم نظر کے سامنے تو تھی۔ کیا ہوا جو ہوش مندی سے دور تھی۔ پھر امی بھی قیام
تک ایسا نہ ہونے دیتیں۔ مگر پریشانی بہرحال بدستور موجود تھی۔ امی بہت سراسیمہ رہنے لگی تھیں۔

''مجھے تو بیماری نے ایسا نچوڑا ہے' کھڑے ہوتے ہی چکر آنے لگتے ہیں۔ سارا دن گلناز کی طر
سے ہول اٹھتے رہتے ہیں۔ حالانکہ دروازے پر تالا ڈال کے رکھتی ہوں' مگر اس کو کیا خبر' جنون میں
بھی کر سکتی ہے۔''

شائستہ اس دن کچھ زیادہ ہی پریشان تھیں۔ ''امی! واحد حل یہی رہ جاتا ہے کہ۔'' وہ ایک
جھجک کر چپ ہو گئی' پھر بولی۔

''کہ آپی کو زنجیر سے باندھ دیں۔''

''ایسا نہ کہو'' شائستہ بے ساختہ تڑپ کر کہہ اٹھیں دل میں ہوک سی اٹھی تھی۔ یوں لگا جیسے کسی
دل کو مٹھی میں بھینچ دیا ہو۔ جن ہاتھوں نے گود دی۔ کھلایا تھا' وہ اب زنجیریں باندھیں گے۔

''اور کوئی حل بھی تو نہیں ہے امی۔'' وہ رنجیدگی اور افسوس کے ملے جلے انداز میں بولی۔ شائستہ

لب رہیں۔ ایک سرد آہ ہونٹوں سے نکل کر اداس فضا میں گھل گئی تھی۔

اگلے روز جب وہ گلناز کے ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ کو لوہے کی زنجیر سے باندھ رہی تھی' تو اس کی
آنکھوں سے بہتے آنسو گلناز کے دامن اور زنجیر کو بھگو رہے تھے۔ گلناز حیرت سے کبھی زنجیر کو دیکھتی اور
کبھی اس کی آنکھوں سے بہتے پانی کو۔

''روتی کیوں ہو۔؟'' وہ معصومیت سے پوچھنے لگی۔ ''کیا تمہیں بھی اس بڈھے نے اجاڑ دیا
ہے۔ میرا دل تو جلا دیا تھا۔ کیا تمہارا دل بھی آگ میں ڈال دیا ہے' بولو نا۔ چپ کیوں ہو۔'' وہ سادگی
سے اصرار کر رہی تھی۔

زرگل نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر گلناز کو دیکھا۔ روشن گلابی خوبصورت چہرہ مگر کس قدر
بھیانک قسمت لے کر آئی تھی وہ۔ وہ زیادہ دیر تک اسے دیکھنے کی تاب نہ لا سکی۔ مضمحل ملول قدموں
سے باہر چلی آئی۔

اسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔ گزشتہ دنوں کے واقعات نظروں میں پھرنے لگے' وہ ابوجی کی مطلق
العنانی' وہ ظلم و جبر کا دور' حارث کی ردعمل کے طور پر اپنائی جانے والی تباہ کن پالیسی اور اس کا انجام۔
دل قطرہ قطرہ درد سے بھیگتا چلا گیا۔

مضمحل کیسے ہوئے
کس نے کیا تھا اداس
چلتے چلتے جو کسی روئی ہوئی یاد سے ٹھوکر کھائی
ہولے ہولے سے سسکتی ہوئی تنہائی میں
لڑکھڑایا جو کسی بیتے ہوئے دن کا خیال
ملگجی روشنیاں رات کو بڑھا دیتی ہیں
ڈھانپ لیتی ہیں گھٹائیں جو کبھی سورج کو
آنکھ بھی ایسے خیالات سے بجھ جاتی ہے
دل کی ویران سڑک اور خموشی ہر سو
ایک پتا بھی کھڑک جائے تو ڈر جاتی ہے
نیم بیدار تمنا کی خلش کون سنے
ہاتھ میں تھامے ہوئے اجڑا ہوا جبر ہوا لاتی ہے

چھو کے رخسار گزر جاتی ہے
اور کوئی زرد دلاسا بھی نہیں دیتی ہمیں۔
خشک آنکھوں میں لگا جاتی ہے' ہر بار نئے غم کی خراش
بہنے لگتی ہے خزاں کا جل سے
بھولنا اس سے تو بہتر ہے اگر بس میں ہو
کون ان سنگ زدہ راہوں میں ٹکراتا پھرے
جا بجا ابھرے ہوئے لمحوں سے
پوچھتا کون پھرے
کس نے کیا اتنا اداس
مضمحل کیسے ہوئے
کون ہمیں یاد آیا۔

فٹ پاتھ کی گھاس قدموں تلے روندتی سر جھکائے چلتی ہوئی زرگل کے ذہن میں بے ساختہ یہ نظم چکرانے لگی تھی۔ وہ تھکے تھکے الجھے قدم اٹھاتی ''کائنات پبلک اسکول'' کے گیٹ کے اندر داخل ہوگئی۔

چھاجوں چھاج بارش برس رہی تھی' بمشکل نچڑتی ہانپتی کانپتی وہ گھر پہنچی تھی' مگر گھر میں ایک قیامت اس کی منتظر تھی' گلناز گھر میں نہیں تھی۔ وحشت کا کوئی ریلا اتنا تیز آکر جنون کے ساحل سے ٹکرایا تھا۔ کہ لوہے کی زنجیر توڑ کر گھر سے باہر نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا زرد دوپٹہ بھی ٹوٹی ہوئی زنجیر کے سرے سے لپٹا ہوا تھا۔

زرگل کا دل دھک سے رہ گیا۔ نہیں۔ یاخدا۔ اب اور تاب نہیں کسی قیامت کی۔

''امی! آپ تو خود کو سنبھالیں۔ میں دیکھتی ہوں۔'' وہ حواس چھوڑتی ماں کے کندھے تھام کر بے بسی سے کہہ رہی تھی۔ شائستہ کو جب ماہ گل نے خبر دی کہ آپی اپنے کمرے میں نہیں ہیں تو انہوں نے دیوانہ وار اٹھ کر اسے تلاش کرنے کے لیے لپک کر باہر جانا چاہا تھا مگر دروازے تک پہنچ کر کمزوری سے چکرا کر وہیں ڈھے گئیں۔ بمشکل تمام ماہ گل اور احمد نے سنبھالا۔

برستی بارش میں انہیں گھسیٹ کر کمرے تک لائے تھے وہ جوں کی توں کیچڑ میں لت پت برآمدے سے لگی بیٹھی تھیں۔ زرگل انہیں بہلا پھسلا کر اندر لائی' کپڑے تبدیل کروا کے رضائی اوڑھائی اور اب

گلناز کی تلاش میں نکلنے کو تھی کہ شائستہ نے جھپٹ کر بازو پکڑ لیا۔

''نہیں۔ نہیں۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔'' انہوں نے وحشت بھری نظروں سے اسے دیکھا' اتنا طوفان ہے باہر۔ کہیں تم بھی اس کی لپیٹ میں نہ آجاؤ۔'' ان کا لہجہ انجانے خدشات سے کانپ رہا تھا۔

''امی! مجھے جانے دیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی طوفان اس گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔'' اس نے نرمی سے ماں کا ہاتھ ہٹا دیا۔

''کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا' ایسی لاچاری اور بے بسی دیکھنے کو ملے گی۔ میرے بچے رل گئے ہیں۔ وہ بیٹیاں جنہیں کبھی آنگن کی ہوا نے نہیں چھوا تھا' آج جانے کس کس کی نگاہیں چھوتی ہوں گی ان کو۔'' شائستہ دونوں ہاتھوں میں منہ ڈھانپ کر رونے لگیں۔

زرگل ایک لمحے کو پتھر کی ہو کر رہ گئی۔ ایک لفظ منہ سے نہ نکل سکا۔ الفاظ جیسے کہیں گم ہو گئے تھے۔ بس ہاتھ کا دباؤ ماں کے کندھے پر ڈال کر تشفی کراتی رہی' پھر کوئی چارہ کار نہ پا کر گھر سے باہر نکل آئی برستی بارش میں چھتری لیے وہ گومگو کے عالم میں ایک موڑ مڑ گئی۔ وہ سمت کا تعین نہیں کر پا رہی تھی۔

شفیع جنرل اسٹور کے قریب سے گزرتے ہوئے معاً اس کی نگاہ ٹھٹکی اور قدم ٹھٹھر کر رہ گئے شفیع محمد کے گھر کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر ایک زنانی جوتی کیچڑ میں لت پت پڑی تھی۔

''اوہ میرے خدا'' ایک لمحے کو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہو۔ وہ لمحوں میں پہچان گئی تھی۔ یہ گلناز کی جوتی تھی۔ دیوانگی کے عالم میں وہ دوڑتی' بھاگتی یہاں تک پہنچی ہو گی۔ پھسلنے سے جوتی پاؤں سے نکلی اور اسی لمحے شفیع محمد ادھر متوجہ ہوا ہوگا۔ اور۔

اس سے آگے اس سے کچھ سوچا نہیں گیا۔ وحشت کے عالم میں وہ شفیع محمد کے گھر کا گیٹ دھڑ دھڑانے لگی۔ کچھ توقف کے بعد گیٹ کھلا۔

''کون ہے بھائی' کیا صبر نہیں ہوتا۔'' اس نے جونہی گیٹ سے باہر جھانکا ہڑبڑا کر رہ گیا۔ زرگل کو سامنے پا کر چہرے پر دوڑ جانے والی سراسیمگی اور گھبراہٹ اس سے چھپی نہ رہ سکی۔ زرگل کو جیسے پتنگے لگ گئے۔ وہ گولی کی طرح اس کو پرے دھکیل کر دیوانہ وار اندر لپکی تھی۔ شفیع محمد بھی پیچھے لپکا۔

جونہی نگاہ بیڈ پر بکھرے گلناز کے ٹوٹے ملگجے وجود پر پڑی' قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی دل دھک سے رہ گیا تھا۔ گلناز کا لٹا پٹا ڈھلکا ڈھلکا انداز اس ''واردات'' کی تکمیل کا زندہ ثبوت تھا جس کے خوف سے ماں بیٹی ادھ موئی ہوئی جا رہی تھیں۔

گلناز کو خود پر گزری قیامت کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ بے نیازی سے چھت پر لوہے کی کڑیاں گن رہی تھی۔

''تم۔تم نے' ذلیل انسان۔ میری بہن کو'' وہ بھوکی شیرنی کی طرح غرا کر شفیع محمد کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔ وحشت سے دل اتنا لبریز ہو گیا تھا کہ جی چاہ رہا تھا' اس درندے کی بوٹیاں نوچ ڈالے۔

وہ پہلے پہل کی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا' اس برستی شام میں وہ بے بس' بے سہارا لڑکی کیا کر سکتی تھی۔

''اگر اپنی خیریت چاہتی ہو تو چپ چاپ یہاں سے چلی جاؤ۔ اور اپنا منہ بند رکھنا۔ کان کھول کر سن لو اگر تم نے اپنی زبان کھولنے کی کوشش کی تو تم بھی محفوظ نہیں رہو گی۔ ٹھیک ہے پولیس میں رپورٹ درج کرا دینا۔ مگر اس صورت میں تمہیں ایک کی نہیں' دو' بہنوں کی عزت لوٹنے کے الزام میں میرے خلاف مقدمہ درج کرانا ہوگا۔'' وہ یکلخت سرد لہجے میں گویا ہوا۔

زرگل کے دل کی دھڑکنیں تھمنے لگیں۔ اسے لگا جیسے چھت اس پر آ رہی ہو۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اس وقت اس کے گھر میں بے یار و مددگار اس کے رحم و کرم پہ تھی۔ وہ ہوس کا پتلا' اس کی عزت و عصمت کا شیشہ بھی چکنا چور کر سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے بدن میں پھریری سی دوڑ گئی۔ وہ ہچکچا کر پیچھے ہٹ گئی۔

پھر ایک بار ان پر غضب کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ جوان بیٹی کی بربادی کا غم نیم جان کرنے کو کیا کم تھا کہ اس سانحے کے ٹھیک دو ماہ بعد وہ جان لیوا انکشاف رہی سہی روح بھی کھینچ کر لے گیا۔

اس دن صبح سے ہی گلناز مضمحل تھی۔ کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ دوپہر کو الٹیاں کرنے لگی۔ شائستہ کو تشویش ہوئی۔ وہ اس کے پاس آ بیٹھی۔ اپنی جہاندیدہ نگاہوں سے بیٹی کا سر ٹٹولا' پھر جیسے کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ایک اندیشہ سانپ کی طرح ذہن میں سرسرانے لگا۔ انہوں نے ایک بھروسے کی تجربہ کار دائی کو بلوایا۔ اس نے اس اندیشے کی تصدیق کر دی اور یہ بھی کہ ''جڑ مضبوط ہو چکی ہے' اب کچھ کرنے کرانے کا وقت نہیں رہا۔ جان کا خطرہ ہوگا۔''

اس دن شائستہ نے خدا سے جی بھر کے شکوے کیے۔ اتنی آزمائش' اتنی کٹھنائیاں۔ یا خدا کوئی حد بھی ہو گی۔ ایک عظیم رسوائی کا ناگ منہ کھولے گھر کے بچے کھچے ڈھانچے کو نگلنے کو تھا۔ زرگل کو ہی بتا سکی تھیں۔ دونوں ماں بیٹی ہی تو ایک دوسرے کی رازدار اور غمخوار تھیں۔

اس نے سنا تو وہ بھی کلیجہ پکڑ کے رہ گئی۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے' آنے والے رسوا کن لمحوں کی چاپ ابھی سے سنائی دینے لگی تھی۔

شائستہ نے اپنے طور پر بہتیری کوشش کی' مگر اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بیٹی کی جان تو نہیں لے سکتی تھیں۔ اس معصوم کو خبر ہی نہیں تھی' اس کی بدولت گھر والوں کو کس قیامت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

***

اس دن بڑی مدت بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ڈیڑھ دو ماہ قبل کراچی کے بیورو آفس میں کچھ انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے اخبار کے مالک کے حکم پر کراچی گیا ہوا تھا۔ اسلام آباد واپس لوٹا تو پہلی فرصت میں کائنات پبلک اسکول آیا تھا۔ چھٹی کا ٹائم ہونے والا تھا۔ وہ مسز مسعود کی ٹیبل پر رجسٹر رکھنے اور اپنی روانگی کا بتانے آئی تو وہ ان کے آفس میں موجود تھا۔ مسعود بھی ادھر ہی تھا۔ تینوں میں اپنائیت اور بے تکلفی سے گپ شپ ہو رہی تھی۔

اس کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر اجلال ہونٹوں پر آئی بات بھول گیا۔ بھرپور نگاہ سے اس کے سراپے کا جائزہ لیا۔ سیاہ سبز رنگ کے سادہ سے لباس میں وہی بے نیازی' ٹھہراؤ اور دلکشی لیے وہ۔ مسز مسعود سے الوداعی مکالمات ادا کر رہی تھی۔ اس پر ایک سرسری نگاہ کے بعد دوسری نہیں ڈالی تھی۔ گویا جانتی ہی نہ ہو۔

وہ اس کی احتیاط پر زیر لب مسکرا دیا۔ یہی محتاط و مضبوط اور منجمد انداز تو اس کو دوسروں سے ممتاز بناتے تھے۔

وہ گیٹ سے باہر کچھ فاصلے پر کھڑی گاڑی کے لیے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ جب اجلال اس کے پیچھے ادھر چلا آیا۔

''لوگ تو ایسے ہو گئے ہیں' جیسے کبھی آشنائی ہی نہ رہی ہو۔'' وہ قریب آ کر قدرے شوخی سے مخاطب ہوا۔ ''کیا حال چال ہیں' کیسی ہو؟'' وہ پرشوق نگاہ سے اس کا اداسی میں لپٹا دلکش چہرہ جانچ رہا تھا۔

''کیسی نظر آ رہی ہوں۔ آپ ہی بتا دیجیے۔'' کچھ دیر کے توقف کے بعد وہ تھکے ہوئے بے زار کن انداز میں آہستگی سے گویا ہوئی۔ اعصاب پر اتنی تھکن تھی کہ اس کی موجودگی و ملاقات بھی اس دھند کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

''میں کہہ تو دوں' مگر کیا تم سننے کی تاب لا پاؤ گی؟'' اس نے بغور دیکھتے ہوئے وہی پرانی بات یاد

دلائی تھی۔ اسی گمبھیر قدرے شرارتی سے چلبلے انداز میں۔ زرگل اتنی الجھی ہوئی تھی کہ غصے یا حجاب کا مظاہرہ کرنا بھی فراموش کر گئی۔ اپنے اندر ہی اتنی کہانیاں بکھری ہوئی تھیں لوگوں کے چہرے کے افسانے کیا پڑھتی۔

''آؤ کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔ اتنے عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ اطمینان سے بات ہوگی۔''

''نہیں۔ بات کرنے کی نہ فرصت ہے نہ موڈ۔ پلیز۔'' وہ ناگواری چھپاتے ہوئے جھنجھلا کر بس کے انتظار میں سڑک کی طرف دیکھنے لگی' اجلال کی موجودگی اس وقت کوفت میں اضافے کا سبب بن رہی تھی۔ کچھ ایسی سر پر آن پڑی تھی کہ سجھائی ہی نہ دیتا تھا کوئی سرا ہاتھ ہی نہیں آرہا تھا۔ ہر دن عذاب کا نیا رخ لے کر طلوع ہوتا تھا۔

''کیا بات ہے زرگل۔ تم بہت پریشان نظر آرہی ہو۔'' وہ لمحوں میں اس کے چہرے اور آنکھوں سے جھلکتے اضطراب اور کش مکش سے اس کے اندر کا بھید پا گیا تھا۔ وہ غور سے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کا جائزہ لے کر سنجیدگی سے بولا۔ ''مجھے بتاؤ کیا مسئلہ ہوگیا کوئی۔''

''اگر ایسا ہو بھی تو کیا کرسکیں گے آپ۔'' وہ شکستگی سے بولی۔

''تم بتاؤ تو سہی۔ آؤ میرے ساتھ' تفصیل سے بات کرتے ہیں کہیں بیٹھ کر۔ تمہاری پریشانی سے تو مجھے تشویش ہونے لگی ہے خدانخواستہ......''

''کہنے سننے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔'' وہ ہٹ دھرمی سے اپنی جگہ کھڑی رہی۔

''دل کا بوجھ تو ہلکا ہوجاتا ہے' اور دل ہلکا ہوجائے تو مناسب متبادل تدبیر بھی ذہن میں آہی جاتی ہے۔ تم بتاؤ تو سہی۔'' وہ رسانیت سے بولا۔

''کیا بتاؤں۔'' وہ دل پر پڑے بوجھ سے نڈھال ہو کر بالآخر پھٹ پڑی۔ ''میری پاگل بہن کو ایک برستی بارش میں خود سے بیگانہ دیکھ کر کسی نے عزت لوٹ لی۔ اور مزید آزمائش کے لیے خدا نے اس کے ناکردہ گناہوں کا پھل اس کی کوکھ میں ڈال دیا۔ کچھ وقت جاتا ہے کہ زمانے کی نظریں یہ بھیانک حقیقت پالیں گی۔ رسوائی کے متوقع پتھروں کے زخم سہلا رہے ہیں ہم لوگ۔ کیا بتاؤں مزید۔ بولیں ہے کوئی علاج اس کا آپ کے پاس۔'' وہ بغیر رکے بتاتی چلی گئی تھی۔

اجلال کو یوں لگا جیسے وزنی آتشیں پتھر اس کے اعصاب کو چٹخانے لگے ہوں۔ چہرہ شدت جذب سے سرخ پڑ گیا تھا۔ ہونٹ کاٹتا ہوا نظر جھکا کر رہ گیا تھا۔

''او مائی گاڈ۔ کب ہوا ایسا' یہاں بات کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ آؤ میرے ساتھ پلیز۔ دیکھو اب

ضد نہ کرو۔ چلو کہیں نہیں جاتے۔ مگر گاڑی میں تو بیٹھو' تمہیں ڈراپ کردیتا ہوں۔ راستے میں بات کرلیں گے' اس طرح سرراہ کھڑے ہو کر اس قدر حساس ٹاپک پر بات کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔''

وہ چپ چاپ گاڑی میں آ بیٹھی' کیا بتاتی مزید۔ وہ زبان' وہ حوصلہ کہاں سے لاتی' اس جانکاہ حادثے کی تفصیلات بتانے کے لیے اجلال خود ہی مختلف سوالات کرتا گیا۔ وہ مارے باندھے جواب دیتی رہی۔ اس نے آخر میں یہی بتایا تھا کہ گلناز گلی میں بے ہوش پڑی ملی تھی' اور وقوعہ میں ملوث شخص کا کوئی نام ونشان نہیں ملا۔

اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ کس نے کیا اور کب کیا۔ جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا۔ وہ اس حادثے کے بعد دوبارہ گئی تھی شفیع محمد کے پاس کہ اگر برباد کر ہی دیا ہے تو اسے اپنالو۔

''بھلا ایک پاگل کو کیوں عذاب کی طرح خود پر مسلط کروں۔ ہاں اگر تم ہاں کردو تو' میں آج ہی رشتہ لانے کو تیار ہوں۔'' وہ کمینگی سے ہنسا تھا۔ اور وہ اس کے منہ پر تھوک کر واپس چلی آئی تھی۔

''جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔ گزر جانے والے واقعے پر پچھتاوے اور غم زدہ ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جو لمحات واپس نہیں آسکتے ان پر ماتم کرکے کیوں ان لمحوں کو ضائع کریں' جو ہمارے ہاتھ میں ہیں' اور جن میں کچھ کیا جاسکتا ہے' ہمیں اس مسئلے کے حل کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ تمہاری امی کے خیال میں کون سا ایسا حل ہے' جس سے بات منظر عام تک آنے سے بچ جائے۔''

وہ اس سے نظر ملائے بغیر پوچھ رہا تھا۔

''اوہ۔ کوئی اور حل'' وہ بجا طور پر تشویش محسوس کر رہا تھا۔

''اور کیا ہوسکتا ہے؟'' زرگل نے تھکی تھکی سی سانسیں اندر کھینچیں۔ ''ایسی صورت میں زمانے کی اٹھتی انگلیاں دبانے کے لیے واحد حل شادی ہی ہوا کرتا ہے مگر ایک پاگل لڑکی سے کون ہوش مند شادی کرسکتا ہے اس حقیقت کا تو ہمیں بھی ادراک ہے۔ اسی لیے امی نے یہ حل نکالا تھا کہ کسی ہمدرد اور دردمند رکھنے والے بندے سے کہہ کر اسے نکاح کے لیے آمادہ کرلیا جائے ڈلیوری ہوجائے تو وہ گلناز آپی کو جب جی چاہے طلاق دے سکتا ہے۔ یہ نکاح تو بس کاغذی ہوگا۔ رسوائی سے بچنے کے لیے۔ امی نے اپنے ایک بھروسے کے عزیز کو اس سلسلے میں کہا تو انہوں نے صاف انکار کردیا۔ اب ہر ایک سے باری باری کہہ کر تماشا تو نہیں لگا سکتے۔ اس طرح تو مزید بات پھیلنے کا اندیشہ ہوگا۔ اسی لیے بے بس ہو کر چپ ہو رہے ہیں۔ کوئی حل سجھائی نہیں دے رہا۔''

''خیر۔ بہر حال ایک پوائنٹ تو ملا معاملہ آگے بڑھانے کو۔ ہم تلاش کرتے ہیں یقیناً دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔ اسے کون سا ساری عمر ساتھ نبھانا ہے۔ محض چند ماہ ہی تو اپنے نام کا تحفظ دینا ہوگا۔''

''کون ہے اتنا عالی ظرف اور حوصلہ مند۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ کون پرایا گناہ اپنے سر لیتا ہے۔ پھر وقتی طور پر ہی سہی ایک پاگل لڑکی نے شادی کے بعد وہ خود دوسروں کے لیے تماشا بن کر رہ جائے گا۔ اتنا جذبہ اور کشادہ دلی لوگوں میں ہوتی تو آج کرہ ارض جنت بن چکی ہوتی۔ کون یہ انتہائی قدم اٹھائے گا۔ کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟ تم چند ماہ کے لیے اپنا نام اسے دے سکتے ہو؟''

اجلال ایک دم پتھر کا ہو کر رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی جرأت سے اس کا گریبان پکڑ لے گی۔ زرگل کو خود بھی بہت دیر بعد اندازہ ہوا کہ اس نے کیا بم پھوڑا ہے اس کی سماعت پر۔

''تمہیں اندازہ ہے تم کیا کہہ رہی ہو۔'' کچھ ثانیے بعد بالآخر گویا ہوا۔

''ہاں۔ اور اب اندازہ کرنا چاہتی ہوں کہ تم کتنے پانی میں ہو۔'' وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

''کیا تم مجھے چیلنج کر رہی ہو؟'' اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''نہیں۔'' وہ گہری سانس لے کر سیدھی ہوگئی۔ ''میں نے تو تمہارے ہمدردی جتانے پر ایک بات کہی تھی۔ تمہیں بڑا دعوا ہے مجھ سے تعلق خاطر کا۔ میری ذات اور میرے مسائل کے بارے میں بہت پریشانی اور تفکر کا اظہار کرتے ہو۔ میں دیکھنا چاہتی تھی ان میں کتنی سچائی ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے پھر میرا مسئلہ حل کرنے کے لیے تمہیں یہ تجویز مان لینی چاہیے۔''

وہ کس قدر بے رحمی اور پتھریلے سے بے نیاز انداز میں آرام سے اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کے یہ جملے کسی کے مخلص اور ہمدرد دل پر کیسی چوٹ لگا رہے ہوں گے۔ ایسی نزاکتوں کا احساس تو وہ کرتا ہے جس کا اپنا دل ان جذبات سے گداز ہو چکا ہو۔ شاید ادھر یہ کیفیت نہیں تھی۔ تبھی روانی سے کہہ دیا گیا تھا۔

اجلال کچھ لمحے بغور اس کا چہرہ پڑھتا رہا۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔

''سنو گل! من میں بوٹی مرشد لگاتا ہے۔ بجا کہ ہر کسی کو ولایت نصیب نہیں ہوتی مگر اس کا احترام تو وہ ہر دل میں اتارتا ہے۔ جذبوں کا جواب دینے کی توفیق نہ ہو۔ نہ سہی مگر تعظیم اور اہمیت تو ہو۔ سائل کو کچھ دے نہیں سکتے تو اس کے کشکول میں پتھر بھی مت ڈالیے۔ طنز اور تمسخر کے کانٹے تو پھیلے ہوئے

دامن کا نصیب نہ بنائیے۔

وہ کچھ ایسے دل گیر انداز میں بولا تھا کہ فی الواقع زرگل شرمندہ ہو کر رہ گئی۔ اس نے کبھی آج سے پہلے اجلال کو اتنا ٹوٹا ہوا اور جذباتی شکست و ریخت کا شکار نہیں دیکھا تھا۔

کم از کم اب تو اسے بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔

ثابت ہو چکا تھا کہ حارث کے حصول زر کے فلسفے سے قطع نظر وہ اپنے کام سے کام رکھنے کا عادی تھا اور پوری دیانت داری سے اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ پھر پے در پے حادثات پر اس کے خلوص بھرے تعاون نے اس کے جذبوں کی سچائی اور بے لوث طبیعت کا ثبوت دے دیا تھا۔ زرگل معذرت کے لیے الفاظ سوچنے لگی۔ تبھی اس کا اسٹاپ آ گیا۔

''ایک اور بات جذبات کی صداقت کو آزمائش سے مربوط نہیں کرتے کہ آزمائش پہ پورا اترنا یا نہ اترنا ہمیشہ ہی جذبات کی پرکھ کا پیمانہ ثابت نہیں ہوتا۔ بعض اوقات جذبوں کی سچائی کے باوجود۔ آزمائش کے وقت دعوے ادھورے رہ جاتے ہیں۔ بہر حال تم نے اپنی نادانی کے سبب یا شاید اپنی کسی حس کی تسکین کے لیے میرے ضبط کے تار چھیڑے ہی ہیں تو اطمینان رکھو۔ میں یہاں بھی تمہیں خود سے جیتنے نہیں دوں گا۔ ایک محاذ پر ہارا تھا تم سے کہ وہاں فطری طور پر بے بس تھا مگر اب نہیں ہاروں گا زندگی تو کیا زندگی کی ایک شام بھی نہیں ہار سکتا۔ دو دن بعد میں تمہیں حتمی جواب دے دوں گا۔'' گاڑی روکتے ہوئے اس نے سرخ جلتی ہوئی نگاہ اس کے پشیمان چہرے پر ڈالی تھی۔

اس وقت تو وہ اس کی مبہم باتیں نہیں سمجھ پائی تھی۔ جب گھر آ کر اس بارے میں اپنی طرف سے ماں کو خوشخبری سنائی تو وہ تذبذب میں پڑ گئیں

''وہ تو بہت اچھا لڑکا ہے کسی نیک ماں کی اولاد ہوگا۔ مگر ڈیڑھ دو مہینے پہلے ہی تو اس نے مجھ سے بات کی تھی تمہارے متعلق کراچی جانے سے پہلے۔ اس کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں ہے یہاں۔ اس لیے خود ہی ایک دن آیا تھا رشتے کے لیے اور میں نے جواب میں ہاں کر دی تھی۔''

ماں کے انکشاف پر وہ ایک لمحے کو دم بخود رہ گئی تھی۔

''آپ نے مجھ سے اس بابت کچھ پوچھا نہیں؟'' اس نے شاکی انداز میں انہیں دیکھا۔

''بیٹی! اب تو جو وقت بیت جائے شکر ہے اس کی ذات کا۔ حالات ہی ایسے نہیں رہے تھے۔'' انہوں نے سرد آہ کھینچی۔ ''کیا پوچھنا بتانا۔ پھر وہ حارث کا دوست تھا اتنی مدت سے آتے جاتے دیکھا ہے اسے وہی حارث کی فوتگی کے بعد بھی یہاں آتا جاتا رہا۔ خیر خیرت پوچھنے کے لیے۔ ورنہ ادر کس

نے پلٹ کے دیکھا اخبار والوں نے تو بھول کر بھی قدم نہیں رکھا۔ اور عزیز۔ رشتے دار یوں آنکھیں پھیر گئے ہیں جیسے کبھی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔''

''بہرحال امی! میرا خیال ہے آپی کے معاملے میں ان پر دباؤ ڈالا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے مان ہی جائیں۔'' وہ سر جھٹک کر بولی۔ ''ہم کون سا ہمیشہ کے لیے ان پہ ذمے داری ڈال رہے ہیں۔ صرف چند ماہ کا کاغذی سہارا دے دیں۔''

''مگر میں تمہارے لیے ہاں کر چکی ہوں۔ آخر تمہاری بھی تو شادی کرنا ہے۔''

''چھوڑیں امی! ابھی اُس بارے میں سوچیں ابھی اِس کا وقت نہیں آیا۔ ماہ گل اور احمد بہت چھوٹے ہیں۔ پھر آپ اور گلناز آپی کو اس طرح چھوڑ کر میں کہیں بھی نہیں جاسکتی۔'' اس نے مصمم لہجے میں جواب دیا۔

''ہر شے میں فطرت نے گنجائش رکھی ہے۔ کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک زمانہ تھا۔ میں سمجھتی تھی ابراہیم صاحب اور حارث نہ ہوتے تو گھر کیسے چلتا مگر دیکھ لو آج وہ دونوں ہی نہیں رہے مگر گھر چل رہا ہے۔ یہ دنیا ایک گول دائرہ ہے جس سے ہر ایک کو گزرنا ہی ہوگا۔ ہم اپنے اپنے دائرے کو مکمل کرنے تک اس گردش کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جانے پر مجبور ہیں میری بچی۔ میں نے تو پہلے بھی اولاد کی کوئی خوشی نہیں دیکھی نہ بیٹے کے سر پر سہرا سجا نہ بیٹی کے ہاتھ پیلے ہوئے۔ اب کیا تمہاری دفعہ بھی یونہی سناٹا رہے گا۔ نہیں کوئی خوشی تو دیکھ لوں۔''

وہ یاس بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔

''وہ تو بعد کی بات ہے۔ دیکھی جائے گی۔ فی الحال آپی کے مسئلے پر سوچیں۔'' وہ ٹالنے کے سے انداز میں بولی۔ ''میرا خیال ہے وہ آپی سے وقتی طور پر کاغذی بندھن باندھنے پر راضی ہوجائیں گے۔''

اتنا تو وہ جانتی تھی اپنی زبان کا پکا ہے۔

''میں اس سے بات کروں گی اور اس سے وعدہ کروں گی کہ مخصوص مدت گزر جانے کے بعد تمہارے ساتھ اس کی شادی خود کراؤں گی۔''

''امی۔'' وہ ان کے دوٹوک اور حتمی لہجے پر گھبرا سی گئی۔ یہ معاملات تو پھر بھی طے ہوتے رہیں گے۔ مجھے شادی کی کوئی جلدی نہیں اور پھر ضروری نہیں کہ۔''

''نہیں۔ بالکل ضروری ہے کہ تمہاری شادی اسی سے ہو۔ آخر وہ اسی وجہ سے تو یہ قربانی دے رہا ہے۔'' شائستہ نے پورے یقین کے ساتھ اس کی بات کاٹ دی۔'' اگر وہ تمہاری عزت کے لیے اتنا

پہاڑ جیسا ظرف اور حوصلہ رکھتا ہے تو اس کڑی آزمائش سے گزر جانے کے بعد اس کے لیے ہماری طرف سے کوئی انعام تو ہو اور اس کی بہترین صورت تمہارا اور اس کا رشتہ ہی ہوسکتا ہے یوں بھی اتنا اچھا بر کھونا بے وقوفی ہوگی۔''

امی اپنے ہی تانوں بانوں میں لگی ہوئی تھیں اس نے مزید کچھ بولنا عبث جانا۔

بالآخر وہ اس آزمائش سے گزر گیا۔ دنیا دکھاوے کو دو چار لوگوں کو بلا کر مختصر سی رسومات کے بعد گلناز کو سجا کے اجلال کے خوبصورت سے بنگلے میں پہنچا دیا گیا۔ زرگل اس کے پاس ہی ٹھہری تھی۔ کہ گلناز کے لیے نئی جگہ تھی۔ دیوانگی میں کچھ کر نہ گزرے۔

اجلال انہیں گھر بٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔ اور ساری رات گھر واپس نہیں آیا۔

دوسری صبح وہ مضمحل قدموں سے اندر داخل ہوا تو زرگل نے دزدیدہ نگاہ سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر پتھریلی سی منجمد کیفیت طاری تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ پوچھ سکی۔ البتہ دل میں عجیب سا بوجھل پن آن ٹھہرا تھا۔

اب وہ اس کا بہنوئی تھا۔ چاہے کاغذی ہی سہی رشتہ تو تھا اور اس نئے رشتے سے دیکھنے پر وہ کتنا عجیب سا دکھائی دے رہا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا جس سے ہمیشہ بے زار رہتی تھی۔ کترا کر گزر جاتی تھی۔ اس سے اتنے قریبی تعلق سے بندھ جائے گی۔ ابھی کل ہی کسی چلبلے دوست نے سر محفل چھیڑا تھا۔

''دولہا میاں کوئی شعر تو سناؤ'' اور اس نے برجستگی سے پڑھ دیا تھا کہ

اس نے مانگا بھی اگر کچھ تو جدائی مانگی
اور ہم تھے کہ ہمیں انکار نہ کرنا آیا

یہ کہہ کر اس نے اس قدر گہری نظر سے اس کا چہرہ جانچا تھا کہ وہ بے ساختہ نظر چرانے پر مجبور ہوگئی تھی۔ حالانکہ آج اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ کتنا سچا اور مخلص تھا۔ اسے اس پر اعتبار آگیا تھا مگر کتنی عجیب بات تھی۔

وہ دوست کیا عجیب تھا جس کی ذات پر
جب اعتبار بڑھ گیا' تو اختیار گھٹ گیا

آج وہ اس کی نظروں میں معتبر تھی مگر کسی اور حوالے سے۔

''کیسے ہیں آپ؟ وہ ناشتے کی میز پر قدرے جھجکتے ہوئے انداز میں اسے جامد و ساکت دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔ کوشش کے باوجود ''اجلال بھائی'' زبان پر نہیں آسکا تھا۔ جواب میں اس نے ایک برفیلی نگاہ اس پر ڈالی۔ اور چپ رہا۔

''گلناز کدھر ہیں۔ کیا وہ ناشتا نہیں کریں گی؟'' کچھ توقف کے بعد وہ اس کا استفسار یکسر نظر انداز کر کے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوال کرنے لگا۔

''وہ سوئی ہوئی ہیں۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ دل میں کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔ کوئی دھندسی چھا گئی تھی۔ وہ ایسا تو نہیں ہوا تھا کبھی بھی اس کے ساتھ اتنا سرد مہر' اجنبی اور تکلف میں لپٹا خود سے کتنا دور محسوس ہو رہا تھا۔ اب تو فاصلے سمٹ گئے تھے۔ اپنائیت کی فضا استوار ہوئی تھی تو وہ بے گانگی کے رنگ اوڑھ بیٹھا تھا۔

وہ بہت تھوڑا سا برائے نام ناشتا کر کے اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ زرگل یونہی خالی خالی نظروں اسے جاتا دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ تیار ہو کے نکلا تو لاؤنج میں گھس گیا۔ جانے کون سی فائلیں کھولے بیٹھا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ آفس جانے کا کہہ کر گھر سے باہر نکل گیا۔ زرگل کسلمندی سے اٹھ کر گلناز کو جگا کر ہاتھ منہ دھلانے لگی۔ اسے ناشتا کرا کے لاؤنج میں لے آئی۔ یوں ہی اخبارات کھنگالتے ہوئے اس کی نظر رائٹنگ پیڈ پر پڑی۔ شاید وہ کوئی آرٹیکل لکھتا ہوا اٹھا تھا۔ کچھ صفحات پر مختلف مضامین لکھنے شروع کر رکھے تھے۔ آغاز پر پیراگراف کے بعد غالباً موڈ بدل گیا تھا۔ پھر اس نے ایک صفحہ پلٹا۔ محسن نقوی کی نظم جگمگا رہی تھی۔

یہ راکھ راکھ رتیں' اپنی رات کی قسمت
تم اپنی نیند بچھاؤ' تم اپنے خواب چنو
بکھرتی ڈوبتی نبضوں پہ دھیان کیا دینا
تم اپنے دل میں دھڑکتے ہوئے حروف سنو
تمہارے شہر کی گلیوں میں سیل رنگ بخیر
تمہارے نقش قدم پھول پھول کھلتے رہیں
وہ رہگذر جہاں تم لمحہ بھر ٹھہر کے چلو
وہاں پہ ابر جھکیں آسمان ملتے رہیں

نہیں ضرور کہ ہر اجنبی کی بات سنو
ہر ایک صدا پہ دھڑکنا بھی دل کا فرض نہیں
سکوت حلقہ زنجیر در بھی کیوں ٹوٹے
صبا کا ساتھ نبھانا جنوں کا قرض نہیں
ہم ایسے لوگ بہت ہیں جو سوچتے ہی نہیں
کہ عمر کیسے کٹی' کس کے ساتھ بیت گئی
ہماری تشنہ لبی کا مزاج کیا جانے
کہ فصل بخشش موج فرات بیت گئی
یہ ایک پل تھا جسے تم نے نوچ ڈالا ہے
وہ ایک صدی تھی جو بے التفات بیت گئی
ہماری آنکھ لہو ہے' تمہیں خبر ہوگی
چراغ خو سے بجھا ہے کہ رات بیت گئی

نظم پڑھ کر نجانے اسے کیا ہوا وہ دونوں ہاتھوں پہ چہرہ ٹکائے پھوٹ پھوٹ کر رو دی جبکہ اپنے دوپٹے کا گولہ بنا کر کھیلتی ہوئی گلناز حیرت سے پلکیں جھپکا کر اسے دیکھ رہی تھی۔

''کمال ہے صاحب۔ اتنے پڑھے لکھے ہو کر ایسی غفلت کا مظاہرہ کیا؟ ایسی بھی کیا جلدی تھی۔ یہ تو ابھی خود کو سنبھالنے سے قاصر ہیں۔ آپ نے دوہری مشقت مول لے لی۔'' گلناز کا چیک اپ کرنے کے بعد۔ گائنا لوجسٹ نے تادیبی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

اجلال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ماتھے پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ اس نے اضطراری انداز میں دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر دبا ڈالیں۔ ہونٹ ایک دوسرے سے اس طرح جڑے تھے جیسے کبھی کھلیں گے ہی نہیں آنکھوں میں وحشت تیرنے لگی تھی۔

''چھ مہینے بعد ڈیٹ آئے گی ان کی۔ مگر چیک اپ باقاعدگی سے کرواتے رہیے گا۔''

وہ ڈاکٹر کے کلینک سے چیک اپ کروا کر اپنی سسرال آ گیا۔

زرگل اسکول سے آ چکی تھی اور شام کے لیے سبزی بنا رہی تھی۔ بہن اور بہنوئی پر نگاہ پڑتے ہی خیر مقدم کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس کا سلام نظر انداز کرتا ہوا شائستہ کے پاس چلا گیا تھا۔'' احسان کیا

ہے تو حوصلے سے نبھا بھی لیں۔ یوں جتا کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ چائے دینے کے لیے اسے ڈھونڈتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی تو نہ چاہتے ہوئے بھی آزردگی سے کہہ بیٹھی۔ وہ امی سے مل کر گلناز کو ادھران کے پاس چھوڑ کر ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا۔

اجلال نے ایک تپتی ہوئی سرخ نگاہ اس پر ڈالی اور پھر سامنے دیوار پر نظر جما دی۔

''کوئی ظالم بھی ہو اور زندگی کے لیے لازم بھی تو مجبوراً احتسابی عمل کو روکنا ہی پڑتا ہے ورنہ میں تمہیں احسان کے اصل معانی ضرور سمجھاتا۔ اور کتنا امتحان لوگی زرگل؟'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ یکلخت خاموش ہو کر رہ گئی۔

''مجھ سے کوئی رنجش ہے؟ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کہہ لیں۔'' وہ نظر جھکا کر بولی۔

''کہہ تو دوں مگر کیا تم سننے کی تاب لا پاؤ گی؟'' بہت عرصے بعد وہی مخصوص جواب آیا تھا مگر اب کے لہجے میں شوق کی گرمی اور شرارت کی لپک نہیں تھی۔ ایک خشک روکھا طنز تھا۔

''یاد رکھو زرگل۔ چیلنجنگ انداز لاکھ قابل ستائش سہی مگر جذبوں کو چیلنج کرنا بڑی بے وقوفی بلکہ بے رحمی کا ثبوت ہوتا ہے۔ دھمکی، دھونس اور دعوے سے پرکھنے کا عمل سراسر مقابل کی توہین ہے اور اس کی خودداری پر کاری ضرب لگانے کا باعث بن جاتا ہے۔ پرکھنا ہی ہے تو مان اور بھروسے کا پیمانہ استعمال کیجیے۔ ایک حساس و شفاف دل کو شک و بدگمانی سے آلودہ کرنا کتنا بدصورت اور غیر فطری طرز عمل ہوا کرتا ہے۔''

زرگل پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ معاً اسے اپنی زیادتی کا شدید احساس ہو گیا۔ واقعی اس نے کتنی بے رحمی سے اسے چیلنج کرنے کے لیے آزمائش میں ڈالا تھا۔ وہ درخواست بھی تو کر سکتی تھی۔ طریقے سے سلیقے سے مسئلے کا حل طلب کرتے ہوئے اسے یہ اعلاظرفی دکھانے کے لیے آمادہ کر سکتی تھی مگر وہ تو ایک دم ہتھے سے ہی اکھڑ گئی تھی۔ اس کے جذبات احساسات کی پروا کیے بغیر ترنخ کر قربانی مانگ لی تھی۔ یہ تو اس کی شخصیت کا جذب تا کہ وہ اس اچانک وار کو سہنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اگر احسان سمجھ کر کرتا تو اتنا شکستہ اور بکھرا ہوا نظر نہ آتا۔

''میں معذرت خواہ ہوں اجلال! شاید اس وقت میں غلط الفاظ استعمال کر گئی تھی جذباتی ہو کر۔'' وہ مضطربانہ پلکیں اٹھاتی گراتی نادم ہو کر بولی۔

''شاید زندگی میں پہلی بار تمہارے ہونٹوں نے میرا نام چھوا ہے۔ چلو اسی خوشی میں چھوڑ دیتے ہیں سب حساب کتاب۔''

وہ ایک دم ہلکا پھلکا ہو کر خوش دلی سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ کچھ لوگ خوشی محسوس کرنے کے معاملے میں بہت قناعت پسند واقع ہوتے ہیں۔ ایک غیر معمولی رویہ بھی انہیں نہال کر ڈالتا ہے۔

''اور سنو۔ میں پہلے بھی بارہا تمہیں بتا چکا ہوں کہ الفاظ کے استعمال میں ہمیشہ محتاط رہا کرو۔ سوچ سمجھ کر الفاظ غیر جانبداری سے انصاف کے ساتھ استعمال کرنے چاہئیں۔ خاص طور پر جذباتی الفاظ کے استعمال میں بہت او بجیکٹیو اور ایماندار رہنا چاہیے بندے کو۔ یہ چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ برائے کرم دوسری لے آئیے۔ اگر زحمت نہ ہو تو۔''

وہ بے اختیار اسے دیکھتی رہ گئی۔ ایک ذرا سی معذرت نے اس کو کتنا بدل دیا تھا آن کی آن میں۔ شاید اس کی خود حساس طبیعت اور مردانہ انا میں چبھا کانٹا نکل گیا تھا۔ زرگل مزید شرمساری محسوس کرنے لگی۔ اپنی بے نیاز فطرت کے باعث اس نے خوامخواہ سادہ دل، مخلص بندے کو اتنے دنوں سے عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا۔

''میں سارے قرض سود سمیت ادا کر دوں گی۔ اک ذرا انتظار۔'' دوبارہ چائے بناتی ہوئی وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

''اب نہیں ستاؤں گی وعدہ۔ آپ کے دل کی تمام حسرتیں پوری کروں گی۔ یہ کٹھن وقت بیت جائے پھر سرتا پا نہال کر دوں گی پھر آپ کو ہم سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔'' وہ بشاشت سے مسکراتی ہوئی سوچ رہی تھی۔ انداز میں ایک ترنگ سی تھی۔

''ابھی چھ مہینے رہتے ہیں۔ بڑا طویل عرصہ ہے مگر خیر بیت ہی جائے گا۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ اس امتحان سے گزرنے کے بعد تمہارے وجود کی صورت میں ایک بہت خوبصورت انعام میرا منتظر ہوگا۔'' وہ چائے لے کر آئی تو اجلال مسرور کن نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

وہ نظریں جھکا کر خوامخواہ ٹیبل پر پڑا رسالہ اٹھا کر اس کے صفحات الٹنے پلٹنے لگی۔

''کیا تم لوگوں نے گلناز کو کسی سائیکاٹرسٹ یا نیورولوجسٹ کو دکھایا ہے؟''

''نہیں پے در پے اتنے مسئلے مسائل رہے کہ دوبارہ چیک اپ پر دھیان ہی نہیں گیا۔''

''میرا خیال ہے انہیں کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھا لیتے ہیں۔ شاید کچھ بہتری کی صورت نکل آئے۔ کم ازکم اپنا آپ سنبھالنے کے قابل تو ہو جائے۔ اس طرح کیسے زندگی گزارے گی۔ ساری عمر پڑی ہے۔ آر۔ جی۔ ایچ کے سائیکاٹری وارڈ کے ہیڈ میرے جاننے والے ہیں۔ کل ان کے پاس لے کے جاؤں گا۔'' اس کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں تھیں۔

"ہاں ضرور۔ اگر کچھ تھوڑی بہت بہتری ہو جائے تو۔" زرگل کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ لہجے میں زندگی کی رمق دوڑنے لگی تھی۔

گلناز کی حالت کے پیش نظر اجلال نے ایک فل ٹائم ادھیڑ عمر عورت گھر پر رکھ لی تھی جو اس کی غیر موجودگی میں اس کا دھیان رکھتی تھی۔ وہ تو صبح کا گیا شام گئے لوٹتا تھا۔ ایسے میں کسی کو اس کے پاس ہونا چاہیے تھا۔

"میں کل ہی بات کروں گا ڈاکٹر شعیب سے۔" اجلال نے پر عزم لہجے میں کہا۔

"اور ہاں۔ تم جاب کب چھوڑ رہی ہو۔ یار بس کرو اب۔ ایسا کیا مسئلہ ہے کچھ عرصے کی تو بات ہے پھر تم میری ذمے داری ہو گی اور یہ بات طے ہے کہ شادی کے بعد تم گلناز امی ماہ گل اور احمد میرے ساتھ رہو گے۔" وہ پھر اپنے پرانے موضوع پر آ گیا تھا۔ لہجے میں اصرار اور استحقاق تھا۔

"نہیں اجلال! آپ نے پہلے ہی بہت کچھ کیا ہے ہمارے لیے۔ یہی بہت ہے جو آپ نے ہماری عزت بچانے کے لیے اتنی بڑی قربانی دی ہے۔ پرایا گناہ اپنے ذمے لے کر خندہ پیشانی سے بھگت رہے ہیں امی بھی راضی نہیں ہوں گی۔" وہ بہت رسانیت سے منع کر گئی تھی۔

"یہ بعد کی بات ہے۔ امی کو میں منا لوں گا۔" اس کا لہجہ اٹل تھا۔ "تم بتاؤ جاب کب چھوڑ رہی ہو۔"

"بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ابھی کچھ عرصہ تو ٹھہر جائیں ناں۔ میں اتنی جلدی جاب چھوڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" وہ اس کا لحاظ کرتے ہوئے نرمی سے بولی تا کہ اس کا مان مجروح نہ ہو

"اچھا بقول تمہارے میں نے بہت کچھ کیا ہے تو پھر تم بھی میرے لیے ایک کام کرو۔" اچانک اس کی آنکھوں میں جاندار چمک ابھر آئی۔

"کیا؟" اس نے پوری آمادگی سے دریافت کیا۔

"میں نے کبھی تمہیں مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ خاص طور پر میرے لیے تو کبھی مسکراہٹ تمہارے ہونٹوں پر نہیں ابھری۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں ایک بظاہر بے نیاز مگر متفکر ہمہ دم سنجیدگی اور اداسی کے خول میں لپٹے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ کیسا منظر پیش کرتی ہے۔ فقط ایک بھرپور مسکراہٹ میرے لیے۔ میرے نام کی۔ اور فقیروں کا مدعا کیا ہے۔"

وہ جن نرم نرم نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا اور جس طرح اس کے چہرے کے متبسم ذومعنی زاویے

ن کہے جذبوں کی رنگین داستان سنا رہے تھے ان رنگوں نے بے اختیار زرگل کو پزل کر دیا۔ وہ تیزی ے پلکیں جھپکاتی یونہی کانوں کے پاس پڑی لٹ کو پیچھے اڑستے ہوئے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتی ئی سیدھا دل میں اترتی جا رہی تھی۔ یہی نظارہ تو وہ دیکھنا چاہتا تھا۔

"بھئی! ایک تبسم کی خیرات مانگی تھی ہم نے۔" وہ کترا کر رخ موڑنا چاہتی تھی کہ وہ شریر سے انداز ں دوبارہ عین سامنے آ کھڑا ہوا۔

اور زرگل کو خبر ہی نہ ہوئی کب اس کے ہونٹوں کی کلیاں ایک شرمیلے سے تبسم میں ڈھل کر کھل کر بکھر ئی تھیں۔ اور یہی تو وہ لمحہ تھا جس کا اجلال اتنے برسوں سے صبر وضبط سے منتظر رہا تھا۔ یہی وہ جذبوں کے رنگ تھے جنہیں وہ اس کے چہرے پر سجے دیکھنے کی تمنا لیے ہوئے اس کی بے نیازیاں اور گریز داشت کرتا رہا تھا۔

وہ خود فراموشی کے عالم میں ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ زرگل سے زیادہ دیر اس کے سامنے ٹھہرا نہ یا۔ وہ تیزی سے ڈرائنگ روم کا دروازہ پار کر گئی تھی۔

کچھ بھی تھا۔ ایک مخصوص عرصے کے لیے وہ اس کی ذمے داری تھی۔ پھر وہ ایک انسان تھا حساس ر ہمدرد دل کا مالک تھا۔ وہ جس عذاب میں مبتلا تھی وہی اس کے لیے کم نہ تھا۔ اوپر سے ہوش و حواس ے بے گانگی مزید اس کی حالت ابتر بنائے دے رہی تھی۔ وہ اپنے اندر رونما ہونے والی جسمانی بدلیوں کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ ماسی بھی اسے کتنا سنبھالتی۔ جنون میں وہ خود سے بے گانہ ہو جاتی تھی۔

وہ اسے ڈاکٹر شعیب کے پاس لے گیا۔ پہلے پل انہوں نے گلناز کی موجودہ حلات کے پیش نظر ٹمنٹ اپلائی کرنے پر تعرض کیا۔ ان کے خیال میں ڈلیوری کے مرحلے کے بعد ٹریٹمنٹ زیادہ سود مند تا مگر پھر جب انہوں نے ابتدائی طور پر میڈیسن اور تھراپی اپلائی کی تو جواب میں مثبت ردعمل ملنے کے بعد انہوں نے اپنا خیال تبدیل کر لیا۔ تقریباً دو ہفتے انہوں نے اسے وارڈ میں رکھا۔ ای سی ٹی اور رگ ٹریٹمنٹ دیا پھر گھر لے جانے کی اجازت دے دی۔

"کم از کم چھ سات ماہ تک باقاعدگی سے انہیں ہفتے میں دو بار ہاسپٹل لانا ہو گا۔ ان کی ہفتہ وار گریس چیک کرنے کے بعد ہم مرحلہ وار ٹریٹمنٹ دیتے رہیں گے۔ امید ہے اللہ تعالیٰ بہتری ہی کرے گا۔ ہاں اس کے علاوہ سب سے اہم رول آپ کا گھریلو سطح پر ہو گا۔ مریضہ کی بہتری کے لیے آپ کا تعاون سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے بلکہ یوں سمجھ لیجیے ان کی صحت کی بحالی کا دارومدار

آپ کے طرزِ عمل پر ہوگا جن دباؤ کی بدولت یہ ان حالوں کو پہنچی ہیں ان کا پریشر کم کرنے کے لیے آپ کو بہت یکسوئی اور برداشت سے کام لینا ہوگا۔''

پھر وہ اسے سمجھانے لگے کہ اسے کس طرح ٹریٹ کرنا ہے۔

اجلال نے ان کی ہدایات کو پلے باندھ لیا۔ وہ باقاعدگی سے گلناز کو ہاسپٹل لے کر آتا تھا اور گھر پر بھی پوری طرح ٹائم دینے کی کوشش کرتا تھا۔ ڈاکٹر شعیب کی ہدایت کے مطابق وہ زیادہ سے زیادہ توجہ اور وقت اسے دیتا تھا۔ اس کے ایک ایک عمل اور ردعمل پر دھیان دیتا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا۔ سمجھاتا اور اس کے کھانے پینے کے اوقات کار کا دھیان رکھتا تھا۔ ڈاکٹر شعیب۔ کے مطابق ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ گلناز کی بول چال بالکل نارمل تھی۔ بول چال میں کوئی رکاوٹ' بے ترتیبی یا ابنارملیٹی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ کافی حد تک صفائی ستھرائی کا بھی دھیان رکھتی تھی۔ کھانا پینا بھی نارمل لوگوں کی طرح تھا البتہ جذباتی سطح پر طاری جمود اور سپاٹ پن کو ختم کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کی سوچ' ادراک کیفیت اور ماحول سے مطابق رکھنے کی جسارت زیادہ متاثر ہوئی تھیں جن کے لیے باقاعدگی سے اسے دوائیں اور ہلکی پھلکی ای سی ٹی دی جاتی تھی۔ گوکہ طریقہ علاج بہت مہنگا اور طویل تھا مگر اجلال کمال حوصلے اور تحمل سے سب کچھ برداشت کررہا تھا۔ اس کے خیال میں یہ گلناز کے ساتھ اور اس مصائب۔ سے مغلوب گھرانے کے ساتھ بہت بڑی نیکی تھی۔

''سنو!'' ایک مدہم' متحیر سی پرشوق مگر جھجکی سی آواز پر بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹا کتاب پڑھتا ہوا اجلال ایک دم اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے مڑ کر اپنے بیڈروم کے دروازے کی طرف دیکھا۔ سبز رنگ کے صاف ستھرے لباس میں بھرے بھرے بدن سمیت گلابی چمکتی ہوئی رنگت لیے گھنی سیاہ لمبی ریشمی زلفیں شانوں پر پھیلائے بڑے معصومانہ انداز میں دروازے سے جھانک رہی تھی۔

''کیا بات ہے گلناز؟'' وہ نرمی سے پوچھنے لگا۔ ''آؤ اندر آجاؤ۔''

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر آگئی اور ٹیبل پر بیٹھنے لگی۔

''نہیں۔ یہاں نہیں بیٹھتے۔'' اس نے تحمل سے منع کیا۔ ''ادھر صوفے پر بیٹھو۔''

وہ کچھ لمحے الجھن بھرے انداز میں اسے دیکھتی رہی جیسے بات سمجھ نہ پارہی ہو۔ اجلال نے اسی نرمی سے دوبارہ بتایا تو وہ کچھ ہچکچا کر بیڈ کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی البتہ انداز روٹھا روٹھا سا تھا گویا اس بات کو پسند نہ کیا ہو مگر اس کا اظہار نہیں کیا۔

''یہ کیا چیز ہے؟'' کچھ دیر بعد وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پاٹ مدہم لہجے میں پوچھنے لگی۔ اس کا لہجہ کسی قسم کے اتار چڑھاؤ سے خالی تھا۔

''یہ کتاب ہے۔ تم پڑھوگی اسے؟'' وہ دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

وہ خاموش رہی۔

''کیا تمہیں پڑھنا آتی ہے یہ کتاب؟'' وہ اس کی سوچ کو ادھر ادھر کرنے کے لیے یونہی بولتا رہا۔

''پتا نہیں۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

''لو پڑھ کر دیکھو۔'' اس نے کتاب اس کی طرف بڑھائی۔ کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھے رہنے کے بعد گلناز نے کتاب پکڑلی اور اپنی گود میں رکھ کر خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا اب بھی وہ بوڑھا آدمی تمہیں تنگ کرتا ہے اور تمہیں دھمکیاں دیتا ہے؟'' وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

''آں۔ ہاں۔ نہیں۔'' وہ الجھن بھرے انداز میں سر کو ادھر ادھر گردش دینے لگی۔ ''اب زیادہ نہیں کرتا۔ پہلے تو جب بھی بولتی تھی یا سوچتی تھی۔ وہ ساتھ ساتھ کنٹری کرتا تھا۔'' وہ سادگی سے بتارہی تھی۔ لہجے میں سستی سی تھی۔

''اب تم کو تنگ کرے گا تو تم کیا کروگی۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''میں اس کو آگ میں ڈال دوں گی' جو بھی مجھے تنگ کرے گا۔'' اب اس کے ردعمل میں ایک جوش سا تھا۔

''کیا مجھے بھی؟'' یونہی لطف لینے کی خاطر وہ بے اختیار بول پڑا۔

''آپ کو......؟'' وہ لمبی لمبی پلکیں جھپکاتی کچھ دیر نرم نرم نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر اس کے کھنچے ہوئے تیوروں میں ایک تبدیلی رونما ہوئی' یوں لگا جیسے مسکرانے کی کوشش کررہی ہو۔

''نہیں۔ آپ کو نہیں پھینکوں گی۔'' بالآخر ایک نتیجے پر پہنچ کر بڑے پیارے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''اچھا۔ وہ کیوں؟'' وہ زیرلب مسکرا کر دلچسپی سے بولا۔

''آپ اچھے لگتے ہیں ناں مجھے!'' وہ بھولپن سے بولی۔

اجلال نے بری طرح چونک کر پہلی بار دھیان سے اسے دیکھا۔ اس جملے نے اس کی ہستی تہس نہس کردی تھی۔ گلناز کے چہرے پر شوق کی حرارت سی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اپنی انگلیوں کو

مسلتی ہوئی معصومیت سے پلکیں جھپکا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ نگاہ کے تجسس کے پس پردہ جھانکتی ہوئی اپنائیت نے اجلال کو سن کر دیا۔

''میں کس طرح اچھا ہوں۔'' وہ بمشکل خود پر قابو پاسکا تھا۔

''آپ مجھ سے پیار جو کرتے ہیں۔'' وہ بھی شاید بہن کی طرح جذباتی الفاظ کے استعمال میں فضول خرچ اور لاپرواہ تھی۔ بڑے مزے سے کہہ گئی۔

''آپ کا گھر بھی اچھا ہے۔ اب یہ میرا گھر بھی ہے ناں۔'' وہ اس کے پاس آ کر اپنا مومی گداز ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر جھنجھوڑتے ہوئے سادگی سے پوچھ رہی تھی۔

اجلال نے اڑے اڑے مختل حواس مجتمع کرتے ہوئے بڑی مشکل سے اس کے بھرے بھرے گداز گلابی وجود سے نگاہ چرائی تھی۔

''گلناز! اب تم اپنے کمرے میں جاؤ شاباش!'' وہ آہستگی سے اس کا ہاتھ ہٹا کر رخ پھیرتے ہوئے دھیرے سے بولا تھا۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا ضبط پارہ پارہ ہو کر بکھر جائے گا۔ دو تین بار بات دہرانے کے بعد وہ سر ہلاتے ہوئے اس کے بیڈ روم سے نکل گئی۔

اجلال نے اپنی تپتی ہوئی بے قرار مٹھیاں زور سے دیوار پر دے ماریں۔

وہ اب تک سیلف کنٹرول سے کام لے کر نفس پر کڑے پہرے بٹھاتا آیا تھا مگر پھر بھی ایک مرد تھا۔ گو کہ زمانے اور قانون کی نظروں میں تو وہ سرخرو تھا۔ چاہتا تو یہ استحقاق دھڑلے سے وصول کر سکتا تھا کہ کون دیکھنے ٹوکنے والا تھا۔ دنیا کی نظروں میں تو وہ اس کا جائز حقدار تھا مگر خدا کی ذات تو موجود تھی ناں۔ وہ جانتا تھا شرعی اعتبار سے حاملہ سے نکاح کا حق اس وقت تک نہیں وصول کیا جاسکتا جب تک کہ پیدائش کا عمل ظہور پذیر نہ ہو جائے اس کے علاوہ نکاح کے قاعدے قانون کے مطابق فریقین کا عاقل و بالغ اور سمجھ دار ہونا ضروری ہے ایک پاگل نکاح کے عمل سے مستثنیٰ ہے۔ وہ اس شرعی حد پر سختی سے قائم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ نکاح محض دنیا کی زبان بند رکھنے کے لیے کاغذی کارروائی ہے۔ شرعاً وہ اس سے ازدواجی حق وصول کرنے کا مجاز نہیں تھا۔ شرعی لحاظ سے اگر اس قسم کے بندھن کو قائم رکھنا ہو تو فریقین کے لیے لازم ہے کہ پیدائش کے بعد نئے سرے سے نکاح پڑھوا کر ایک دوسرے کے قریب آئیں وگرنہ شرع کی رو سے وہ ایک دوسرے کے لیے نامحرم اور اجنبی ہیں۔ پھر یہاں تو واضح صورتحال یہ بھی تھی کہ لڑکی شعور و فہم سے بے گانہ تھی۔ ایک پاگل اور دیوانے سے نکاح نہیں کیا جاسکتا۔ شرع اس کی

اجازت نہیں دیتی۔

ویسے تو ظاہر ہے یہ دو صورتیں نہ بھی ہوتیں تو بھی وہ اتنے ہی فاصلے پر رہتا کہ وہ خود کو پہلے ہی کسی کے نام کر چکا تھا۔ ''اگر یہ صورتیں موجود نہ ہوتیں تو گلناز کا ہے کو اس کے ہاں ہوتی۔'' اپنی سوچ پر وہ خود ہی مسکرا دیتا۔

گلناز جوں جوں شعور کی وادی میں قدم رکھ رہی تھی وہ تیزی سے اجلال کے قریب ہوتی جا رہی تھی اب وہ اجلال کی موجودگی اور غیر حاضری کو پوری شدت سے محسوس کرتی تھی۔ غیر ارادی طور پر بے چون و چرا اس کی ہدایات پر سر ہلا کر عمل کرنے کی کوشش کرتی تھی اور آج تو واضح انداز میں کہہ گئی تھی۔

''آپ مجھے اچھے لگتے ہیں' مجھ سے پیار جو کرتے ہیں۔''

اس کے ہمدردانہ اور نرم رویوں نے گلناز کی محروم زندگی میں جیسے پھول سے کھلا دیے تھے۔ وہ اس سے اپنائیت اور محبت کی توقع رکھتی تھی۔ اس کے سرسری نرم انداز کو اپنا حق سمجھنے لگی تھی۔ اجلال نے پہلے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا مگر آج جیسے وہ ٹھٹک کر رہ گیا تھا سرتاپا۔ وہ بے چینی سے سر کے بال کھینچتے ہوئے دوبارہ بستر پر گر پڑا اور یونہی کتاب کے صفحات پلٹنے لگا پھر اس کی نظریں چند اشعار پر جم سی گئیں۔

ہم نے سہہ لیا کافی
اب تمہاری باری ہے
ہم نے تو اداسی میں
زندگی گزاری ہے
فاصلوں سے جوئے میں
میں نے شام ہاری ہے
موت بھی ضروری ہے
زندگی بھی پیاری ہے

''فاصلوں سے جوئے میں' میں نے شام ہاری ہے'' وہ اس شعر کو زیر لب دہراتے ہوئے دیوار پر نظر جما کے جانے کیا کیا سوچنے لگا تھا۔

''بس ڈیڑھ ماہ رہ گیا ہے مزید عذاب کا۔'' شائستہ حساب لگاتے ہوئے بچوں کی کاپیاں چیک

کرتی زرگل سے کہہ رہی تھیں۔ ''فراغت کے بعد ایک ماہ تک تو ادھر ہی رہے گی گلناز۔ پھر......''
جانے کیوں وہ کچھ کہتے کہتے ہچکچا سی گئیں۔
''بس گلناز کے آنے کے کچھ عرصہ بعد میں تمہیں رخصت کر دوں گی۔'' ماں کے حتمی انداز پر زرگل نے ایک درز دیدہ نگاہ ان پر ڈالی۔
''مگر امی! میں آپ لوگوں کو اس طرح چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔'' وہ عاجزی سے بولی۔
''یہ موضوع زیر بحث آ چکا ہے' مزید کی گنجائش نہیں۔'' شائستہ نے سرزنش کے سے انداز میں کہا۔
وہ چپ سی رہ گئی۔
''بس اب تم خود کو ذہنی طور پر تیار رکھو۔ یہ بھی دھیان میں رکھنا کہ لوگوں کی طرف سے بہت کچھ سننے کو ملے گا۔ ایک کو طلاق دلوا کے دوسری کو اس سے نتھی کر دیا۔ شاید سالی اور بہنوئی کا کوئی چکر رہا ہوگا اور بھی جانے کیا کیا کہا جائے گا۔ بس تم کان لپیٹے رکھنا بلکہ میں تو اجلال سے کہوں گی شادی کے بعد کچھ عرصہ کے لیے کراچی لے جائے تمہیں۔ کچھ عرصے بعد جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو بھلے واپس آ جائے۔ ویسے تو خیر اب مجھے کسی کی پروا نہیں رہی۔ اتنا کچھ گنوا چکے ہیں......اب اور یہ زمانہ کس شے کی بھینٹ لے گا۔ اے ہاں یاد آیا۔ اجلال کو بڑا عرصہ ہو گیا ادھر آئے ہوئے۔ گلناز کیسی ہے؟ اس سے ملے تو شاید ڈیڑھ دو ماہ ہونے کو آیا ہے' سوچتی ہوں اب آج کل میں ادھر ہی جا رہا ہوں' ڈلیوری تک' ویسے تو ماسی بھروسے کی عورت ہے خیال رکھتی ہے مگر ماں کی بات تو اور ہوتی ہے۔''
''میں کل اسکول سے واپسی پر جاؤں گی ان کی طرف۔'' زرگل کو بھی فکر ہوئی' بڑا عرصہ ہو گیا تھا گلناز کو دیکھے ہوئے۔
''وہ شاید کوئی علاج کرا رہے ہیں آپی کا' پابندی سے ڈاکٹر کے ہاں بھی لے کے جاتے ہیں' کہہ رہے تھے گلناز کے لیے ماحول کی تبدیلی علاج میں خلل ڈالے گی' اس لیے ادھر نہیں لاتے۔''
''اللہ اس کو اس کی نیکی کا اجر دے بڑا بوجھ بٹایا ہے اس نے میرا۔ خدا اس کا دل نہال رکھے' اسے دین و دنیا کی کامیابیاں عطا کرے۔'' شائستہ بہت دل سے جذب بھرے انداز میں اسے دعائیں دے رہی تھیں۔
بالآخر وہ گھڑی آن پہنچی جس کے لیے یہ حکمت عملی اپنائی گئی تھی۔ گلناز کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرد گیا۔ رات کے بارہ بجے آپریشن سے بچی پیدا ہوئی' مگر وہ دنیا میں سانس لینے سے قبل ہی خالق حقیق سے جا ملی۔ گلناز نے اپنی دیوانگی میں سیڑھیوں سے گر کر چوٹ کھائی تھی۔ تین چار ماہ قبل۔ نتیجے کے ط

پر بچے کے سینے کی پسلیاں اور پھیپھڑے متاثر ہو گئے تھے۔ نظامِ تنفس کے درست کام نہ کرنے کی وجہ سے بچی ماں کے پیٹ میں ہی دم توڑ گئی تھی۔ شاید اس میں قدرت کی کوئی مصلحت تھی۔ حالانکہ ایسے مواقع پر گھر والوں کے چہرے دکھ کی تصویر بن جاتے ہیں مگر جانے کیوں یہ خبر پا کر شائستہ نے سکھ کی گہری سانس لی تھی۔

ہمیں پردے کے پیچھے چھپ کر دیکھنا اور مسکرا دینا
وہی مسکان دھیمی سی
وہی کچھ بولتی آنکھیں
وہی چپ چاپ سا لہجہ
وہی بے چین سی ہلچل
وہی سائے سے گھبرانا
وہی کہنے سے کچھ ڈرنا
وہی بے وجہ اٹھلانا
سبھی آثار کہتے ہیں
اسے مجھ سے محبت ہے

اور یہی ادراک اس کا سکون چین لے اڑا تھا۔ وہ رات رات بھر جاگتا رہتا تھا۔ اتنی وحشت اور بے بسی محسوس ہو رہی تھی جیسے گھٹن کے مارے دم ہی تو نکل جائے گا۔ گلناز میں بہت تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ ٹریٹمنٹ اور اجلال کی توجہ کی بدولت وہ شعور و فہم کی دنیا سے بتدریج مربوط ہوتی جا رہی تھی۔

ڈلیوری کے بعد ایک ہفتہ ہاسپٹل گزارنے کے بعد جب وہ گھر آئی تو کافی حد تک نارمل دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک دو دن آرام کرنے کے بعد نئے سرے سے گھر کی سیٹنگ کی تھی۔ پردے بدلے' کشن' بیڈ کور اور لحاف کے غلاف دھلوائے تھے۔ اجلال کے کمرے کی صفائی اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ اس کے وارڈروب کو سنوارتی۔ اس کے کاغذات سمیٹ کر رائٹنگ ٹیبل پر رکھتی تھی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوتا تو بڑی خوشگوار نظروں سے دیکھ کر سلام کرتی تھی' اس کے لیے چائے بنا کر لاتی تھی۔ کبھی یونہی انگلیاں مروڑتی بے وجہ اسے دیکھ کر پلکیں اٹھانے گرانے لگتی اور اجلال امتحان میں پڑ

جاتا۔ وہ الجھ الجھ جاتا تھا۔

ڈلیوری کے بعد اس کا ڈھیلا بھرا بھرا سراپا ایک دم اسمارٹ اور پرکشش ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنا خیال خود رکھتی تھی۔ گزشتہ چھ ماہ کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ اب اسے دیکھ کر مشکل سے ہی یقین آتا تھا کہ وہ ابنارمل بھی ہو سکتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس صبر آزما دور سے گزر کر کامیاب علاج کے بعد وہ خود کو ہلکا پھلکا اور بشاش محسوس کرتا۔

مگر وہ ایسا نہیں کر پا رہا تھا بلکہ پریشانیاں مزید بڑھ گئی تھیں۔ ہمہ دم کشمکش سی لگی رہتی تھی ذہن وقلب میں۔ گلناز کے رک کے جھجکتے والہانہ انداز اور شرمائی ہوئی منتظر نظروں کا مفہوم پڑھ کر وہ اندر ہی اندر سراسیمہ ہو جاتا تھا۔ وہ شعور کی منزلیں طے کرتے ہوئے تیزی سے نارملیٹی کی طرف بڑھ رہی تھی اور اسی رفتار سے اندر کے فطری تقاضے بھی پروان چڑھنے لگے تھے جنہیں محسوس کر کے اجلال کا دل وسوسوں میں گھرا جا رہا تھا۔

''آپ روز جلدی کیوں نہیں آ جاتے؟'' وہ اس کا کوٹ ہاتھ میں تھامتے ہوئے بڑے ناز سے مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

''میرا دل چاہتا ہے آپ ہر وقت میرے سامنے رہیں' میرے پاس۔'' انداز میں اتنی سرشاری اور بے ساختگی تھی کہ اجلال چکرا کر رہ گیا۔ ایک اچٹتی سی طائرانہ نگاہ اس پر ڈالی۔

سرخ لان کے سادہ سے سوٹ میں اس کی گلابی رنگت دمک رہی تھی سیاہ چمکدار ریشمی زلفیں ایک ادا سے دائیں شانے کی طرف سمٹی ہوئی تھیں۔ اس کا سراپا اتنا بھرپور اور پرکشش تھا کہ نظر چرانا ایک مرحلہ بن جایا کرتا تھا۔

''آپ اتنا لکھتے کیوں رہتے ہیں؟'' وہ جھٹ پٹ چائے بنا کر اس کے کمرے میں لے آئی تھی۔

وہ بیڈ پر بے ترتیبی سے دراز تھا۔ اس کے اندر داخل ہونے پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور چائے ہاتھ سے لے لی۔

''مضامین اور فیچر وغیرہ لکھتا ہوں۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔

''آج آپ نہیں لکھیں گے۔'' اس نے بڑے پیارے انداز میں معصومیت سے فرمائش کی۔

''پھر کیا کروں گا۔'' وہ زیر لب مسکرایا۔

''مجھ سے باتیں کریں۔'' اس نے بڑے شوق آمیز انداز میں کہا۔

''میرا دل چاہتا ہے آپ سے ڈھیروں باتیں کروں' ساری باتیں' آپ کی باتیں' لوگوں کی باتیں۔''

وہ چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لیے جگنوؤں کی طرح چمکتی آنکھیں سامنے کی پینٹنگ پر مرکوز کیے جیسے خواب کے سے عالم میں بول رہی تھی۔ اجلال نے اس کے چہرے پر درج زندگی کے پر بہار رنگوں کی تحریر پڑھی اور پھر جیسے پتھر کا ہو کر رہ گیا۔

''اگر میں تم سے دور چلا جاؤں تو......؟'' وہ بڑی دشواری سے اپنی پریشانی پر قابو پا کر دریافت کر رہا تھا۔

''تو پھر؟'' یکایک گلناز کی آنکھوں میں خوف اور وحشت دوڑنے لگی۔

''تو پھر......!'' اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھل گئی تھی۔

''تو پھر میں مر جاؤں گی۔'' وہ جیسے کسی حتمی نتیجے پر پہنچ کر ضدی پن سے اٹل لہجے میں بولی۔

اجلال کو لگا جیسے اس کی حسیات پتھر کی ہو گئی ہوں۔ جسم میں گردش کرتا خون ایک لمحے کو رکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔

''گلناز!'' وہ بیڈ پر اوندھا گر پڑا اور بھاری لہجے میں مخاطب ہوا۔ منہ تکیے میں چھپا ہوا تھا۔

''تم اپنے کمرے میں جاؤ اور دروازہ بند کرتی جاؤ۔'' وہ گہری گہری پرتپش سانسیں لے رہا تھا۔

اسی لمحے کال بیل ہوئی اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر باہر جاتا ماسی دروازہ کھول چکی تھی اور ان کی رہنمائی میں زرگل ادھر ہی چلی آئی تھی۔

''السلام علیکم!'' اس نے وارفتگی سے بہن کی طرف دیکھا تھا۔

گلناز کچھ لمحے کو ہچکچائی اور پھر زرگل کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے گلناز کے ہونٹوں پر اپنائیت سے بھرپور مسکراہٹ چمکتی دیکھی۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے قریب آ چکی تھی اور زرگل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دوستانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''ارے آپی! مجھے پہچانا آپ نے' میں زرگل ہوں۔'' وہ والہانہ گلناز سے لپٹ گئی تھی۔

''تم اچھی لڑکی ہو۔'' گلناز نے سادگی سے کہا اور زرگل کا چہرہ جوش سے تمتمانے لگا۔

''آپی! میری جان!'' وہ فرطِ محبت سے بہن کے ہاتھ چومنے لگی۔

امی نے بتایا تھا کہ گلناز میں بڑی سمجھ بوجھ بیدار ہو گئی ہے۔ اس وقت اس نے اس بات کو سرسری سا لیا تھا مگر اب اپنی نازک سی' خوبصورت سی ہنستی مسکراتی بہن کو دیکھ کر جیسے آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

وہ چھ ماہ قبل ڈاکٹر شعیب کی مریضہ بنی تھی۔ یہ چھ ماہ کس قدر انقلابی تبدیلی لائے تھے اس کے اندر۔ زرگل نہال ہوئی جا رہی تھی۔

"تم بیٹھو! میں چائے لاتی ہوں تمہارے لیے۔" وہ زرگل سے نرمی سے مخاطب ہوتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

"اجلال! آپ نے تو آپی کی کایا ہی پلٹ دی ہے۔" وہ مسرت سے گلنار چہرہ لیے آنکھوں پر بازو رکھے نیم دراز اجلال کی طرف مڑتے ہوئے خوشی سے چور چور لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"کیا بات ہے، طبیعت ٹھیک ہے؟" اس کی خاموشی پر وہ اس کے قریب چلی آئی اور تشویش بھرے انداز میں آہستگی سے اس کی پیشانی چھو کر دیکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ابھی اس کی گداز انگلیاں اس کی گرم پیشانی کو مس ہوئی ہی تھیں کہ اجلال نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔ عجیب سی وحشت بھری پر تپش گرفت تھی۔

زرگل نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا اور پھر بے ساختہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔ بے تحاشا سرخ بے خواب جلتی ہوئی آنکھیں عجیب سی بے قراری سے اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک اجڑی سی، ٹوٹی بکھری اذیت بھری جارحانہ کیفیت رقم تھی ان میں۔

"کیا ہوا اجلال؟" زرگل کا لہجہ جانے کیوں کانپ سا گیا تھا۔ وہ کس طرح دیکھ رہا تھا۔ اس کی فولادی انگلیوں کا دباؤ اس کے ہاتھ پر بڑھتا جا رہا تھا یوں جیسے اس کے نازک گداز ہاتھ کو انگلیوں میں پیس ڈالنے کے درپے ہو۔

"ہاتھ چھوڑیں اجلال! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" وہ اس کی خود سے بے گانہ کیفیت سے پریشان ہوئی جا رہی تھی۔ گلناز کسی لمحے آنے کو تھی، وہ کیا خیال کرتی یوں دیکھ کر۔

"تم کیوں میری زندگی میں آ گئی تھیں۔ بولو کیوں بار بار میرے سامنے آ کر میرا سکون برباد کرتی ہو۔ مجھے شکستگی کا احساس دلاتی ہو، کیوں میرے بہلے ہوئے دل کو پھر سے بہکا دیتی ہو، مت آیا کرو یہاں اور کتنا امتحان لو گی۔ خدا کے واسطے میری راہوں میں آ کر مت مجھے بھٹکایا کرو، اپنا بھگتان بھگتنے دو۔"

وہ ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے بے بسی، بے قراری اور عاجزی کے سے ملے جلے انداز میں کہہ رہا تھا۔ آنکھوں کی سرخیوں میں ہلکورے لیتی وحشت اس کے اعصاب کی توڑ پھوڑ کی واضح دلالت کر رہی تھی۔

"جاؤ یہاں سے، پلیز جاؤ، ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔" وہ گلدان کو پوری طاقت سے سامنے کی دیوار پر مارتے ہوئے اپنی بے ترتیب حدت بھری سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بے بسی سے دھاڑا تھا۔ وہ

اس کی طرف سے رخ موڑ چکا تھا۔

زرگل نے ایک متوحش نگاہ اس پر ڈالی اور پھر بجلی کی سی تیزی سے الٹے قدموں اس کے کمرے سے نکل گئی تھی۔

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی جو کہ ہے
آسماں حدِ نظر راہ گزر، راہ گزر، شیشۂ مے، شیشۂ مے
اور اب شیشۂ مے، راہ گزر، رنگ فلک
رنگ ہے مرے دل کا، خونِ جگر ہونے تک
چمپئی رنگ، کبھی راحتِ دیدار کا رنگ
سرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ
زرد پتوں کا خس وخار کا رنگ
سرخ پھولوں کے دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ
زہر کا رنگ، لہو کا رنگ، شبِ تار کا رنگ
آسماں، راہ گزر، شیشۂ مے
کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دکھتی ہوئی رگ
کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے
اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رُت
کوئی شے ایک جگہ پر ٹھہرے
پھر سے ایک بار ہر چیز وہی ہو کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر راہ گزر، راہ گزر، شیشۂ مے، شیشۂ مے

جب اس کے دل میں کسی جذبے نے کروٹ نہیں لی تھی تو وہ بار ہا اس کی دیوارِ دل توڑنے کے لیے کوہ کن بن کر آیا تھا۔ پے در پے دستکیں دے کر اپنے جذبوں کی سچائی کا یقین دلایا تھا۔ اتنا کہ وہ ناں ناں کرتے ہوئے بالآخر ہار گئی اور جب وہ اس کے حوالوں سے پلکوں کی منڈیروں پر خواب سجا بیٹھی تھی، وہ بدل چکا تھا بلکہ موسم بدل چکا تھا حالات بدل چکے تھے۔

امی جنہوں نے اتنے عرصے سے اس کو اس بندھن کا احساس دلا دلا کر بالآخر اس کے دل میں جوت جگا دی تھی۔ آج کل اس سے نظر چرائے چرائے پھرتی تھیں۔ ابھی کل ہی چور سے انداز میں مسز

مسعود کی کسی جاننے والی فیملی کے پروپوزل کے بارے میں بتا رہی تھیں۔

اور وہ جو اتنی بے قراری سے اس وقت کا منتظر تھا‘ وہ جیسے گھر کی راہ ہی بھول گیا تھا۔

ڈلیوری کے بعد پورا ایک ماہ گزر چکا تھا اور تین دل انجانے وسوسوں تلے دبے ہوئے تھے۔

امی‘ زرگل کو مخاطب کر کے کچھ کہنا چاہتیں مگر پھر ان کے ہونٹ بھینچ جاتے۔ وہ کوئی اور بات لے بیٹھتیں۔ ایک بیٹی کو آباد دیکھنے کے لیے دوسری کا دل برباد بھی تو نہیں کر سکتی تھیں۔

زرگل ہر روز اجلال سے بات کرنے اس کے گھر جانے کا پروگرام بناتی اور عین وقت پر نکلنے کے لیے بالکل تیار ہو کر ایک دم ارادہ بدل دیتی۔

اجلال کی نسان سنی کتنی ہی بار اس کے گھر کے آگے رکتی پھر وہ کچھ سوچ کر ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دیتا مگر تا بکے۔ فیصلے کی گھڑی تو بہر حال آنا ہی تھی سو وہ آ کر رہی۔

”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے مگر آپ کے یا اپنے گھر میں یہ بات نہیں ہو سکتی۔“ اس نے فون پر کہا تھا۔

”اور وہ تیسری جگہ روز اینڈ جسمین گارڈن ہی ہو سکتی ہے۔ میں خود بھی آج تمہیں کال کرنا چاہ رہا تھا مجھے بھی ڈسکشن کرنا ہے تم سے۔“ جواب میں اجلال نے کہا۔

اور اگلے روز شام کے وقت وہ امی کو بتا کر اس کے ساتھ گاڑی میں باہر جا رہی تھی۔ آج وہ قدرے اعتماد سے اس کے ہمراہ پارک تک آئی تھی۔ اب اس سے واضح رشتہ تھا آخر وہ اس کا بہنوئی تھا۔ جلد ہی انہیں پرسکون گوشہ مل گیا۔

”ڈاکٹر شعیب کیا کہتے ہیں مکمل صحت یابی میں کتنا عرصہ لگے گا؟“ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بالآخر زرگل نے یہ سکوت توڑ دیا تھا۔

”انہوں نے بتایا تھا کہ گلناز اپنی پچھلی شخصیت بھول چکی ہے۔ ماضی کے ساتھ اس کے ذہن کا کوئی لنک نہیں رہا۔ اس کا ذہن اس وقت صاف سلیٹ کی مانند ہے جو پرنٹ کریں گے وہی سمجھ لے گی۔ ظاہر ہے شخصی تشکیل سازی کا یہ کام بتدریج طے پائے گا۔ خاصا وقت درکار ہوگا اسے پوری زندگی کے ہر پہلو سے باخبر اور مختلف افعال میں حصہ لینے میں۔“

وہ طویل سانس لے کر آہستہ آہستہ بتاتا رہا۔

”ہوں‘ اس کا مطلب ہے بالآخر وہ شعور کی سطح کو پہنچ گئی ہیں۔ یہ بھی بہت بڑی کامیابی ہے۔“ وہ

دیتے ہوئے خوشگوار انداز میں بولی۔

اجلال نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

”وہ کیا بات تھی جو تمہیں کہنا تھی؟“

اجلال کے پوچھنے پر ایک لمحہ کو زرگل کے دل کی دھڑکنیں تھم سی گئیں۔

”آپ نے بھی تو ڈسکشن کرنا تھی‘ پہلے آپ کہہ دیں۔“

وہ جانے کیوں پہلو بچا گئی تھی کہ کچھ لمحہ اور خوش رنگ خواب کی سرزمین پہ رہنا چاہتی تھی۔

”میں کہہ تو دوں مگر کیا تم سننے کی تاب لا پاؤ گی؟“ پھر وہی جواب‘ وہی جملہ‘ وہی لہجہ کی معنویت مگر نداز اور تیور گردِ حوادث سے بوجھل اور تھکے تھکے تھے۔ وہ مخصوص شوخی‘ شرارت اور زندگی کے رنگوں ے بھرپور تاثر جیسے کہیں کھو سے گئے تھے۔ زرگل نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو نظر لی۔ جانے کس کاٹ ڈالنے والے تکلیف دہ احساس نے زرگل کی آنکھوں میں نمی سی چمکا دی مگر یہ رف لمحاتی کیفیت تھی۔ وہ نمی پلکوں تک پہنچنے اور چھلک کر باہر آنے سے پہلے ضبط کی تہہ میں جا چھپی تھی۔ آہستگی سے نظر چرا کر بالآخر وہ کہنے لگی۔

”اجلال! کچھ عرصہ قبل آپ نے پہاڑ جتنے ظرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری بات کا بھرم رکھنے کو آپی کو ایسی حالت میں اپنایا تھا جس میں ایک ہوشمند لڑکی کو بھی موت کے سوا کوئی قبولنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اگر آج میں دوبارہ یہ درخواست کروں کہ آپی کے ماضی کے آلودہ لمحوں سے قطع نظر اسی ظرف کے ساتھ انہیں موجودہ حالت میں ہمیشہ کے لیے اپنا لیں تو کیا آپ میری بات پر غور کر سکتے ہیں؟“

وہ سر جھکائے پوری طاقت صرف کر کے بمشکل تمام بات پوری کر سکی تھی اور اب اس طرح تیز تیز سانس لے رہی تھی جیسے طویل فاصلہ طے کر کے یہاں تک پہنچی ہو۔ ویسے اس میں شک بھی کیا تھا۔

جواب میں اجلال کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی اداس مسکراہٹ در آئی۔

”میں کیا جواب دے سکتا ہوں۔ ماسوائے اس کے کہ

موت بھی ضروری ہے
زندگی بھی پیاری ہے
فاصلوں سے جوئے میں
میں نے شام ہاری ہے

میں نے ایک بار تم سے کہا تھا کہ صرف دل کے محاذ پر تم سے ہارا ہوں اس کے علاوہ زندگی کے کسی

محاذ پر ہار نہیں مانی اور اب زندگی کی ایک شام بھی نہیں ہار سکتا۔ جس وقت میں نے یہ کہا تھا اس وقت یہی خیال تھا کہ محض چند ماہ کا فاصلہ ہے وصل کے بیچ' یہ خبر نہیں تھی کہ فاصلوں کی یہ مدت تمام عمر پر محیط ہو جائے گی۔ ہار تو میں اسی شام گیا تھا۔ تقدیر کے فیصلے کے ہاتھوں۔ مگر اس کا ادراک مجھے تب ہوا جب گلناز میری توجہ اور تعلق کے طفیل مجھ سے امید باندھ بیٹھی۔ بہت دن کشمکش میں رہا' تمہیں کھونے کا تصور کیسے کر سکتا تھا جسے پانے کے لیے میں نے آزمائش کے اس پل صراط کو عبور کرنا گوارا کر لیا تھا منزل پہ پہنچنے کے بعد بے نیل و مرام رہنا کون پسند کرتا ہے۔ ایک طرف میرا دل تھا' جذبے تھے' برسوں کی تھکن اور پیاس تھی اور دوسری طرف گلناز کا پرامید چہرہ جس کی زندگی کا انحصار میرے وجود کی صورت میں دلائے گئے اعتبار پر تھا۔ اس کی موجودہ کیفیت' اس کی آئندہ زندگی کا خیال' اس کی ذہنی حالت اور مجھ سے شدید جذباتی وابستگی کا کھلم کھلا اظہار' سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہونے لگا لیکن پھر بالآخر ایک نتیجے پر پہنچ ہی گیا۔ کسی کی زندگی بچانا' اپنا دل بچانے کی نسبت زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ سو میں نے گلناز کی زندگی بچانے کے لیے اپنا دل اور اس کی خواہش گنوا دی۔ تم نے تو آج درخواست کے سے انداز میں کہا ہے مجھ سے اگر اسی سابقہ دھونس بھرے چیلنجنگ انداز میں کہتیں تو بسر و چشم مان لیتا۔"

ایک بے معنی سی آزردہ مسکراہٹ ایک لمحے کو اس کے چہرے پر جھلکی تھی۔

"میرا آج شام گلناز کے ہمراہ مسجد کے مولوی صاحب کے پاس جانے کا پرگرام ہے تاکہ نکاح کی رسم ادا کر کے پوری ایمانداری کے ساتھ اسے اپنا آپ سونپ دوں۔ وہ اب تک میرے اور اپنے درمیان استوار رشتے کی نوعیت سے بے خبر ہے میں نے بھی اسی لیے نہیں بتایا کہ رسم پوری کرنے کے بعد اس وقت عملاً اسے اس رشتے سے روشناس کرواؤں گا جب شرعی اعتبار سے اس کا اہل ہو جاؤں گا۔ اس کے حساب سے آج ہی میاں بیوی بنیں گے۔"

"بہت اچھا اور نیک ارادہ ہے آپ کا' خدا آپ کو آپ کے مقصد میں کامیاب کرے۔"

بڑی کوشش کے بعد دل کو منا بہلا کے وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رمق لا پائی تھی مگر اس تبسم کی ویرانی اور کھوکھلا پن چھپائے نہیں چھپ رہا تھا۔

"ہاں' اب تو یہی دعا کرنا کہ جتنے ظرف اور حوصلے سے یہ فیصلہ کیا ہے۔ اتنی ہی مضبوطی سے اس پر قائم رہ سکوں۔" وہ آسمان پر ڈھلتے سورج کی بکھری نارنجی شفق رنگ کرنوں پر نظر جما کے بھنچے بھنچے انداز میں بولا۔

"شام تو ہو گئی ہے' آپ جائیں اب' آپی آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ میں تھوڑی دیر بعد [جا]ؤں گی۔ یہ سماں بہت اچھا لگ رہا ہے۔" وہ لہجے کو عام اور بشاش سا رنگ دینے کے لیے بڑی [جد و] جہد کر رہی تھی مگر لہجے میں پگھلتی' ٹوٹتی آزردگی جیسے اس کی کوششوں کو ناکام بنائے جا رہی تھی۔

"تم کیا کرو گی زرگل! آگے کیا ارادے ہیں۔" وہ اس کی بات نظر انداز کر کے یک دم پلٹ کر [اس] کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"امی بتا رہی تھیں مسز مسعود کے توسط سے کوئی پروپوزل آیا ہوا ہے۔"

اجلال کے ست پڑتے بے جان لہجے میں چھپا استفسار وہ سمجھ گئی تھی۔ خود کو لاپرواہ ظاہر کرنے کے [لیے] کندھے اچکا کر بولی۔

"وہ بعد کی بات ہے۔ ابھی میں کچھ عرصے سکون کی ٹھنڈی' گہری' آزاد نیند لینا چاہتی ہوں۔ [بہت] تھک گئی ہوں۔ کچھ لمحے آزادی سے ستانا چاہتی ہوں۔ خود سے خود کو نئے سرے سے جوڑنے [کے] لیے وقت کے کچھ لمحے چرانا چاہتی ہوں۔"

وہ جیسے خواب کی سی کیفیت میں بے اختیاری کے عالم میں دھیرے دھیرے خود کلامی کر رہی تھی۔ [اجلا]ل نے کچھ بے چین ہو کر اسے دیکھا پھر دوبارہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"اور کچھ نہ سہی' زندگی کی ایک شام تو اپنے دل کے نام کر سکتا ہوں۔ میں یہ لمحے تمہارے سنگ بتا [کر] یاد کے کچھ حسین موتی چننا چاہتا ہوں۔"

"میری خواہش ہے اور دلی دعا ہے کہ آپ جسم و جان اور روح و دل کے تمام تر لوازمات سمیت [گلناز] کا نصیب بنیں۔ خالی وجود کتنے عرصے تک بقا کا ایندھن ثابت ہو سکتا ہے۔ زندگی کی امنگ بیدار [کرنے] کے لیے دل کی سرزمین بھی درکار ہوتی ہے خدا کرے آپی اس تک بھی رسائی پا لیں۔ آپ پلیز [جائی]ں یہاں سے۔ میں ایک شام کا قرض بھی اپنے ذمے نہیں رکھنا چاہتی' پلیز۔"

وہ جلد از جلد اسے یہاں سے رخصت کرنا چاہتی تھی۔ ڈر تھا کہ کہیں اس کے لہجے اور آنکھ سے [چھلک] پڑنے والی کربناک پکار اجلال کے حوصلوں کی چٹان میں دراڑ ڈالنے کا باعث نہ بن جائے۔ [اس س]ے پہلے وہ اسے نگاہوں سے اوجھل دیکھنا چاہتی تھی۔

"جائیں ناں۔" اسے خاموشی سے خود پر نظریں جمائے کھڑا دیکھ کر وہ منت اور عاجزی سے دوبارہ [کہن]ے لگی۔

اور اس کا جانا طے تھا کہ وہ اس کے ہمراہ گزرنے والی زندگی کی ہر شام ہار چکا تھا مگر یہ وہ ہار تھی جو [اس] نے بخوشی اپنے لیے تجویز کی تھی۔ اس جوئے میں کون ہارا کون جیتا۔ یہ سوال اضافی تھا۔

اجلال نے آخری الوداعی نگاہ اس پر ڈالی۔

نگاہ جو تشنگی' آرزو اور دل کی گرفتگی کا مظہر تھی اور پھر وہاں سے چل دیا۔

زرگل اسے جاتا دیکھتی رہی' دیکھتی رہی حتی کہ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ اجلال کا ہر اٹھتا ہوا قدم اسے اس سے دور لے جا رہا تھا اور اس بات کا واضح عکاس تھا کہ

فاصلوں کے جوئے میں
میں نے شام ہاری ہے

اردگرد سورج کی نارنجی ملگجی کرنوں نے عجب سا سماں باندھ رکھا تھا۔ درختوں میں گم ہوئی شفق رنگ کرنیں کتنی مضمحل اور بے جان سی محسوس ہو رہی تھیں۔ سورج کوئی دم جاتا تھا غروب ہونے کو تھا۔ وہ بے جان سے انداز میں آلتی پالتی مارے گھاس پر بیٹھی اپنی خالی مٹھیوں کو تک رہی تھی۔

صفحہ دہر پہ کرب کی
خونچکاں آیتیں ثبت تھیں
اور میں پڑھ رہا ہوں انہیں
میں نہ پیغمبر' نہ میں فلسفی اور نہ میں دیوتا
ان کی تعظیم کرتا ہوں جو زندگی کی اور روشنی کے لیے
مر گئے اور مر جائیں گے
میرے احساس کی آنکھ پتھرا چلی
زندہ الفاظ کے درد میں
اس سے پہلے کہ سارا لہو کھینچ لے
مرگ آثار سفاک' ظالم ہوا
اے خدا اے خدا
آ میرے دکھ میں کچھ تو بھی حصہ بٹا

کیوں زندگی کی راہ میں مجبور ہو گئے
اتنا ہوئے قریب کہ ہم دور ہو گئے
یہ تو نہیں کہ ہم کو کوئی بھی خوشی نہیں

لیکن یہ زندگی تو کوئی زندگی نہیں
کیوں اس کے فیصلے ہمیں منظور ہو گئے
پایا تمہیں تو ہم کو لگا تم کو کھو دیا
ہم دل پہ روئے اور یہ دل ہم پہ رو دیا
پلکوں سے خواب کیوں گرے کیوں چور ہو گئے
کیوں زندگی کی راہ میں مجبور ہو گئے

کس قدر برجستہ بول تھے۔ وہ گلوکار کی آواز میں جیسے کھو کر رہ گیا۔ پھر جونہی گانا ختم ہوا اس نے اپنے ساتھ والی سیٹ کی طرف دیکھا۔ خوشیوں سے بھیگے چمکتے دمکتے رنگوں سے بھرپور سراپا گلناز بڑے پرشوق انداز میں گاڑی کے شیشے سے باہر بھاگتی دوڑتی چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ اجلال کے احساسات میں عجیب سا بھونچال اٹھنے لگا۔

''شٹ'' اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبا کر کیسٹ پلیئر میں سے کیسٹ باہر نکال کر ایک لمحے کو کچھ سوچا۔ اور پھر پوری قوت سے وہ کیسٹ باہر اچھال دیا۔

''تم خوش ہو نا گلناز؟'' گھر کے آگے گاڑی روکتے ہوئے وہ لہجے میں بشاشت بھر کے پوچھ رہا تھا۔

وہ نکاح کی رسم ادا کرنے کے بعد گھر آئے تھے۔

''اب تم ہمیشہ اسی گھر میں رہو گی میرے پاس۔ اب تو تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے ناں۔'' وہ بہت دھیمے نرم انداز میں دریافت کر رہا تھا۔

گلناز نے حیا آمیز انداز میں نفی میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر اس خوشی کا اظہار کرو بابا۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے مسکرایا تھا۔

''کیسے؟'' وہ جھجکتے' کترائے انداز میں خوشی سے چھلکتے لہجے میں آہستگی سے منمنائی۔

''میں کیا جانوں۔'' اس نے شوخی سے کندھے اچکائے۔

''میں کچھ دیر کے لیے ٹیرس پہ جا رہا ہوں' تب تک تم سوچ لو۔''

اور اب ٹیرس پہ بے چین قدموں سے ٹہلتے ہوئے وہ بے قرار سوچوں سے نبرد آزما تھا۔

محبت ایک عالمگیر جذبہ ہے۔ یہ حدوں کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ سمندر کی طرح لامحدود اور بیکراں ہوتا ہے۔ روپ بدل لیتا ہے مگر تاثیر نہیں بدلتا۔ محبت کی معراج انسانیت ہے اور انسانیت تو وہ مقام ہے جس پر پہنچنے کے لیے فرشتے ایڑیاں رگڑتے ہیں۔ آدمی محبت کرتا ہے مگر جب وہ آدمی سے انسان کے

مرتبے پر پہنچ کر محبت کرتا ہے تو اس کی انتہا کل عالم کے لیے خیر کی گھٹا بن کر سب کو سیراب کرنے کی
خواہش کی سرحدوں تک پہنچ جاتی ہے۔

بالآخر وہ فیصلہ کن انداز میں نیچے آیا اور اپنی وارڈروب کے نچلے خانے سے ایک پیکٹ نکال کر
کھولتے ہوئے گلناز کو پکڑانے لگا۔

بہت خوبصورت، جھلمل کرتا عروسی جوڑا اس کے سامنے تھا جسے اجلال نے کچھ عرصہ قبل بڑی چاہ
سے زرگل کے لیے خریدا تھا۔ ساتھ میں سونے کا نازک سا سیٹ بھی تھا۔ راتوں کی تنہائیوں میں وہ چشم
تصور سے کتنی ہی بار زرگل کو اس جوڑے میں ملبوس اس کے لیے اپنا روپ سجائے اپنے بیڈروم میں ادھر
ادھر آتے جاتے شرماتے، مسکراتے دیکھا کرتا تھا۔

گلناز نے بنا کچھ پوچھے حجاب آمیز شوق لیے پیکٹ اس سے لے لیا اور ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے چہرے پر تفکرات کے سائے کے لیے گہری سانس بھرتے ہوئے
آنکھیں موند کر ایزی چیئر پر دراز ہو گیا۔ جانے کتنی ساعتیں یونہی بیت گئیں۔ خبر ہی نہ ہوئی کب گلناز
اپنا روپ سجا کے ڈریسنگ روم سے کمرے میں داخل ہوئی اور کب اس کے قریب آئی۔ پرفیوم کی مسحور
کن خوشبو کے احساس نے یک دم اسے چونکا دیا تھا۔ آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔

گلناز اس کے بالکل سامنے کھڑی ہولے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے جھینپے جھینپے انداز میں
مسکرا رہی تھی۔ اس کو آنکھیں پٹپٹاتے دیکھا تو بے ساختہ ہنس دی۔ وہ اس کی ہدایت کے مطابق اپنی
خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

وہ بھی آہستگی سے مسکرا دیا اور اپنے کندھے پر رکھے سفید گداز مخروطی ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھ کی پناہ
بخشتے ہوئے ''وفاداری بشرط استواری'' کا پہلا سبق گلناز کو پڑھانے لگا۔

چلو زندگی کو محبت بنا دیں

''چلو زندگی کو محبت بنا دیں۔ چلو زندگی کو
چلو زندگی کو محبت بنا دیں۔
چلو زندگی کو......''

حسب عادت دو دو تین تین سیڑھیاں اکٹھی پھلانگتے ہوئے گنگناتی ہوئی وہ اپنی دھن میں مگن
نیچے آ رہی تھی۔

''اے ہے۔ میں کہتی ہوں جمیلہ نے آخر کس چیز کا بدلہ لیا ہے مجھ سے جو یوں بھاڑ سے دھڑلے سے
رشتہ مانگنے چلی آئیں۔''

نیچے چچی فرحت ماتھے پر سو تیوریاں لیے انتہائی بگڑے بگڑے انداز میں امی کو سنا رہی تھیں۔

''بندے کو کچھ لحاظ، کوئی حجاب بھی ہونا چاہیے۔ میں کہتی ہوں، کس منہ سے کہہ دیا اس نے سائرہ

کے رشتے کے لیے۔ حیا تو نہ آئی۔ سائرہ آخر اس کی بھی بھتیجی ہے۔ اس کی اپنی بھی تو بیٹیاں ہیں۔ ایک نہ دو پوری چار۔ ان کو بھی پرائے گھر بھیجنا ہے۔ کیا ان کے لیے ایسے ویسے رشتوں کو گھاس ڈالے گی؟ اور طرح کے لڑکے ڈھونڈے گی؟ لو بتاؤ۔ کہتی ہیں محترمہ کہ خدا ترسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ آخر حماد میں کس شے کی کمی ہے۔ اب تو برسرِ روزگار ہے۔ دیکھنے میں بھی ماشاءاللہ اونچا پورا ہے۔"

چچی جمیلہ تائی کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے یہ کہہ رہی تھیں۔ اُن کی اپنی شکل اس کوشش میں ایک عجیب سی بن گئی تھی کہ تمشین کو فی الواقع ہنسی پر قابو پانے کے لیے خاصی جدوجہد کرنی پڑی۔

"میں کہتی ہوں' یہ دو دن میں وہ ہر لحاظ سے اچھا ہو گیا۔ ساری کمی کجی جاتی رہی اور کل تک جب اس کو اپنی جوتیوں اور کوسنوں کے نیچے رکھتی تھیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دن میں ہزار بار جھولی بھر کے اس کو اور اس کی ماں کو بددعائیں دیتی تھیں۔ اس کی شکل پہ تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ آج اس کا بیٹا بن گیا اور چلی آئیں بیٹے کا رشتہ لے کر میری بیٹی کے لیے۔" چچی فرحت مارے طیش کے ہانپنے لگی تھیں۔

"میں کہتی ہوں اُسے۔"

"آئے ہائے' چچی جانی کو کیا ہو گیا۔ جو آج آپ کے زیرِ سایہ زمین میں یہ آسمان کانپ اُٹھے ہیں۔ یہ تھانیدارانہ تفتیشی انداز تو آپ کی عادت ہے مگر آج تو ایسے جلال میں ہیں کہ گردوں کو پسینہ آئے۔"

تمشین ان کے پاس بیٹھ کر چہرے پر خوفزدہ سی کیفیت طاری کر کے درحقیقت مزا لیتے ہوئے دریافت کر رہی تھی۔

"ارے ہونا کیا تھا۔ وہ تمہاری تائی جمیلہ' سائرہ کا رشتہ مانگنے آئی تھیں آج حماد کے لیے۔" چچی نے حماد کو یوں دانت پیس کر ادا کیا گویا سچ مچ ہی موصوف دانتوں کے نیچے آ گئے ہوں۔

"اچھا۔" تمشین حیران تو تھی مگر اتنی زیادہ نہیں۔

"بھلا بتاؤ' وہ ہے اس قابل کہ میری سائرہ کا جوڑ بن سکے۔" چچی کے لہجے میں نخوت تھی۔

"کیوں کیا ہوا اس بے چارے کو۔" تمشین بی بی کو ویسے تو حماد رضوی کی رتی بھر پروا نہ ہوئی تھی زندگی بھر اس وقت یونہی تسلسل میں پوچھ بیٹھی۔

"اے لو۔ اور سنو۔" چچی فرحت کو پتنگے لگ گئے۔ "میں کہتی ہوں کہ لڑکی کچھ ہوش کے ناخن لے لو۔ ارے کہاں سائرہ کہاں حماد۔ ہماری اونچی کھری' ستھری' اعلا ذات اور حماد کی ماں۔ ہونہہ۔"

چچی کا چہرہ تنفر و تحقیر اور تمسخر کے جذبات سے سکڑ سا گیا تھا۔ تمشین کو فی الواقع سخت برا لگا۔

"خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ نسل تو باپ سے ہی چلتی ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ وہ تایا جان بیٹا ہے۔ ان کا خون۔"

"میں کہتی ہوں لڑکی خوامخواہ منہ کو نہ آؤ۔" چچی فرحت اس کا سچ ہضم نہ کر پائیں قدرے آتش زیرِ پا ہو لیں۔

"آپ تو کہتی ہی رہتی ہیں۔ کب چپ ہوئی ہیں" اس نے لاپروائی سے پیشانی کے بال پرے کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے کس نے نام رکھ دیا تھا آپ کا یہ "عکس بر عکس" قسم کا۔" اس کے لہجے میں زیرِ شرارت تھی' چچی کا چہرہ آتش فشاں بننے لگا۔

"کیا بے کار کی بحث میں لگی ہوئی ہو۔ جاؤ۔ اپنی چچی کے لیے چائے بناؤ۔"

عالیہ بیگم فطرتاً صلح جو اور امن پسند' کم گو سی خاتون تھیں۔ ویسے ہی لڑائی جھگڑوں اور بحث و مباحثے سے گریزاں رہتی تھیں۔ پھر اخلاق و مروت اور لحاظ میں بھی پورے خاندان میں سراپا مثال سمجھی جاتی تھیں۔ لہٰذا دیورانی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بروقت انہوں نے بیٹی کو ٹوک کر منظر سے ہٹانے کا سامان ڈھونڈا کہ بہرحال بیٹی میں ان کے مزاج کے جراثیم نہایت قلیل مقدار میں منتقل ہوئے تھے۔

"بہت بے لگام ہوتی جا رہی ہے۔ سمجھا کے رکھا کرو' آگے یہ چرب زبانی کام نہیں آئے گی۔" چچی بری طرح تپ کر عالیہ بیگم سے کہہ رہی تھیں۔

"دیکھیے چچی! آپ ذاتیات پر اتر رہی ہیں۔" وہ بھی کون سا کم تھی۔

"میں نے کیا کہا ہے؟" عالیہ بیگم نے اب کے گھور کر دیکھا۔ وہ بادلِ نخواستہ اٹھ گئی۔

"میسنی' گھنی' چالاک تو دیکھو۔ مجھے پر چار رہی تھی۔ بڑی اچھی جاب پر لگ گیا ہے۔ کھلا کماتا ہے۔ سرکاری کوٹھی بھی ملی ہوئی ہے۔ گاڑی بھی لے لی ہے۔ گھر بھی سنبھالا ہوا ہے۔ یہ ہے وہ ہے۔ ارے شرم تو نہیں آتی' ابھی دو سال پہلے تک تو یہی ملعون' بدذات اور نیچ تھا اب یہ "بیٹا" ہو گیا۔" فرحت چچی اپنی سابقہ "لے" میں لوٹ آئی تھیں۔

وہ ٹھٹھک کر دروازے پر رک گئی۔

"چلیں چھوڑیں۔ آپ سیدھا سیدھا انکار کہلا دیں قصہ ہی ختم۔"

عالیہ بیگم نے تحمل سے انہیں مسئلے کا حتمی حل بتایا۔ "وہ تو میں نے کر دیا تھا۔ اسی وقت منہ پر ہی۔ لو بھلا

تمہارا کیا خیال ہے۔ میں چپ سادھے سنتی رہتی۔'' چچی نے فٹ سے جواب دیا تھا۔
''بھلا ایسی توقع کی جاسکتی ہے آپ سے؟'' وہ رہ نہ سکی تھی۔
چچی فرحت نے گردن موڑ کر ٹیڑھی آنکھوں سے اسے دیکھا اور نئے سرے سے آگ بگولا ہوگئیں۔
''لڑکی! تم نے آج ضرور مجھ سے کچھ سننا ہے۔ میں کہتی ہوں' یونیورسٹی میں پڑھنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ادب لحاظ ہی ختم ہوجائے۔ ایسی تعلیم سے تو جہالت لاکھ درجے اچھی ہے۔ میں کہتی ہوں عالیہ۔''
''ارے برائے خدا آپ آگے کچھ نہ کہیے۔ میری معصوم سی اماں کو پٹی نہ پڑھائیے' ہم تسلیم کی خو ڈال لیتے ہیں۔ مجال ہے جو یہ نکتہ اعتراض اٹھاؤں۔'' وہ یکلخت پینترا بدل گئی تھی۔
''تمشی' میں نے تمہیں کیا کہا ہے۔'' اس بار عالیہ بیگم سچ مچ غصے میں تھیں۔
''جا رہی ہوں' جا رہی ہوں۔ بلکہ یہاں سے ہی جا رہی ہوں۔ نیلو کے پاس' وہ کہہ کر چھوٹی چچی کے پورشن کی سمت آگئی۔
''نیلو کہاں ہے بھابی! آئی نہیں آفس سے؟'' سلام دعا کے بعد اس نے ارم بھابی سے دریافت کیا تھا۔
''آچکی ہے۔ کب کی۔ شاید کمرے میں ہے'' بھابی شام کے لیے سبزی بنانے میں مصروف تھیں۔
''اچھا' جلدی نہیں آگئی آج۔'' وہ اٹھ کر کمرے کی سمت بڑھی تھی۔
بیڈ کے بیچوں بیچ دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے جوتوں سمیت بغیر چینج کیے دراز وہ سیدھی چھت کو گھور رہی تھی۔ آہٹ پر چونکی ضرور مگر صرف نظروں کو زحمت دی پوزیشن تبدیل نہیں کی۔
''آئیے جناب!''
''کیا بات ہے۔ بڑی تھکی تھکی لگ رہی ہو؟'' تمشین نے اس کے تساہل آمیز لہجے پر غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
''نہیں۔ کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔'' وہ اٹھ بیٹھی۔
''تو پھر عام ہی بتادو۔'' تمشین سائیڈ ٹیبل سے رسالہ اٹھا کر یونہی ورق الٹتے ہوئے پوچھنے لگی۔
''تجھے تو پاگل بنادیا ہے ناں جناب ستار نے اور اس کی عبادت گزاری نے۔ ہائے کہاں وہ محترمہ نیلو فیشن' میوزک' مووی کی دلدادہ اور کہاں یہ نمونہ۔''
''بکواس نہیں۔'' نیلو نے جھڑکا۔'' زندگی تمہاری طرح صرف ہی ہا ہا پر مشتمل نہیں ہوتی۔ زندگی کا

اصل روپ دیکھو تو آنکھیں کھلیں۔''
''جس طرح تمہاری کھلی ہیں۔ اور بائی داوے آنکھیں کھلنے کی تاریخ نوٹ کرلی تھی؟''
وہ مسلسل مائل بہ شرارت تھی۔
''تمشی۔'' نیلو زچ ہوگئی۔'' مجھے تنگ کرنا ہی مقصود ہے تو اپنی تشریف لے جاؤ یہاں سے''
''ارے بھئی سینئر ہوں گے وہ تمہارے۔ میرے کیا لگتے ہیں۔ جو ادب آداب ملحوظ خاطر رکھوں۔ ہاں مستقبل میں جب جائز رشتے سے بندھ جائیں گے تب ضرور۔''
اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ نیلو نے ایک ساتھ دو کشن اس کی سمت اچھال دیئے۔
''تم حد سے زیادہ بدتمیز ہو۔ شرم تو نہیں آتی میں ان کی صرف عزت کرتی ہوں۔''
''تم تو کہہ رہی تھیں تمہیں اچھے لگتے ہیں وہ۔''
''ہاں تو اچھا بندہ کسے برا لگتا ہے۔ پھر وہ تو ویسے بھی بہت نائس' بہت ڈیسنٹ ہیں۔ اتنی بھرپور اور سوبر پرسنالٹی کے مالک ہیں'' نیلو کی آنکھوں کی چمک دوچند ہوگئی تھی۔ تمشین بغور اس کے چہرے' لہجے اور آنکھوں کے تاثرات پڑھ رہی تھی۔
''ہمارا معاشرہ خوف کی قید میں بند لوگوں کا معاشرہ ہے۔ سچ بھی بولتے ہیں تو لبادوں میں چھپا کر کہیں یہ سچائی سزا کی صلیب تک نہ لے جائے۔ یہ تم جو ہمہ وقت اخلاق و مروت کے رنگوں میں سجا کر ان کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کرتی رہتی ہو۔ کیا سمجھتی ہو ان کے پیچھے اُگے من پسند جذبوں کے جنگلوں سے اٹھتی خوشبوئیں محض تم تک ہی محدود رہتی ہوں گی۔''
تمشین نے کچھ اس انداز میں اس کا گھیراؤ کیا تھا کہ پانسا پلٹنے کی سوچ نیلو کے اندر ہی دم توڑ گئی تھی۔ وہ خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
''تمشین' پلیز وہ راہیں نہ دکھاؤ جہاں منزل پہ صرف تاریکی منتظر ہوتی ہے۔'' نیلو کی آواز کانپ رہی تھی۔
''اس راہ میں دیکھنے دکھانے کے زمانے کہاں آتے ہیں؟'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
''ارے ہاں' تمہیں اس وقت زبردست سین دیکھنے کی خواہش محسوس ہو رہی ہے؟'' وہ ایک دم جیسے نئے سرے سے ''الائیو'' ہوگئی تھی۔
''کیا مطلب؟'' نیلو نے الجھن بھری نظروں سے دیکھا۔

جواب میں تمشی نے ابھی کچھ دیر پہلے کے واقعے کو بمعہ چچی کے صوت وساختی تاثرات سمیت بیان کر ڈالا۔ نیلو بھی خاصی متعجب تھی۔

''جمیلہ تائی میں اس بے چارے کے۔ لیے کہاں سے ہمدردی کے سوتے پھوٹ پڑے؟ اور فرحت چچی کا ردعمل بھی خاصا حیران کن ہے۔ اس میں اتنا سیخ پا ہونے کی کیا ضرورت تھی آخر؟''

''بھئی تھی ناں! ایک ایسی ہستی انہیں بطور داماد پیش کی جا رہی تھی' جس کا وجود پچھلے پچیس سالوں تک اس گھر میں اتنا ہی بے کار رہا ہے جتنا کہ اسٹور میں رکھی ہوئی بوسیدہ اور بے مصرف چیزیں۔ اس بدھو' بے زبان اور نشست و برخاست کے مروجہ اصولوں سے عاری مسکین سے منجمد سے بندے کو اپنی لاڈلی سائرہ کے سرتاج کے روپ میں برداشت کیسے کر سکتی تھیں وہ۔''

''مگر انکار کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ چچی تو یوں مشتعل ہوئی ہیں گویا کسی آوارہ' نکھٹو اوباش قسم کے لڑکے کا رشتہ آ گیا ہو۔ ٹھیک ہے نہیں پسند تو نہ سہی۔ سیدھی طرح انکار کر دیں۔ یوں خوامخواہ اگلے پچھلوں تک پہنچنے کی کیا ضرورت ہے۔'' نیلو کے لہجے میں ناگواری تھی۔

''ویسے دیکھا جائے تو اپنی سائرہ بی کے لیے بندہ بالکل موزوں ہے۔'' ایک لطیفے کو سوچ کر تمشین نے کہا۔

نیلو کی سوالیہ نظروں نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا۔ ''وہ کیسے؟''

''بھئی سائرہ اتنی نخریلی' نک چڑھی' مغرور اور حاکمانہ طبیعت کی ہے۔ اپنی اماں جانی کی طرح کہ اس کے لیے صم' بکم'' قسم کا میاں ہی مناسب ہوگا۔ جسے دین و دنیا کی کچھ خبر نہ ہو۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ نہ آدھی کا حصہ دار نہ پوری کا دعوے دار۔ کسی نے پوچھ لیا تو جواب دیا ورنہ ہفتوں آواز نہ سنائی دے۔ نہ کسی نقصان کرنے جوگا نہ کسی کو دھوکا فریب دینے کا ڈھنگ جانتا ہے' کسی نے دے دیا کھانے کو تو کھا لیا نہیں تو برس بیت جائیں گے مانگے گا نہیں۔ انتہا سے زیادہ سادہ' ٹھنڈا مزاج والا اللہ لوک بندہ۔ اور یہ ساری خصوصیات حماد رضوی میں الف سے لے کر یے تک موجود ہیں۔''

اس نے بڑی تفصیل سے حماد رضوی کی شخصیت کا تجزیہ کیا تھا۔

''کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ سائرہ کے ساتھ تو ایسا ہی کوئی بے چارہ بھولا' بدھو اور بے زبان گزارا کر سکتا ہے۔''

''اور اس طرح بے چارے حماد کا بھی بھلا ہو جائے گا۔'' تمشین نے نیلوفر کی تائید کی۔ ''ورنہ اسے

کون دینے لگا اپنی بیٹی بقائمی ہوش وحواس میں۔'' آخر میں وہ ہنس پڑی تھی۔ ''عجیب ہونق سی مسکین سی' بے بس سی شخصیت ہے کہ خوامخواہ ہی غصہ آنے لگتا ہے اس پر سب کو۔ حالانکہ اس کا کوئی قصور بھی نہیں ہوتا مگر سب آرام سے اپنی بے بسی کا بدلہ اس سے لیتے ہیں اپنی مانو بی سے تو زیادہ بے ضرر ہے نہ کچھ کہتا ہے نہ اقرار کرتا ہے نہ انکار۔ عجب مست مولا چیز ہے بے چارہ۔''

''جمیلہ تائی کی ''کارکردگی'' اور ''محنت'' کا نمونہ ہے۔ آخر انہوں نے بنایا ہے اپنی جان جھوکوں میں ڈال کے پال پوس کے جوان کیا ہے۔ پھل دار بن گیا تو اب رس نچوڑنے کو کھونٹے سے باندھنے کا خیال آ گیا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد۔'' نیلو کے لہجے میں طنز تھا۔

''تایا جان کی وفات نے آنکھیں کھولی ہیں ان کی' تین بیٹیوں کا بوجھ ہلکا کرے گا۔ سوتیلا ہی سہی بیٹا تو ہے ناں۔ اچھا یار میں چلوں۔ امید ہے چچی جان اپنی فرحت انگیز باتیں امی کے کانوں میں انڈیل کر رخصتی کے لیے پر تول چکی ہوں گی۔''

وہ سلیپر پاؤں میں اڑستے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''میں کہتی ہوں کوئی کسر رہ گئی تھی۔ کتنا لحاظ' کتنا ضبط کیا ہے اس کے بڑے پن کا' مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں عزت راس نہیں آتی۔'' تیکھی نظروں سے بگڑے تیور لیے چچی فرحت' تائی جمیلہ کو گھورتے ہوئے عالیہ بیگم سے مخاطب تھیں۔

تائی جمیلہ کے تو تلووں سے لگی اور سر پر بجھی۔

''ارے بہت دیکھے ہیں تمہارے جیسے عزت کے نام نہاد دعوے دار۔ اتنا غرور کاہے کا ہے؟ کیوں ات'' مچائی ہوئی ہے۔ رشتہ ہی تو لائی تھی۔ نہیں تو نہ سہی۔ ایک سے ایک اچھی لڑکی موجود ہے میرے بیٹے کے لیے۔''

''بیٹا'' چچی نے تمسخرانہ لہجے میں کہہ کر تائی کو طنزاً دیکھا تھا۔

''آئے ہائے۔ سن لو عالیہ بیگم! آج وہ بیٹا ہو گیا۔ کل کا طوائف زادہ۔'' چچی ٹھٹھا مار کر عالیہ بیگم سے مخاطب ہوئیں۔ ''کل جس کی شکل دیکھ کر تمہارے دل پہ آرے چلنے لگتے تھے۔ بس نہیں چلتا تھا چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دو۔ جس پہ ظلم وستم کے سارے پہاڑ توڑ ڈالے۔ جلاد صفتی اور سفاکی کے ریکارڈ توڑ دیے جس کے لیے آج وہ بیٹا بن گیا۔''

''دیکھو دیکھو مجھے تاؤ نہ دلاؤ۔ میرا منہ نہ کھلواؤ۔ تم ہی تو اس وقت پٹیاں پڑھایا کرتی تھیں کہ جمیلہ بہت کس کے رکھو اس ناگن کی اولاد کو۔ شروع سے اس سنپولیے کا پھن نہیں کچلو گی تو بڑے ہو کر تمہاری گردن کا پھندا بن جائے گا۔ بندے کو اپنے گریبان میں بھی جھانک لینا چاہیے۔'' تائی جمیلہ جل بھن کر کباب ہی تو ہو گئی تھیں۔

''پلیز آپا' چھوڑیں۔'' عالیہ بیگم ہراساں سی ہو کر تائی جمیلہ کو سمجھا رہی تھیں۔ ''گزری باتوں سے کیا حاصل۔ ختم کریں اب اس قصے کو۔'' ان کی صلح جو طبیعت پر یہ سب ہنگامہ گراں گزر رہا تھا۔

''اس کو سمجھاؤ۔ اس کے کھوپڑے میں ڈالو کچھ۔ جو بڑھ بڑھ کر بول رہی ہے۔'' تائی نے خونخوار نظروں سے چچی فرحت کو گھورتے ہوئے عالیہ بیگم سے کہا۔

''اے بھیجا تو تمہارا اپنا خالی ہے۔ قہر وظلم کی دیوی! پہلے سوتیلے بیٹے کو انتقام کی چکی میں پیستی رہیں اور اب چلی آئیں میری نازوں پلی پھولوں جیسی بیٹی کو بھینٹ چڑھانے کے واسطے مانگنے۔'' چچی نے ہاتھ نچاتے ہوئے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''خدا کے واسطے فرحت۔ تم تو ہوش کے ناخن لو۔'' عالیہ بیگم سچ مچ عاجز آ گئی تھیں۔

''کیا بچوں کی طرح لگی ہوئی ہو۔ میں کہہ رہی ہوں بات ختم کرو۔ نہیں تو نہ سہی۔ اتنا لڑنے بھڑنے کی' بیخ پا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ واقعی اس بار تپ گئی تھیں۔

''ارے سینک تو اسے ہی پڑے گا جس کے کلیجے میں آگ لگی ہو۔ کسی کو کیا احساس۔ تم کیوں میری سائیڈ لینے لگیں۔ ہاں ہاں نکالو میرا قصور۔ تم تو مجھے ہی موردالزام ٹھہراؤ گی۔''

چچی کے دماغ کی رو ہی گویا الٹ گئی تھی۔ ''تمہاری بچی کے لیے آتا کوئی ایسا گیا گزرا رشتہ تو میں پوچھتی۔ ارے ہاں اتنی ہمدردی ہے تو دے دو ناں اپنی بیٹی اس ہونق بہرے گونگے کو۔''

چچی فرحت کی بات پر عالیہ بیگم کے ساتھ ساتھ دروازے کے پردے کے پاس کھڑی تمشین اور نیلو بھی سناٹے میں رہ گئی تھیں۔

''کیا کہہ رہی ہو فرحت تم۔'' عالیہ بیگم ہکا بکا رہ گئی تھیں۔ ایک لمحے کو تو گویا ان کے دل کی دھڑکن ہی رک گئی تھی۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

نیلو نے چور نظروں سے تمشین کی طرف دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ آپس میں اس سختی سے الجھ گئے تھے گویا ایلفی لگ گئی ہو۔ چہرہ اور آنکھیں دہک اٹھی تھیں۔

''فرحت! کچھ سوچ سمجھ کر بات منہ سے نکالنی چاہیے۔ غصے میں ایسا بھی کیا بندہ آپے سے ہی باہر ہو جائے۔''

عالیہ بیگم کی آواز انجانے خدشات سے چور کانپ سی رہی تھی۔ چچی نے کچھ جتاتی ہوئی تلخ سی نگاہ ان پر ڈالی۔

''دیکھا۔ کیسے آگ لگی ناں تن بدن میں۔ میرے بھی ایسے ہی درد اٹھا تھا۔ جان بوجھ کے کون اندھے کنویں میں پھینکتا ہے اپنی اولاد کو۔''

چچی کی پوری کوشش تھی کہ عالیہ بیگم کو جمیلہ کے خلاف بولنے پر آمادہ کریں۔ عالیہ بیگم نے کمال ضبط سے کام لیا اور پھر کچھ ساعت بعد خود کو سنبھالتے ہوئے مصالحانہ انداز میں کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ حماد خدانخواستہ کوئی ایسا گیا گزرا لڑکا بھی نہیں ہے۔ اچھا خاصا معقول مرد ہے ہاں اگر تمہیں اپنی بیٹی کے لیے پسند نہیں ہے تو۔''

''اچھا یہ بات ہے۔ وہ اچھا خاصا ہے۔ معقول ہے اور تمہیں اس کے لیے اعتراض بھی نہیں ہے۔ تو بس ٹھیک ہے جمیلہ! تم تو ویسے بھی تمشی پہ صدقے واری ہوتی ہو۔ مانگ لو پھر عالیہ سے۔ اسے بہو بنانا تو۔ تمہارے لیے عین مسرت کا باعث ہوگا۔''

چچی نے عالیہ بیگم کا آخری فقرہ سننے سے پہلے ہی بات کاٹ دی تھی۔

''فرحت'' عالیہ بیگم تڑپ ہی تو اٹھی تھیں۔

''تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ جانتی ہو' کیا کہہ رہی ہو؟''

''ہاں ہاں جانتی ہوں۔ تمشی کے لیے میں نے اپنے بیٹے منیب کی بات کی تھی۔ لیکن کون سی باقاعدہ منگنی ہوئی تھی۔ بات ہی تو تھی۔''

چچی فرحت انتقامی اور غصیلا روپ دھارتی تھیں تو عقل وفہم کو قطعاً لفٹ نہیں کراتی تھیں۔

''بات ہی تو تھی۔ شریفوں میں بات ہی تو سب کچھ ہوتی ہے۔'' عالیہ بیگم کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔

''گھر کی ہی بات تھی۔ گھر تک ہی محدود۔ ویسے بھی اتنا معقول رشتہ موجود ہے تو پھر تمہیں حق حاصل ہے اپنی بیٹی کے لیے بہتر سے بہترین انتخاب کرنے کا۔''

چچی کی سوئی ایک ہی جگہ اٹک گئی تھی۔ انہیں اسی بات کا غم تھا کہ عالیہ بیگم نے ان کے موقف کا دفاع

نہیں کیا' حالانکہ دونوں اتنے قریبی رشتے میں بندھنے والی تھیں۔

"فرحت! خدا کے لیے عقل سے کام لو۔ اتنی جذباتیت اور جلد بازی ٹھیک نہیں ہوتی۔ اتنی معمولی سی بات پر مشتعل ہو کر تم اس رشتے کو توڑ رہی ہو۔ جسے مرحوم خالو جان (سسر) اتنے ارمانوں سے طے کر گئے تھے۔" عالیہ بیگم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔

"بھئی، تمہیں ہمدردی جو ہے اتنی جمیلہ خاتون اور اس کے نام نہاد بیٹے سے۔" چچی آگ لگا کر تماشا دیکھنے والوں کی طرح صورت حال سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

"میرے منیب کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ آج امریکہ سے آجائے تو لائن لگ جائے گی۔ لوگ خود اپنی بیٹیاں دینے کو تیار ہیں۔"

"اچھا یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔" پردہ چھوڑ کر جانے کس دل سے وہ اتنی دیر دم سادھے رہنے کے بعد دفعتاً کمرے میں داخل ہو کر مضبوط لہجے میں بولی تھی۔ سبھی ایک دم چونک گئے۔

تمشین ایک ایک قدم اٹھاتی عین چچی فرحت کے مقابل آ گئی۔

"ٹھیک ہے چچی جان! اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ بخوشی یہ رشتہ توڑ سکتی ہیں۔" ضبط سے اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہوتا جا رہا تھا مگر لہجہ اور آواز ہنوز مستحکم تھے۔

"تمشی! عالیہ بیگم نے ڈوبتی آواز میں اسے پکارا۔

"امی! اگر ان کے لیے متبادل موجود ہے تو یہی اختیار پھر ہمیں بھی ملنا چاہیے۔ آئی ایم سوری امی۔ مجھے یہ سب آپ سے کہتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا۔ لڑکیوں کے منہ سے ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ لیکن اس وقت صورت حال ہی ایسی ہے چچی اپنی خوشی سے یہ بندھن توڑ رہی ہیں تو ایسے میں ہم بھی پابند نہیں ہیں۔"

"تم کرلوگی اس "بزاخفش" کے ساتھ گزارا؟ میرے بیٹے کی ہمسری کرسکتا ہے وہ؟ تم چار دن بھی نہ رہ سکو اس کے ساتھ۔" چچی کے لہجے میں اس کے لیے تمسخر اور اپنے بیٹے کی برتری کا غرور شامل تھا۔

تمشین نے ایک لمحے کو انہیں دیکھا۔ پھر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"ہاں! اگر آپ یہ چیلنج کر رہی ہیں تو مجھے منظور ہے۔ میں کر کے دکھاؤں گی گزارا آپ کو۔"

"میری بچی، میری لاڈو۔ میری جان" تائی جمیلہ تو گویا صدقے واری ہی ہو گئیں۔ سر سے پاؤں تک نہال مسرت سے چور چور۔ ان کے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ حماد کے لیے انہیں خاندان =

ہی لڑکی چاہیے تھی چاہے وہ کوئی بھی ہوتی۔ سائرہ کی عادات واطوار اور تنک مزاجی انہیں پسند تو نہ تھی مگر بہر حال وہ خاندان کی تھی۔ اس لیے فرحت کی دہلیز پر جوتیاں گھسا رہی تھیں۔ تمشین کو ان کے سسر فرحت کے بیٹے منیب سے زبانی کلامی منسوب کر گئے تھے ورنہ تمشین تو انہیں سر سے پاؤں تک پسند تھی۔ اب جبکہ رکاوٹ خود بخود دور ہو گئی تھی تو جمیلہ بیگم کو تو یوں لگ رہا تھا گویا بیس کروڑ کا پرائز بانڈ نکل آیا ہو ان کا۔

عالیہ بیگم سمیت سارا جہاں اسے سمجھا سمجھا کے ہار گیا تھا مگر وہ اپنی ضد کی پکی تھی۔ ایک انچ بھی نہ سرکی۔ حماد رضوی سے سب کو ہمدردی ضرور ہو سکتی تھی اور اس کے لیے چچی فرحت کی "زبانی گولہ باری" سب کی سماعتوں پر کڑی ضرور گزرتی تھی مگر خاندان کی کسی لڑکی کا مستقبل اس بندے سے وابستہ کرنے کا فیصلہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ پھر اس جیسی سلجھی ہوئی پیاری سی فطرت والی اتنی اچھی لڑکی کا حماد رضوی جیسے بندے کے ساتھ کیا جوڑ تھا۔ اس کو ایک سے ایک اچھا رشتہ مل سکتا تھا۔ حماد رضوی کا انتخاب تو ایسا ہی تھا جیسے کوئی ہیرے موتی چھوڑ کر کوئلے اور پتھروں سے اپنا دامن بھر لے۔

سب نے ہی مقدور بھر اسے سمجھایا تھا مگر اس کی انا پر پڑی ضرب نے اس کی ہستی کو اس طرح ہلا کے رکھ دیا تھا کہ وہ کچھ قبول کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی جس کا مر کر بھی نہ سوچا تھا۔ نیلو کے لمبے لمبے لیکچر بھی کام نہ آئے تھے۔ تائی جمیلہ کو بہت جلدی تھی۔ سو جھٹ پٹ شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

"تمشی! میں جانتی ہوں۔ تم ہرٹ ہوئی ہو۔ چچی کی نخوت اور غرور نے تمہیں چیلنج کرنے پر آمادہ کیا تھا مگر خدا کے لیے۔ ایک لمحے کو سوچو۔ کیا تم ایک چیلنج کی نذر کر دوگی اپنی اتنی قیمتی زندگی۔ وہ کسی طور بھی تمہارے جوڑ کا نہیں ہے تمشی۔ اس سے صرف ہمدردی کی جا سکتی ہے، بیاہ نہیں۔ وہ جذبات و احساسات کے بروقت اظہار اور اشتعال سے قطعی ناآشنا ہے۔ گو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ کسی نے اسے سکھایا ہی کب ہے۔ نہ کوئی جذبہ اسے ملا نہ کسی نے اس سے مانگا۔ اس کی زندگی کا بس ایک ہی رنگ ہے۔ پھیکا سپاٹ، بے حس اور بے جان۔ تم زندگی کے ہر لمحے سے رس نچوڑنے والی ہو۔ ہر گھڑی کو بھرپور طریقے سے، پورے جذبوں سے محسوس کرنے اور انجوائے کرنے والی۔ تم گزارا نہیں کر سکو گی تمشی۔ پلیز مان جاؤ۔ اب بھی وقت ہے۔ یار سوچو تم پورے خاندان میں یکساں مقبول ہو۔" اپنے جیون ساتھی کو کس طرح مکس کر پاؤ گی۔ وہ تو کچھ بھی نہیں جانتا نہ سمجھتا۔ یار تم کیوں مرنے کے حربے اپنا رہی ہو۔" نیلو سمجھا سمجھا کر عاجز آ گئی تھی۔

"میں کرلوں گی۔ سنبھال لوں گی صورت حال۔ تم دیکھنا تو۔" اس کا جواب حسب سابق تھا۔

''یار! منیب نہ سہی کوئی اور سہی۔ کوئی آسمان سے اترا ہوا تو نہیں تھا۔ امریکہ میں پڑھنے سے پر تو نہیں نکل آئے۔ چچی کی تو عادت ہے ڈینگیں مارنے کی۔'' نیلو کو تو یہی تک سمجھ میں آئی تھی اس کے آناً فاناً حماد سے شادی پر تیار ہو جانے کی۔

''تم کیا سمجھتی ہو منیب کے فراق اور اس کو کھو دینے کے غم میں ایسا کر رہی ہوں۔ ارے نہیں تم اچھی طرح جانتی ہو۔ میں عشق و عاشقی کے چکر میں کبھی نہیں آئی۔ میرا مزاج ہی ایسا نہیں ہے۔ میں نے کوئی سپنے نہیں دیکھے تھے منیب کے نام کے۔ میں نے تو ابھی اس لحاظ سے سنجیدگی سے کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔ امی پر چھوڑا ہوا تھا سب کچھ'' نیلو نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ وہاں سادگی اور سچائی کی تحریر درج تھی۔

''اچھا پھر ٹھیک ہے۔ تم اب بھی یہ سب کچھ ممانی پر چھوڑ دو۔ وہ بھی خوش نہیں ہیں تمہارے فیصلے پر۔ اور یہ بات بھی طے ہے کہ خوش تم بھی نہیں ہو۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں تم حماد کے لیے اس سے پیشتر کیا جذبات رکھتی تھیں۔''

''چلو ایک تجربہ یہ بھی سہی۔ اس نے لاپرواہی سے بال جھٹکے۔ نیلو غصے سے مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔

''ایک چیلنج کے پیچھے خود کو برباد نہ کرو ضمشی۔ اب بھی وقت ہے مان جاؤ۔''

نیلو نے آخری دفعہ کوشش کی۔ وہ جواب دینے کے بجائے آرام سے لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر کے ان پر بازو رکھ لیا گویا اشارہ تھا کہ مزید بات چیت نہیں ہوگی۔ نیلو زچ ہو کر باہر نکل گئی۔

بندے کی برداشت بھی اس وقت تک سلامت رہتی ہے جب کوئی اس کی دم پر پاؤں نہ رکھ دے۔ جہاں یہ مرحلہ آ جائے وہاں برداشت بھی رخصت ہو جاتی ہے پھر عقل و شعور کے بند دروازوں پر دستک دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ضدی انا چین سے بیٹھنے ہی نہیں دیتی۔ 'کچھ کر دینے' کچھ ثابت کرنے کچھ ہو جانے کے چکروں میں الجھا دیتی ہے۔ عزت نفس کا گھوڑا بھاگتا ہی چلا جاتا ہے۔

کہاں سے کہاں آن پہنچی تھی وہ۔ کس جگہ سے سفر کا آغاز کیا تھا اور کہاں اختتام ہوا ہے؟

حماد رضوی کے کمرے میں دلہن بنی بیٹھی جسمانی طور پر تو موجود تھی مگر طائر خیال جانے کہاں پرواز کر رہا تھا۔

''حماد رضوی۔ کیا واقعی ''گزارا'' ہو سکے گا؟''

دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر ان پر اپنی ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے وہ خود سے استفسار کر رہی تھی۔

ضدی بلکتی ٹوٹتی انا کو سہارا نہ دینا ہوتا تو وہ ایسا قدم ہرگز بھی اٹھانا گوارا نہ کرتی۔

''حماد رضوی۔'' اس کی آنکھوں میں بہت سے پچھلے مناظر لہرانے لگے۔

جواد حسین بڑے سنجیدہ بلکہ حس لطیف کے اعتبار سے خشک قسم کے آدمی تھے۔ مگر جانے کیسی گیتی کے نظر کا شکار ہو گئے۔ اور یہ اس وقت کی بات تھی جب وہ اپنی چچازاد جمیلہ سے نہ صرف شادی کر چکے تھے تین سالہ بیٹی رابعہ کے باپ بھی بن چکے تھے۔

گیتی کو پہلے بار انہوں نے اپنے ایک منچلے دوست نواب اقتدار شاہ کے ہاں دیکھا تھا اور پھر جیسے دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔

حسن تھا کہ گویا کشش اور سحر کے جھرنے بہہ رہے تھے۔

سر تا پا مرصع۔ بناؤ سنگھار بھی کچھ کم نہیں لگ رہا تھا۔

جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔

جیسے چودھویں کا چاند۔

باد صبا کی طرح وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی اور پھر اسی سبک رفتاری سے لمحوں میں واپس پلٹ گئی تھی۔

''یہ'' انہوں نے سوالیہ انداز سے نواب اقتدار شاہ کو دیکھا۔ جواب میں ایک بے باک سے مسکراہٹ نواب صاحب کے چہرے کا احاطہ کرنے لگی۔

''رشتہ دار ہیں کوئی۔'' جواد حسین ان کی مسکراہٹ سے الجھ گئے تھے۔

''سمجھنا اتنا ضروری ہے تو بھابی سمجھ لو۔ جز وقتی بھابی۔''

نواب صاحب کی مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ لہجے میں بھی معنی خیز سی نشیلی سی بے باکی تھی۔

وہ دنگ رہ گئے۔ ''ہوش کے ناخن لو شاہ۔''

وہ برا مان گئے تھے۔ ابھی پچھلے ماہ تو نواب صاحب کی بیگم اپنی نئی نویلی انگریز بہو اور بیٹے سے ملنے لندن گئی تھیں۔

''بھئی، بیگم صاحبہ کو ابھی مزید ایک ماہ لگ جائے گا لندن۔ اس دوران کمی پوری کرنے کے لیے اسے لے آئے ہیں۔''

''لے آئے ہیں۔ کیا مطلب ہے تمہارا اور بھابی آ گئیں تو کیا جواب دو گے انہیں۔'' ان کی شفاف

اور سادہ طبیعت پر نواب صاحب کی رنگین مزاجی کا واقعہ بڑا گراں گزر رہا تھا۔

"کب وہ سوال کریں گی اور کب ہم جواب دیں گے۔" نواب صاحب کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ایسی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ کہ بیگم کو پتا چلے اور وہ استفسار کریں۔

"اگلے ہفتے یہ کمٹ منٹ ختم ہو جائے گی۔ تو نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

نواب صاحب نتائج و عواقب سے قطعی بے نیاز رہنے والے لوگوں میں سے تھے۔

"لائے کہاں سے ہو؟" انہیں نواب صاحب کا انداز بہت ناگوار محسوس ہو رہا تھا۔

"اسی بازار سے جہاں دن سوتے ہیں اور راتیں جاگتی ہیں۔"

ٹانگ پہ ٹانگ رکھے سگار سلگاتے ہوئے نواب صاحب نے بڑے پرسکون انداز میں اطلاع دی تھی۔ "دو ہفتے قبل۔"

جواد حسین اچھل ہی تو پڑے تھے۔

"کیا یونہی لے آئے ہو۔" ان کے جذبات واحساسات میں عجیب سا ہیجان بپا ہو گیا تھا۔

"نہیں۔ نکاح کر کے لایا ہوں۔ میں تو اس جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا مگر چمپا بائی نے لاچاری ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ گیتی اسی اصول اور شرط پر کام کرنے پر راضی ہوئی ہے۔"

جواد حسین اپنے اندر عجیب سی بے چینی بے کلی سی محسوس کر رہے تھے۔ جذبات سے برانگیختہ ہو رہے تھے۔

اتنا حسن، اتنی رعنائی۔ ایسی زیبائش۔ اتنی لطافت۔

چہرے سے وہ قطعی اس نگر کی باسی نہیں لگتی تھی۔ ایک بے ساختہ سا بھولپن اور نرم سا تقدس جیسے اس کے وجود کا ہالہ کیے ہوئے تھا۔ دو دن بعد وہ نواب صاحب کے ہاں کسی کام سے آئے تو اتفاقاً اس سے ملاقات ہو گئی۔ نواب صاحب گھر پر نہیں تھے۔

"آپ کون ہیں؟" دو دن سے جو سوال ان کے ذہن میں سوئی کی طرح چبھ رہا تھا بالآخر نوک زبان پر آ گیا۔

اس نے بھاری خمدار پلکوں کی چلمن اٹھا کر ایک لمحے کو انہیں دیکھا۔ گویا پرکھ رہی ہو۔

"یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" اس نے سیدھا ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

جواد حسین کے نظریں جھک گئیں۔ وہ ان بجلیوں کی تاب نہ لا سکے۔

گیتی آرا ہنس پڑی۔ اک مضطربانہ سی ہنسی جیسے کانچ بکھر جائے۔

"میرے ماں باپ مالی اعتبار سے جتنے غریب تھے میں حسن کے اعتبار سے اتنی ہی امیر تھی۔ بے
ثا غربت میں بے تحاشا حسن کہاں سنبھلتا ہے۔ ابھی تیرہ کا سن لگا تھا کہ ایک مالدار ادھیڑ عمر بندہ
ا رین کے میرے باپ کی کٹیا میں چلا آیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اماں ابا نے رسماً بھی
ت نہ لی۔ میں کٹیا سے کوٹھی آ بسی۔ جہاں ایک شرابی کبابی شوہر کی دلداری اور خاطر مدارات میں
کر دل اور روح پہ لگے زخموں کی کسک بھلانے کی کوششیں کرتی رہی۔ پھر ایک رات میرا شوہر اپنے
ہم پیشہ اور ہم شغل دوستوں کو گھر لے آیا اور مجھے ان کی اور طرح کی خدمت کرنے کا حکم دیا۔
احمت پر جسمانی تشدد اور گالم گلوچ کے ساتھ واہی تباہی بکتے طلاق دے دی اور خونخوار ارادے سے
ری سمت بڑھتے ہوئے کہا۔

"اب میں تجھے اپنے ساتھ رکھوں گا اسی طرح۔ پھر دیکھتا ہوں تجھے جائز ناجائز کے سبق کتنے یاد
تے ہیں۔"

وہ بری طرح نشے میں دھت تھا اور ساتھ ہی اس کے دوست بھی اس سمت بھوکے بھیڑیوں کی طرح
انت نکالے۔ پنجے پھیلائے یکلخت مجھ پر جھپٹنے کے ارادے سے آگے بڑھ رہے تھے۔ کسی غیر مرئی
طاقت نے مجھ میں بجلی سی بھر دی۔ میں اندھا دھند گھر سے نکلی اور سرپٹ بھاگنے لگی۔ وہ لوگ بھی پیچھے
ئے مگر مجھ تک نہ پہنچ پائے۔ مجھے خبر نہ ہوئی بھاگتے بھاگتے میں پلیٹ فارم پر پہنچی۔ یہیں انتظار گاہ
میں ایک مہربان چہرے والی خاتون ملی۔ اس نے ساری بپتا سنی مجھے تسلی دی۔ میری حالت اتنی پتلی
ہو رہی تھی کہ نیم بے ہوش سی اس کی بانہوں میں گر گئی تھی۔ جانے ریل نے کتنا سفر کیا اور کہاں اترے۔
ہوش آیا تو گھنگرو میرے منتظر تھے۔ آگے پیچھے کوئی راستہ نہ تھا۔ تیرہ چودہ برس کی بے آسرا اور بے سرو
سامان لڑکی انجانے پرائے شہر میں جاتی بھی تو کدھر جاتی۔

چمپا بائی نے اتنی مہربانی ضرور کی کہ مجھے رقص اور ناز و انداز کے تمام ہتھیاروں سے لیس کرنے کے باوجود میری منشا اور مرضی کو ملحوظ رکھا۔ میری خواہش پر محفل سجانے کی حد تک محدود رکھا۔ اور کسی بڑے رئیس کے شبستان سجانے پر میری مرضی کے خلاف مجبور نہیں کیا مگر تابکے جب عہد شباب ٹوٹ کر آیا تو چمپا بائی کے آگے میری ایک نہ چلی۔ ہاں یہ شرط میں نے ضرور رکھی کہ چاہے ایک رات ہی کیوں نہ ہو بسر شرعی لحاظ سے ہو گی۔"

جواد حسین کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ وہ عجیب درد سا محسوس کر رہے تھے۔ گیتی آرا کے لئے اپنے دل میں پھر جب نواب صاحب نے حسب معاہدہ نکاح کا بندھن توڑ کر اسے آزاد کیا تو جانے کیسے' کیوں اور کس طرح وہ گیتی آرا کو پرپوز کر بیٹھے اور تا زندگی اپنی عزت بنا کر رکھنے کا عہد کیا۔ گیتی آرا پہلے تو بے یقینی سے دیکھتی رہی پھر ان کے اخلاص اور محبت کے سامنے ہار گئی۔ جواد حسین نے بھاری رقم دے کر چمپا بائی کے چنگل سے اسے آزاد کرایا اور پھر سادگی سے نکاح کر لیا۔ ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ فی الحال گھر والوں کے سامنے تذکرہ کرنے کی ہمت نہ تھی۔

جواد حسین نے اپنا عہد پوری طرح نبھایا۔ مگر رقیبوں کو اس چھوٹے سے گھر کی خوشیاں بہت کھٹکتی تھیں۔ چمپا بائی کا گیتی کے جانے سے بڑا نقصان ہو رہا تھا۔ اس کی ہر ممکن کوشش تھی کہ کسی طرح دوبارہ گیتی کو بالا خانے پر لا سجائے۔

جب ہر طرح کا لالچ' فریب اور جھانسے بھی گیتی کو ڈگمگا نہ سکے تو تنگ آ کر چمپا بائی نے جواد حسین کو اور ان کے چھ سالہ بچے حماد کو مروانے کا منصوبہ بنایا۔ ایک شام جب میاں بیوی اپنے بچے سمیت کار میں کہیں جا رہے تھے تو راستے میں کرائے کے غنڈوں نے گاڑی پر فائرنگ کر دی۔ معجزانہ طور پر جواد حسین اور حماد بچ گئے اور گولیاں گیتی کے جسم میں پیوست ہو کر اسے ابدی نیند سلا گئیں۔ اسی دوران گھر والوں پر شادی کا قصہ کھل گیا۔ جواد حسین حماد کو گھر لے آئے۔

پہلے پہل تو کسی نے اسے قبول نہ کیا۔ کوئی دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا۔ خصوصاً جمیلہ بیگم کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ گلا گھونٹ دیں۔ جب تک جواد حسین حیات رہے کسی نہ کسی طور اس کا خیال رکھتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد حماد رضوی مکمل طور پر جمیلہ کے رحم و کرم پر تھا اور اس وقت اس کی عمر محض دس سال تھی۔

پھر تائی جمیلہ کے ختم نہ ہونے والے انسانیت سوز مظالم' گھر والوں کی مجرمانہ غفلت اور چشم پوشی بلکہ بے حسی بے دریغ زیادتیاں بے پناہ مصائب کی زد میں آیا تنہا حماد رضوی۔

جانے کہاں کہاں سے منظر ذہن کے دریچوں سے نکل کر آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔

اور اب گزارہ کیسے ہو گا۔ اس کے ذہن میں اندیشے سانپ کی طرح کلبلا رہے تھے۔

''ایک ایسے شخص سے نباہ کیونکر ممکن ہو گا جو میرے تو کیا خود اپنے حق کے لیے لڑنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتا۔ کیا فرحت چچی کے آگے بھرم رکھ سکے گا میرا۔''

''بندہ شادی بے شک کرے مگر'' کاغذی مرد'' تو نہ ملے اسے۔'' نیلو کا جملہ اس کی سماعت میں ٹکرایا۔

''ارے وہ بھی کوئی مرد ہے جو بیوی سے حق مانگتے ہوئے بھی ممیائے۔ منمناتے ہوئے بولے۔ مرد کو بارعب شاندار ہونا اپنی بات منوانے والا اور تھوڑا ضدی و سرکش ضرور ہونا چاہیے۔''

ایک بار ان میں بحث چھڑی تھی تو نیلوفر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

''پر جوش' لاپروا۔ بہادر اور سمندری چٹانوں کی طرح مضبوط جفاکش نہ ہو تو اسے مرد ہی نہ مانیے''

اور یہ۔

یہ شاید ساری عمر میرے سامنے کھڑے ہو کر اعتماد سے بات بھی نہ کر سکے۔ ساری عمر چوروں کی طرح چھپتا' جھینپتا اور بچتا پھرے گا۔ ہائے کیسا برف بندہ ملا ہے قسمت سے۔

اسے خود پر خود ہی ترس آنے لگا۔

''کیا کروں اب۔ اس کا انتظار'' اسے بے ساختہ ہنسی آنے لگی۔ ''وہ تو اس حد تک انجان ہے کہ اس انتظار کے معنی بھی نہ جانتا ہو گا''

اف کس قدر جھنجھلاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ ''میرا خیال ہے خوامخواہ لفٹ کرا کے اسے اپنی اہمیت کا اندازہ نہیں کرانا چاہیے۔ اچھا ہے اپنی موجودہ اوقات ہی میں رہے۔ اتنا بڑا انعام تو مل گیا ہے اسے میرے وجود کی صورت میں۔'' وہ نخوت سے سوچ رہی تھی۔

اسے اپنا سجا سنورا روپ خوامخواہ ہی مضحکہ خیز لگنے لگا۔

''اونہوں کس کے لیے سجی بیٹھی ہوں۔ وہ تو عام سا بھی نہیں ہے جو دل ٹھہر سکے۔'' ڈریسنگ روم میں جا کے اس نے زیورات اور لباس اتارا اور میک اپ صاف کر کے نیلے کاٹن کے آرام دہ لباس میں بیڈ کے ایک سائیڈ پر دراز ہو گئی۔ کمرا بھی اپنے مکین کی طرح سادہ سا تھا۔ وسط میں وسیع و عریض بیڈ تھا جس کے مقابل ڈریسنگ ٹیبل تھی اور ایک طرف دو اسٹول اور تپائی موجود تھی۔ کسی قسم کی آزمائش و زیبائش سے قطعی عاری کمرہ گویا اپنے مالک کے مزاج کی عکاسی کر رہا تھا۔

کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔

شاید انجانے میں وہ اس کی منتظر تھی۔ اس نے جھلا کر سائیڈ ٹیبل پر دھرے سے ٹائم پیس کی طرف دیکھا۔ ڈھائی بج رہے تھے۔

اسے شدید کوفت ہونے لگی۔

"نواب زادے جانے کس ریاست کی سیر کو نکلے ہوئے ہیں۔"

وہ جل کر سوچ رہی تھی۔

اسی لمحے کھٹکا ہوا۔ وہ ٹھٹھک کر اپنی جگہ جم سی گئی۔ خیال تھا کہ کمبل تان کر بے خبر سونے کی ایکٹنگ کرے، مگر نجانے کیا ہوا' وہ اس منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ جس طرح بیڈ کی پشت سے سر ٹکائے نیم دراز تھی ویسے ہی بیٹھی رہ گئی۔

اندر داخل ہو کے دروازہ بند کر کے جونہی وہ مڑا غیر ارادی طور پر دونوں کی نظریں مل گئیں۔

"السلام علیکم" نہایت دھیمے مگر ٹھہرے ہوئے انداز میں کہہ کر نظر چراتا ہوا وہ ڈریسنگ روم میں گھس گیا تھا۔

"ہونہہ۔" اس نے جیسے ڈریسنگ روم کے بند دروازے کو نخوت سے منہ چڑایا اور پھر کمبل گرد کھینچ کر کروٹ لے کر پڑ گئی۔

پانچ سات منٹ بعد دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر بھاری بھاری قدموں کی آواز بیڈ کی سمت آتی سنائی دی۔

وہ دم سادھے پڑی رہی خیال تھا کہ آ کر کچھ کہے گا یا عملاً کوئی پیش رفت کرے گا کہ کیسا ہی خاموش طبع اور بے اختیار سہی بہر حال مرد تو تھا ناں۔ مگر کتنی ہی دیر گزر گئی۔ وہ اس کی سمت سے پیش قدمی کی منتظر ہی رہی۔ اپنی طرف سے تو سر سے پاؤں تک کمبل اوڑھ کے دلہناپے کی ساری علامات مٹا کر وہ اس کی ذات کے لیے اپنی بے نیازی' بے پروائی اور بے توجہی کا ثبوت دینا چاہتی تھی۔ اسے بتا دینا چاہتی تھی کہ اس کے نام کا دم چھلا لگا لینے سے نہ اس کی حیثیت و اہمیت بدل گئی ہے اور نہ خود اس کی ذات پر کوئی اثر پڑا ہے۔ تقریباً تقریباً پون گھنٹہ اسی ذہنی کشمکش میں بیت گیا تو اس نے انتظار کی اذیت سے جھلا کر گردن موڑ کر دوسری سمت دیکھا اور پھر لمحہ بھر کو جیسے پتھر کی ہو کر رہ گئی۔

وسیع عریض بیڈ کے دوسرے سرے پر ہلکے سبز کمبل میں وہ پرسکون چہرہ لئے انتہائی بے خبر و مگن انداز میں سو رہا تھا۔

غصے کی شدت سے اس کی رگیں کھنچنے لگیں۔

احساس شرمندگی اسے عجب مشتعل سے جذبات سے دوچار کر رہا تھا۔

یہ ادا و انداز تو اس نے اس کے لیے سوچ رکھے تھے اور یہاں تمشین سے پہلے ہی وہ جتا گیا تھا جو

حربے وہ اس پر اپلائی کرنا چاہتی تھی' وہ خود اس پر اپلائی کیے جا رہے تھے۔ "ہونہہ۔ محترم کو غالباً اتنی عزت راس نہیں آئی مجھ پر اختیار حاصل کر کے بے چارہ خود کو تیس مار خان سمجھنے لگا ہے۔ بے وقعت شے کو بھی جب اہمیت دی جائے تو سر پر چڑھ جاتی ہے۔ پھر اس کا تو حق بھی بنتا ہے۔"

وہ اپنی سلگتی بھڑکتی انا کو تسکین دینے کے لیے دوسرے رخ پر سوچنا شروع ہو گئی تھی۔

"خیر' مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو ویسے بھی اس کے وجود سے نالاں ہوں۔ اگر پیش قدمی کرتا بھی تو منہ کی کھاتا۔ اچھا ہے خود ہی عقلمندی کا ثبوت دے دیا ہے اس نے۔ ظاہر ہے ہمارے راستے تو کسی طور ایک نہیں ہو سکتے۔ چلنا تو ویسے بھی دونوں نے ساری عمر تنہا ہے۔"

وہ بالآخر خود کو پرسکون کر کے نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

"میری چندا۔ میری سوہنی۔ اے ماشاءاللہ۔ چشم بد دور۔ کتنی پیاری لگ رہی ہے۔" تائی بلائیں لیتی نہیں تھکتی تھیں۔ "کیسا روپ آیا ہے۔ میری بیٹی پر۔ اور جان تو خوش تو ہے ناں۔" تائی اس کی ٹھوڑی اٹھا کر بغور دیکھتے ہوئے محبت سے پوچھ رہی تھیں۔ ان کی نظریں کچھ ٹٹول رہی تھیں۔

وہ یونہی چہرہ جھکائے شرمانے لجانے کی ایکٹنگ کرتی رہی۔ تائی اور دیگر خواتین کے جانے کے بعد نیلو جو اب تک بالکل چپ بیٹھی ہوئی تھی' قریب کھسک آئی۔

"اور سناؤ کیسی ہو۔ کیسی گزری پہلی پہلی رات۔"

وہ گہری نظروں سے اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کا گویا تجزیہ کر رہی تھی۔

تمشین سب کو بے وقوف بنا سکتی تھی مگر نیلو کے آگے بننا اس کے بس میں نہیں تھا۔ سو تھوڑے اصرار کے بعد بالآخر ساری صورت حال بتا دی۔ نیلو سناٹے میں رہ گئی۔

"تمشی میرے اللہ۔ ارے بے وقوف لڑکی تم کیوں اپنے لیے کنویں پہ کنواں کھود رہی ہو۔ اور پاگل احمقوں کی شہزادی۔ میرے خدایا۔ کیا کمال کا کارنامہ کیا ہے تم نے" وہ مایوسی اور بے بسی سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"کیوں ایسا کیا ہو گیا۔" تمشین کے پلے اس کا واویلا خاک نہیں پڑا تھا۔

"ابھی کچھ ہونا باقی ہے" نیلو نے ناراضگی سے اسے گھورا۔

"بھئی اب ایسی کیا قیامت آ گئی ہے۔" وہ ناسمجھی کے عالم میں جھنجھلائی تھی۔

"تمہیں پتا ہے مرد جب اپنی خوابگاہ میں عورت کو آنکھ بھر نہ دیکھے اسے شرعی استحقاق کے تحت استعمال نہ کرے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے عورت کے مقدر میں سیاہ بختی لکھ دی گئی ہے۔ وہ ٹھکرا دی گئی ہے۔ یہ 'ان چھوا پن' وجہ افتخار نہیں ہوتا۔ یہ تو نسوانیت کے لیے ایک تازیانہ ہوتا ہے۔ عورت کے لیے اس سے بڑھ کر ذلت و رسوائی اور کیا ہوگی۔ اور پھر پہلی ہی شب اپنی قربت سے محروم رکھنا عورت کی بربادی کا نقطہ آغاز ہوتا ہے اور تو بے وقوف اپنی بربادی پر خوشیاں منا رہی ہے۔ عجیب شے ہے یار تو۔"

وہ اچھی طرح تمشین کی خبر لیتے ہوئے آخر میں جھلا پڑی تھی۔

"اونہہ مائی فٹ۔ وہ ہے میرے قابل۔ اتنی جرأت ہے اس میں؟" وہ تحقیر آمیز انداز میں ہونٹ سکوڑتے ہوئے بولی۔

"یہ ہمت و جرأت اور حق دے چکی ہیں آپ اسے اگر آپ کی یادداشت سلامت ہے تو۔" نیلو اسے گھورتے ہوئے طنزیہ بولی۔

"خوش ہو تم۔" چچی فرحت سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے بڑی تیکھی ہو کے پوچھ رہی تھیں۔

"ہاں بالکل۔ سر سے پیر تک نہال ہوں۔" اس نے جواباً انتہا درجے کی مسرت و شادمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گویا ان کا وار روکا تھا۔

"ابھی تو آغاز ہے دیکھیں گے۔ اصل میں تو جانن بعد میں ہوتا ہے۔"

چچی اسے اتنا مطمئن پرسکون اور بشاش دیکھ کر دل ہی دل میں خاصی جز بز ہوئی تھیں۔ سو اندر کی حسد و جلن چھپاتے چھپاتے بھی لہجے سے چھلک پڑی تھی۔

"دیکھ لیجیے گا۔ ہم بھی یہیں ہیں اور آپ بھی" اس نے ان کا جی جلانے میں کوئی کسر بھی تو نہ رکھی تھی۔

جب سے آفس کی طرف سے گھر ملا تھا۔ وہ کم کم ہی ادھر نظر آتا تھا۔ یوں بھی آفس شہر سے کافی ہٹ کے تھا۔ سوا گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ ادھر ہی آفیسرز اور ورکرز کے لیے آفس کی انتظامیہ نے رہائشی کالونی کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ ادھر ہی ہوتا تھا۔ ویک اینڈ میں ایک آدھ دن کے لیے آ جاتا تھا اور بالفرض نہ بھی آتا تو یہاں کون تھا۔ اس کی موجودگی یا عدم موجودگی کا نوٹس لینے والا۔ سو شادی کے

ہنگامے ختم ہونے کے بعد حسب معمول وہ چلا گیا تھا۔ تمشین کے وہی معمولات تھے۔ صبح سے سہ پہر یونیورسٹی، وہاں سے آ کر گھر کے چاروں پورشنز کے چکر، رات کو اپنی نندوں ریما، رمنا اور آمنہ سے گپ شپ۔ رات کو میوزک سنتے یا نوٹس بناتے بناتے نیند کی وادیوں میں کھو جانا۔ غرض یہ کہ زندگی وہی تھی جو عالیہ بیگم کے ہمراہ تھی۔ فرق محض کمرے اور نام کا پڑا تھا۔ وہ بڑی حد تک مطمئن تھی۔

اس دن بھی یونیورسٹی سے آ کر وہ ارم بھابی کے پورشن کی سمت آ گئی۔ اس کا نیلو اور رمنا کا آج شاپنگ کا پروگرام تھا۔ سردیوں کا سیزن سر پر تھا۔ سو کپڑے، شال اور جوتوں کی خریداری کرنا تھی۔ یوں بھی کافی عرصے کے بعد بازار کا چکر لگ رہا تھا۔ سو لمبا چوڑا پروگرام بنایا تھا۔ رمنا شام کے اوقات میں کمپیوٹر کورس کر رہی تھی۔ اس نے آج کی کلاس گول کر دی۔

تمشین تیار ہو کر نیلو کے ہاں آئی تو وہ مصروف عمل تھی۔

"کیا ہے بھئی، کتنی دیر لگے گی؟" تمشین نے اس کی تیاریوں کو تشویش سے دیکھا۔ وہ ایک بڑی سی چادر پر استری کرنے میں جتی ہوئی تھی۔

"بس ابھی لو۔ رمنا نہیں آئی؟"

"میرے ساتھ ہی نکلی تھی کہ اس کا فون آ گیا۔ کہہ رہی تھی گاڑی اسٹارٹ ہونے تک ادھر پورچ میں پہنچ جاؤں گی۔ مگر یہ تم کیا لپیٹ رہی ہو؟"

نیلو کے سوال کا جواب دے کر اس نے بغور اس کی حرکات نوٹ کرتے ہوئے الجھن آمیز نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

نیلو نے اس لمبی چوڑی موٹی سی خیمے نما چادر کو عجیب سے اسٹائل میں اپنے گرد کس کر لپیٹا تھا۔ یوں کہ صرف کورٹ شوز کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

"خواتین کو گھر سے باہر نکلتے وقت ڈھنگ سے خود کو کور کر کے نکلنا چاہیے۔"

"اچھا" تمشین نے غیر یقینی انداز میں کہتے ہوئے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ یہ وہی نیلو تھی جو ابھی کچھ عرصے پہلے تک جمیلہ تائی سے اس لیے کھینچا تانی کراتی تھی کہ دو گز کا دوپٹا سنبھالنا اسے دوبھر ہو جاتا تھا کبھی ادھر ڈھلکتا کبھی ادھر پیروں میں رل رہا ہوتا تو کبھی چلتے چلتے راستے میں اٹک کے فرش پہ آ رہتا۔

"یہ غالباً قول عابدی ہے مگر جہاں تک میرا خیال ہے، راستے میں ان سے سر راہ ملاقات کا امکان

نہیں ہے یا پھر ایسا ہی ہے؟''

تمشین کے انداز میں لطیف سا طنز تھا۔

''کیا بدتمیزی ہے۔'' نیلو جھلا گئی۔

''تم لوگ تو یہیں کے ہو کے رہ گئے۔'' رمنا بھی اسی اثناء میں ادھر چلی آئی تھی۔ ''ارے یہ کیا نیلو تم کیا اٹھارویں صدی کا نمونہ بنی ہوئی ہو۔'' تمشین کی طرح وہ بھی نیلو کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی۔

یہی نہیں تھا کہ ان کی فیملی آزاد خیال اور ماڈرن فیملی تھی جہاں شلوار قمیص دوپٹے اور چادر وغیرہ کا تصور آؤٹ ورڈ سمجھا جاتا ہے اور ہر ایک اپنے اندرونی اور بیرونی معاملات' مشاغل اور لباس و خوراک کے معاملے میں دوسرے کی پابندیوں سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ عام شریف خاندان کی بہو بیٹیوں کی طرح ان کے ہاں کی خواتین بھی ہلکی پھلکی چادر یا چادر نما بڑا سا دوپٹہ سر پر سلیقے سے اوڑھ کر باہر آتی جاتی تھیں۔ ہاں یہ بات بھی بہر حال طے تھی کہ برقع یا نقاب کا ان کے ہاں رواج نہیں تھا۔ اس کی ابتدا اب نیلو ہی کر رہی تھی۔ تمشین اس عمل کے پیچھے کار فرما محرک سے بخوبی باخبر تھی۔ عابد ستار بڑے مذہبی سے نہایت سنجیدہ مزاج کے بندے تھے۔ اچھے خاصے پختہ عمر کے وجیہہ مرد تھے۔ ایک اسلامی تنظیم سے وابستہ تھے اور اپنی ان سرگرمیوں اور انتہائی درجے کی خواتین کے وجود سے بے زاری کے سبب ابھی تک شادی کے جھنجٹ میں نہیں پڑے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ نیلو کو ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کو کہا گیا اور یہ شاید نیلو کی محنت اور اپنے کام سے اس درجہ سنجیدہ قسم کی لگن کا کمال تھا کہ کچھ عرصہ بعد دونوں کے مابین دوستانہ فضا استوار ہو گئی جس میں وقت کے ساتھ ساتھ اعتماد بھروسے اور اعتبار کے رنگ بھی شامل ہو گئے۔ اپنے مزاج کے برخلاف انہوں نے نیلو کے ساتھ پورا تعاون کیا اور ہر طرح سے اس کو کام کے بارے میں گائیڈ اور انفارم کیا تھا۔ نیلو کو ان کی شرافت' سنجیدگی پختگی اور متین شخصیت نے بڑا متاثر کیا تھا۔ اور اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ کس طرح رفتہ رفتہ غیر ارادی طور پر وہ خود کو عابد ستار کے معیار کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے تیار کرتی گئی۔ خصوصاً جب اسے پتا چلا کہ عابد ستار کی فیملی کی خواتین پردہ کرتی ہیں اور اکیلی گھومنے پھرنے سے احتراز کرتی ہیں تب سے اس نے اپنی سوشل ایکٹوٹیز محدود کرنا شروع کر دیں۔

رمنا تو آگاہ نہیں تھی البتہ تمشین اس تبدیلی کی وجوہات سے بخوبی آشنا تھی۔

شاپنگ کے دوران بھی نیلو نے انہیں اچھا خاصا بور کیا۔ انہوں نے حسب معمول ایک اوپن ایر

ریسٹورنٹ میں برگرز اور آئس کریم سے لطف اندوز ہونا چاہا تو اس نے رد و کد کرنا شروع کر دی۔

''اتنے لوگ دیکھ رہے ہیں۔ کتنا برا لگ رہا ہے۔ ایسا ہی ضروری ہے کھانا تو لے کر گاڑی میں بیٹھ کے کھا لیتے ہیں۔'' ارم بھابی کے تین سالہ بیٹے یومی کی برتھ ڈے قریب تھی' اس کے لیے تینوں نے اپنے اپنے گفٹس لیے۔ گفٹ لے کر جب رمنا اور تمشین ریپرز' وش کارڈ اور ربن وغیرہ لینے کے لیے ایک بک شاپ کی سمت بڑھیں تو وہ مزاحم ہو گئی۔

''یہ فضول خرچی ہو گی نری' کیا فائدہ ان کا۔ ایسی بے جا رسمیں قطعی اصراف میں شامل ہوتی ہیں سوچو یہ پیسہ جو تم ان معمولی بے کار چیزوں پر لگا رہی ہو کتنی جگہ کام آسکتا ہے۔''

''ارے! تم نے نہیں لینا تو نہ لو' رکھو اپنی رقم سنبھال کے۔ ہمارے لیے تو یہی مناسب مصرف ہے رقم کا' بچہ رنگی برنگی خوبصورت سی پیکنگ دیکھ کر خوش ہو جائے گا۔ ہمارے یہاں کون سے دس بیس ہیں' دو ہی تو ہیں ان کی خوشی کے لیے بھی خرچ نہ کریں تو کیا بھاڑ میں جھونکنا ہے ان پیسوں کو۔''

تمشین سچ مچ تپ گئی تھی اس کی منطق سے' غبارے اور جھنڈیاں خرید کر بیکری والے کو پرسوں تک اپنی پسند کے مطابق فریش کیک بنانے کا آرڈر بک کرا کے وہ گھر لوٹیں تو شام کے چھ بجنے کو تھے۔

تمشین چیزیں سمیٹ کر عالیہ بیگم کے پورشن کی سمت بڑھ گئی۔

آج ادھر ہی رات کو ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ ابھی وہ امی کو شاپنگ کی چیزیں دکھا رہی تھی کہ سب سے چھوٹی نند ریما چلی آئی۔

''تمشی بھابی! امی بلا رہی ہیں آپ کو' حماد بھائی آئے ہیں۔''

''اس سے میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ میں نے کیا استقبالیہ دینا ہے؟''

اس نے تیوری چڑھا کر ریما کو دیکھتے ہوئے قدرے بگڑ کر گویا اپنے آپ سے کہا تھا۔

تائی کی تک اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بھئی آیا ہے تو میں کیا کروں۔ کیا نیا بن کے آیا ہے۔ یا ''فاتح اعظم'' کی نیم پلیٹ لگ گئی ہے سینے پہ۔ وہ اچھا خاصا جل بھن گئی تھی۔

''اونہو! کیا بے وقوفی ہے؟'' امی نے بیٹی کی اوٹ پٹانگ منطق سن کر فہمائشی انداز میں کہا۔

''کیسی بچوں جیسی باتیں کرتی ہو' شوہر گھر آئے تو بیوی کو ہر صورت گھر ملنا چاہیے۔ چلو اٹھو فوراً اسے پیشتر فنافٹ'' عالیہ بیگم کی تادیب و تنبیہ کے آگے اس کی لنگڑی سی مزاحمت کیا ٹھہرتی۔ برے برے منہ بناتے ہوئے جب جمیلہ تائی کے پورشن میں داخل ہوئی تو موصوف لاؤنج میں جمیلہ تائی کے پاس سر

جھکائے بیٹھے نظر آئے۔ تائی کوئی قصہ چھیڑے ہوئے تھیں۔

"میں نے کہا، تمہیں کیا عقل ہے، کون سے مضمون تمہارے لیے مناسب رہیں گے۔ بڑا بھائی آتا ہے تو اس کے صلاح مشورے سے منتخب کرنا۔ تاکہ بعد میں پڑھانے کے لیے ٹیوٹر نہ ڈھونڈنے پڑیں بھئی مضامین کے انتخاب میں صرف شوق تو کام نہیں آتا۔ پھر میٹرک اور فرسٹ ایر کی پڑھائی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ خوامخواہ شوق کے مارے مشکل مضمون لے کر سائرہ بی طرح تین سالوں میں فرسٹ ایر کلیر کرنے والا حساب نہ کروا بیٹھنا۔ اچھا ہوا تم آ گئے، اب خود ہی نمٹانا اس کے بکھیڑے۔ دیکھ لینا کون سا کالج اس کے لیے اچھا رہے گا تم بہتر جانتے ہو۔"

ریما کا میٹرک کا رزلٹ آ چکا تھا اور اب فرسٹ ایر کے ایڈمشن کے سلسلے میں دوڑ دھوپ کر رہی تھی۔

تائی کا لہجہ نہایت شیریں تھا۔ "کچھ عرصہ پہلے تک تو شکل دیکھنے کی روادار نہ تھیں اب کیسے کام نکلوانے کے لیے میٹھے لہجے میں پیار سے بات کر رہی ہیں۔"

تمشین دل ہی دل میں طیش کھاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ دو سال پہلے جب سے تایا جان کی وفات ہوئی تھی حماد کو غیر معمولی توجہ سے نوازنے لگی تھیں شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ انتہائی خواہش کے باوجود اللہ نے اولاد نرینہ سے محروم رکھا تھا۔ اب چار بیٹیوں کی عصمت و عفت اور حرمت کا محافظ صرف وہی تھا۔ چاہے سوتیلا ہی سہی بھائی تو تھا۔ سر پہ سایہ تو تھا خصوصاً باپ کی وفات کے بعد مالی، انتظامی اور دفاعی تینوں معاملات حماد ہی سنبھالے ہوئے تھا۔ گویا اب اس کا وجود تائی کے لیے خاص اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ آخر تین کنواری بن باپ کی لڑکیاں گھر بیٹھی ہوئی تھیں۔

"جی بہتر۔" وہ کہہ کر خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اے تمیش! اس کا کوئی استری کیا ہوا جوڑا نکال دو۔ نہا کر تازہ دم ہو جائے گا۔ آمنہ تم اتنی دیر میں روٹیاں ڈال دو۔"

تائی نے بے نیازی سے ٹی وی کے آگے ڈٹی تمشین سے کہہ کر کچن میں مگن آمنہ کو آرڈر کیا تھا۔

تمشین نے چونک کر حیران نظروں سے تائی کو دیکھا۔ بھلا انہیں اس کے پہننے، کھانے کی پروا کب سے ہو گئی۔

حماد اندر کی سمت بڑھ چکا تھا۔

"خود ہی کرے گا تائی جان! ایسا بھی اب کیا۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔ اسے اپنی پشت پر تائی کی ناگوار نظروں کا احساس فوراً ہو گیا تھا۔

"حماد کہاں رہ گیا۔ اے رمنا آواز دینا ذرا۔"

رات کے کھانے پر تائی نے نشست سنبھالتے ہی ادھر ادھر دیکھ کر رمنا کو کہا تھا۔

تمشین جھنجلا سی گئی۔

"آ جائے گا خود ہی تائی جان! پہلے وہ کب کھاتا تھا ہمارے ساتھ۔" اس نے بے زاری سے کہا تھا۔

جمیلہ تائی نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔ "وہ سفر سے تھکا ہارا آیا ہے ظاہر ہے، بھوک پیاس بھی خوب لگ رہی ہو گی۔"

"جب لگے گی تو آ بھی جائے گا۔ ہم کیا نواب زادے کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔"

اسے تائی کے اس انداز پر کوفت ہو رہی تھی۔

"اگر تمہیں زیادہ بھوک لگی ہے تو شروع کر سکتی ہو۔" ناخوشگوار تاثرات کے بوجھ سے ان کا چہرا کھنچ سا گیا تھا۔ وہ کچھ متعجب سی حق دق بیٹھی انہیں دیکھتی رہ گئی۔ وہ کب سے اتنا اہم اور "عزیز" ہو گیا ان کو۔

رمنا کے دوبارہ بلانے پر وہ بے آواز قدم اٹھاتا ٹیبل پر آ گیا اور نہایت خاموشی سے تھوڑا سا پلیٹ میں ڈال کر کھانے لگا۔

"تم تو کچھ لے ہی نہیں رہے۔ تمشی! تم اس کی پلیٹ میں ڈالو کچھ۔ یہ بریانی والی ڈش تمہارے سامنے ہے۔"

تائی کے لاڈ بھرے انداز پر وہ دل ہی دل میں تلملا رہی تھی۔ خود پہ جبر کر کے ڈش کو برائے نام حرکت دیتے ہوئے اس نے تھوڑا سا اس کی سمت سرکا دیا اور پھر اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

"تائی جان! میں امی کی طرف جا رہی ہوں۔ وہ انتظار میں ہوں گی۔ انہیں بتایا تھا کہ رات ان کے پاس رہوں گی۔"

کھانے کے بعد ٹیبل سے اٹھتے ہوئے اس نے اطلاعی انداز میں کہا۔

تائی ایک دم حیران سی دیکھتی رہ گئیں۔ بچی تو تھیں نہیں، جو اس کے تیوروں سے سمجھ نہ پاتیں اول

روز سے اب تک دونوں کے درمیان کیسے تعلقات تھے اور ان کی کیا نوعیت تھی' اس سے وہ بخوبی آگاہ تھیں۔ ویسے بھی اس بات کا اندازہ تو انہیں پہلے سے تھا لیکن جانے کیوں اب انہیں تمشین کے یہ بے مہر' بے گانہ سے لاتعلق انداز کھٹکنے لگے تھے۔

''کیا ضروری تھا یہ سب کچھ۔'' نیلو نے اس کے رویے پر خاصا ناگوار ردعمل ظاہر کیا تھا۔ تمشین عالیہ بیگم کے بجائے ادھر ہی چلی آئی تھی اور نیلو کے بیڈروم میں اس کے ہمراہ آرام دہ بستر پر دراز تھی۔

''تمشی! عقل وفہم کے دریچے کے پٹ کھول دینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ تم کب تک خود کو بھی چوزی سمجھتی رہو گی۔''

نیلو کے لہجے میں سخت تادیب تھی۔

''میری مرضی' بھئی میں وہ مسکین' یتیم بر فیلی شکل دیکھ دیکھ کر بور نہیں ہونا چاہتی تھی' سو چلی آئی۔''

اس کے لہجے میں بے حسی اور خودسری کی جھلک صاف طور پر عیاں تھی۔

''اس شکل کے ساتھ ساری عمر گزارنا ہے۔'' نیلو کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔

''جب حشر کا دن آئے گا' اس وقت دیکھا جائے گا۔ فی الوقت مجھے سونے دو۔'' وہ کروٹ لے کر اوندھی ہوگئی تھی۔

اس کے انداز میں حد درجہ لاپروائی اور بے نیازی تھی۔ نیلو خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

تائی ان دنوں رمنا کے لیے رشتے کھنگال رہی تھیں۔ ارادہ تھا کہ آمنہ کے ساتھ ہی دونوں کو اکٹھا نمٹا دیا جائے۔ آمنہ باجی کی منگنی دو سال پہلے ہوچکی تھی اور اب وہ لوگ شادی کے لیے مسلسل دباؤ ڈال رہے تھے۔ اس دن بھی کچھ لوگوں نے رمنا کے سلسلے میں آنا تھا۔ بڑی اچھی فیملی تھی۔ بڑی دھوم سنی تھی۔ صغریٰ خالہ نے تو ابھی سے رشتہ پکا ہونے کی متوقع خوشی میں لڈو طلب کرلیے تھے۔ وہی یہ رشتہ لے کر آئی تھیں۔ مہمانوں کی اہمیت اور خصوصیت کے پیش نظر تائی جان بھی بہت محتاط تھیں۔ ہر معاملے کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ مہمانوں کے استقبال کے لیے بذات خود انتظامات کی نگرانی کررہی تھیں بلکہ مزید احتیاط کے طور پر حمنیٰ آپا کو بھی سسرال سے بلوا بھیجا تھا۔ حماد کو کل شام ہی فون کرکے مطلع کرچکی تھیں۔

دمِ رخصت مہمانوں کے تیور خاصے حوصلہ افزا اور خوشگوار تھے۔ حماد نے نہایت بچے تلے انداز میں

ی کے سوالوں کے جوابات دے کر انہیں مطمئن کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی محتاط انداز میں بڑی میل سے تفتیش کی تھی جس پر تمشین کو خاصی حیرت ہوئی تھی۔ حماد کے انداز سے کہیں بھی وہ جھلک ہں مل رہی تھی' جو وہ عام طور پر دیکھنے کی عادی رہی تھی۔ انداز کی سنجیدگی میں بڑی پختگی' وقار اور فہم راست کی جھلک نمایاں تھی۔ اس کا لب ولہجہ بڑا متوازن اور سلجھا ہوا لگ رہا تھا۔

''پھر کیسے لگے تمہیں یہ لوگ؟'' مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد تائی جمیلہ نے بڑے اشتیاق ے حماد کی شکل دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

ان کے انداز سے ظاہر تھا جیسے وہ مثبت ردعمل کی متمنی ہوں۔

''فیملی تو اچھی ہے' لڑکے سے مل کر صحیح اندازہ ہوسکے گا۔''

وہی دھیما' کترایا' بچایا لہجہ اور انداز دوبارہ در آیا تھا۔

''میری تو تسلی ہوگئی ہے۔ ماشاءاللہ شریف' سلجھے ہوئے کھاتے پیتے لوگ ہیں' تم تحقیقات کرالینا لڑکے سے مل کر بھی اپنی تسلی کرلینا۔ باقی جو خدا کو منظور۔''

تائی اس رشتے کے لیے خاصی سنجیدہ ہورہی تھیں۔

''کھانا کھالیا تم نے؟'' وہ اندر کی طرف مڑ رہی تھی کہ تائی نے آواز دے کر پوچھ لیا۔

پھر اس کا جواب سنے بغیر ہی تمشین سے مخاطب ہوگئیں۔

''اے تمشی! کھانا گرم کرکے لگادو اس کے لیے' مہمانوں کے ساتھ تو اس نے ایک کے بعد دوسرا الہ نہیں لیا' میں دیکھ رہی تھی۔''

''نہیں' مجھے بھوک نہیں ہے۔ یہ تکلیف نہ کیجیے۔''

اس نے پیشانی کو ایک ہاتھ سے ہلکا سا دبا کر جواب دیا۔

''چائے بنادو تمشی!'' تائی نے اندازہ لگایا کہ اس کے سر میں درد ہوگا تو سو تمشین کو دوسرا حکم صادر کردیا۔ دوپہر کو وہ گھر پہنچا تھا اور اس کے پہنچنے کے ایک گھنٹے بعد مہمان آگئے تھے۔ پوری شام اور ات کھانے تک ان کے ساتھ رہا۔ مہمانوں میں تین مرد' ایک عمر رسیدہ خاتون اور ایک نوعمر لڑکی تھی۔

تمشین نے تائی کے آرڈر پر پیچ وتاب کھا کر یکے بعد دیگرے تائی اور حماد کی سمت دیکھا تھا۔

''جاؤ اور...... ایک کپ میرے لیے بھی بنادینا' بیچ دردسری کا کام ہوتا ہے یہ تو......''

حماد کے روکنے سے پیشتر ہی تائی نے اپنی طلب کا اضافہ کرکے گویا حتمی مہر ثبت کردی۔

وہ پیر پٹختے ہوئے کچن کی سمت بڑھی تھی۔

ایک آواز کے ساتھ اس نے چائے لاکر سائیڈ ٹیبل پر گویا پٹخ دی تھی۔

وہ بیڈ کے ایک کونے پر نیم دراز اپنی فائلوں میں کھویا ہوا تھا۔

کپ رکھ کر وہ بے نیازی سے نیچے لاؤنج میں چلی آئی۔ تائی آرام کے لیے اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔

ریما قالین پر کشن کے سہارے اُوندھی لیٹی فلم دیکھ رہی تھی۔

''آمنہ باجی اور رمنا کدھر ہیں؟'' اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آمنہ باجی تو بستر استراحت پر ہیں اور رمنا آپی سائرہ کے ہاں گئی ہیں' ادھر ہی رات بسر کریں گی۔''

''اچھا۔'' وہ بے زار سی ہوگئی۔

''چلو پھر بوریت دور کرنے کے لیے کارڈز کھیلتے ہیں۔''

اسے لطف تو نہیں آرہا تھا مگر پھر بھی بے ارادہ ریما کے ساتھ کھیل میں لگی رہی۔ اسی اثناء میں فلم بھی ختم ہوگئی۔

''نیند آرہی ہے بھابی اب تو۔'' بالآخر ریما جمائیاں لیتے ہوئے اٹھ گئی۔

اس نے نظریں اٹھا کر وال کلاک کی سمت دیکھا۔

''ارے! سوا بارہ ہوگئے ہیں۔'' اسے بھی اٹھنا ہی پڑا۔

وہ دل ہی دل میں جھنجلائی جھنجلائی' تھکے تھکے قدموں سے اوپر بیڈروم میں آگئی۔

کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا۔ روشنی کے نیلے ہلکے غبار میں پورا کمرا ڈوبا ہوا تھا۔ حماد ایک سائیڈ پر سبز کمبل میں بڑے پرسکون انداز میں محوِ خواب تھا۔

تمثین نے غیر ارادی طور پر سائیڈ ٹیبل کی طرف دیکھا اور پھر ایک لمحے کو جسم کا سارا خون اسے چہرے کی طرف دوڑتا محسوس ہوا۔

چائے کا کپ جوں کا توں ''ان چھوا'' رکھا ہوا تھا۔ احساسِ توہین اور خجالت سے اس کے اعصاب جلنے لگے۔

گویا اس نے بھی جتادیا تھا کہ مجھے تمہارے احسان' تمہاری جرأت سے کوئی سروکار نہیں' اگر تم اتنے آمیز انداز میں ''احسان'' کو پٹخ کے جاسکتی ہو تو میں اس کو قبول نہ کر کے جوابی وار کرنے کا مجاز ۔ میں بھی تمہیں ایسا موقع کیوں فراہم کروں کہ جس کے باعث تم اپنی انا کی تسکین کر کے مجھ پر ن ہونے کی سند پاسکو۔ اگر تم کم ظرفی کا مظاہرہ کرتی ہو تو میری خودی' میری انا' اور میری مردانگی سلامت ہے' اگر تم مجھ سے مخاطب ہونے اور ہمکلام ہونے سے خار کھاتی ہو تو میں بھی اپنے پندار کو نہیں لگنے دوں گا۔

ساری رات توہین وتذلیل اور خجالت کے احساس نے اسے سونے نہیں دیا۔ رات گویا کانٹوں پر ہوئی تھی۔

''یہ اتنا بے بس سا' بے حس سا' بے ضرر سا بندہ اتنا جرأت مند کیسے ہوگیا کہ مجھے ذہنی زک پہنچانے ''

اسے اسی بات پر طیش آرہا تھا۔

فجر کے قریب اس کی آنکھ لگی تھی۔ سو ساڑھے دس بجے تک ڈٹ کے سوئی۔ پھر اٹھ کر نہا دھو کے ر ہو کے نیچے آئی تو' واگیارہ کا ٹائم ہو رہا تھا۔ جمعے کا دن تھا سو سب گھر پر ہی تھے۔

حماد صحن میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ تائی کے پاس فرحت چچی آئی بیٹھی تھیں۔ رمنا' نیلو کی طرف نکلی ئی تھی۔ آمنہ باجی حسبِ معمول کچن میں تھیں۔ وہ چائے کا کپ لے کر تائی کی طرف آگئی۔

''اٹھ گئیں ہو۔'' چچی فرحت نے اس کے سلام کا جواب دے کر اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے ا۔

''جی ہاں' اٹھنا تو تھا ہی۔'' اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''مگر اتنی دیر سے اٹھنا کچھ زیب نہیں دیتا۔'' فرحت چچی نے ناک بھوں چڑھائی۔

''پردیسی میاں گھر آیا ہو تو بیوی اس کی دلداری اور صحت وتندرستی کے لیے اس کے پسند کے کھانے تے نہیں تھکتی۔ اس کی خوراک اور لباس کا خصوصی خیال رکھتی ہے کہ کون سا روز روز آنا ہوتا ہے۔ ایسا ہلی بار ہی دیکھا ہے کہ میاں تو صبح سویرے نہا دھو کے بیٹھا ہے اور بیوی دوپہر تک بستر پر اینڈ رہی ''

''تو اس کی وجہ بھی میاں ہی ہے۔ رات بھر اس کی ناز برداریاں اور دلداریاں کر کے تھکی ہاری بیوی

کیا دو گھڑی آرام بھی نہ کرے۔''

چچی فرحت کے سیر کا جواب سوا سیر میں دینے کے لیے اس نے بھی تمام حدیں عبور کر لیں اور ہاتھ نچا کے بے جھجک انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ فراموش ہی کر گئی کہ محض چند فٹ کے فاصلے پر صحن میں کرسی جمائے حماد بھی بیٹھا ہے۔

چچی کی بولتی تو خیر بند ہونی ہی تھی۔ تائی جمیلہ جو اس کے اتنی دیر سے اٹھنے پر اظہارِ ناراضگی کے لیے چپ سادھے بیٹھی تھیں، ہکا بکا رہ گئیں۔ (اس سے توقع کہاں کی جا سکتی تھی۔ اتنی عقل مندی اور وفاداری کی)

دھڑلے سے کہہ کر تلملاتی، طیش کھاتی، بل کھا کے مڑی تو حماد کی متعجب و متحیر نگاہوں سے نظریں الجھ گئیں۔

اس پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ چچی فرحت کو پسپا کرنے کے لیے اس وقت تو اس نے بے سوچے سمجھے اتنی ذومعنی بات کا وار کر کے میدان لوٹ لیا تھا، مگر اپنی زبان کی بے باکی کا احساس اب ہو رہا تھا۔ کچھ بھی ہو بہرحال شوہرانہ حقوق و فرائض کا تصور عورت کے انگ انگ میں حیا کے موتی پرو دیتا ہے۔ احساسِ شرمندگی اسے زندہ دفن ہونے پر مجبور کر رہا تھا۔ بمشکل تمام اندر کی سمت بڑھی تو دروازے کے ساتھ کھڑی نیلو کی دبی دبی ہنسی اسے نئے سرے سے خجالت سے دوچار کر گئی۔

''اوہو ناز برداریاں، شب بیداریاں، دلداریاں، واہ بھئی واہ! ہمیں تو آپ کی ذات کے اس پہلو کی خبر ہی نہ تھی۔''

وہ اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی آئی تھی اور اب دونوں ہاتھوں کو ہونٹوں پہ رکھے کھلکھلا رہی تھی۔

''بکواس نہیں کرو۔'' اس نے غصہ دکھانے کی کوشش کی۔ احساسِ خفت سے برا حال ہو رہا تھا۔

''ویسے یار سچ کیا بڑی محنت کی تھی رات۔'' وہ معنی خیز لہجے میں کہتی سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

اس نے جھنجلا کر دونوں کشن اس کے سر پر دے مارے۔

''ویسے تجھے اتنی ''سینس'' ہے لگتی تو نہیں ہو۔'' وہ بغور اس کا دہکتا ہوا انگارا چہرا دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''نیلو!'' وہ روہانسی ہو چلی تھی۔

''اچھا چلو اب نہیں، تجھے پتا ہے فرحت چچی کیوں تشریف لائی ہیں؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''بھئی منیب احمد تشریف لا رہے ہیں پرسوں۔ اس کی خبر دینے آئی ہیں۔'' نیلو نے انکشاف کرتے غور سے اس کی سمت دیکھا۔

''ہیں اچھا'' ادھر کوئی خاص ردعمل نہیں تھا۔ بس معمول کے مطابق حیرت اور تعجب تھا۔

''چلو اچھا ہے انہیں بھی وطن یاد آیا۔''

''چچی فرحت ان کی آمد کی خوشی میں اک ہنگامِ مسرت بپا کرنا چاہتی ہیں، اس کی دعوت دینے آئی ''اس نے مزید کہا۔

''بھئی واہ! تو یہ انداز ہیں۔'' وہ ہنس پڑی۔

''تمہیں اور حماد کو خصوصی دعوت دی ہے۔''

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔'' وہ حسب عادت ایک جھٹکے سے بال پرے کرتے ہوئے اطمینان یا ہوئی تھی۔

''منیب بھائی! آپ تو سچ مچ ہمارے لیے خواب ہو کر رہ گئے تھے۔''

وہ خیر سگالی کے جذبات کے تحت رواداری سے اظہارِ مسرت کر رہی تھی۔

منیب احمد ہنس پڑے۔

''یقین کر لو بھئی میں خواب سے حقیقت میں آ چکا ہوں۔''

''لیکن ہمارے لیے خواب و خیال ہو کر رہ گئے ہیں۔'' اس نے بھی برجستگی کا مظاہرہ کیا۔

''میں خیال ہوں کسی اور کا مجھے سوچتا کوئی اور ہے۔''

نیلو نے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے مصرعہ کسا۔

وہ لوگ ہنس پڑے۔

''ارے حماد بھائی! آپ ادھر کیوں کھڑے ہیں۔ منیب بھائی سے ملاقات ہوئی آپ کی۔''

نیلو کی پکار پر تمشین نے بھی مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ اس سے محض چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ چہرے

پرخصوص سنجیدگی کی چھاپ تھی۔

''جی ہو چکی ہے ملاقات۔''

''ارے ان سے ملاقات نہ ہوگی۔ اتنی مشہور اور عظیم شخصیت ہیں۔''

منیب نے خوش دلی سے قہقہہ لگاتے ہوئے یگانگت سے حماد کو دیکھا تھا۔

''یہ عظیم کی اصطلاح کیوں استعمال ہوئی ہے۔'' تمشین نے استفسار کیا۔

''بھئی! تمہارے جیسی عظیم شخصیت کے شوہر کا مرتبہ جو حاصل ہے۔''

اردگرد کھڑے لوگ ہنس پڑے۔

''ویسے کچھ زیادہ ہی جلدی نہیں دکھائی تم نے؟ اپنا ایم ایس سی کمپلیٹ کر لیتیں۔'' منیب نے کوک کے سپ لیتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

''کیا فرق پڑتا ہے۔'' اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

''یعنی ابھی بھی نہیں پڑا۔'' منیب مصنوعی حیرانگی کے عالم میں بولے۔

''آپ کو لگتا ہے؟'' اس نے فوراً کہا۔

''ہاں یہ تو ہے' سرمو فرق نہیں پڑا۔'' اسے سر سے پیر تک جانچتے ہوئے انہوں نے بشاشت سے کہا تھا۔

''حماد بھائی! آپ نے کچھ نہیں لیا۔'' نیلو' حماد کی خاطر داری میں لگی ہوئی تھی۔

''لے رہا ہوں۔'' اس کا انداز کترایا کترایا تھا۔

نیلو نے کچھ جتانے والے انداز میں تمشین کی طرف دیکھا تھا' جواب میں وہ ازلی لاپروائی سے کندھے اچکاتی پھر منیب کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''آپ کے ساتھ کوئی دم چھلا نظر نہیں آرہا جس کے بارے میں ہم نے سنا تھا امریکہ سے واپسی؛ اگر کوئی ہمراہ نہ لے کے آئے تو سمجھو وہ امریکہ گیا ہی نہیں' اتنے برس افریقہ کے جنگلوں میں گھاس کھودتا رہا ہے۔''

اس کا انداز اس قدر شوخ و شریر...... تھا کہ اردگرد بے ساختہ کئی قہقہے ابل پڑے۔

''لے تو آتے مگر کیا کرتے۔ دل ادھر ہی ''پھنسا'' ہوا تھا۔'' بڑی دلکشی سے مسکراتے ہوئے تھوڑا جھک کر انہوں نے جواب دیا تھا۔

نیلو نے اچھی خاصی تلملاتی نگاہوں سے بیک وقت منیب اور تمشین کو گھور کر حماد کے سپاٹ چہرے ہمت چور نظروں سے دیکھا۔

''دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔''

تمشین کی برجستگی نے ایک بار پھر منیب کو کھلکھلانے پر مجبور کر دیا۔

''کیا پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں یہاں؟'' چچی فرحت کشاں کشاں اس سمت چلی آئیں اور پیار ری صدقے واری ہوتی نظروں سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے استفسار کرنے لگیں۔

''تمشین سے بات ہو رہی تھی۔ بڑی مزے دار اور دلچسپ باتیں کرتی ہے۔''

وہ بدستور بشاش سے انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔

نیلو نے اپنے اندر عجیب سی بے چینی محسوس کی۔ کچھ الجھی ہوئی چور نظروں سے دوبارہ حماد کی سمت بھا۔ وہ جیسے ساری دنیا سے بیگانہ صوفے کی ایک سائڈ پر بیٹھا چائے کے کپ سے کھیل رہا تھا۔

''اتنی بدھو اور بے وقوف ہو تم' کچھ عقل مستعار لے لو کسی گدھے سے۔'' واپسی پر تنہائی ملتے ہی وہ شین پر برس پڑی تھی۔

''کیوں کیا ہوا؟'' اس نے انتہائی بھولپن سے دریافت کیا تھا۔

نیلو سر پیٹ کر رہ گئی۔

''الو کی دم فاختہ' میاں کے سامنے کسی غیر سے ٹھٹھول کرنا زیب دیتا ہے بیوی کو؟ تجھے ذرا خیال ں آیا۔ حماد بھائی کیا سوچتے ہوں گے جب کہ منیب کسی حوالے سے تمہاری ذات سے منسلک بھی رہ ا ہے۔''

تمشین کے مسکراتے ہونٹ یکبارگی بھنچ گئے۔ چہرے پر تند سا کھنچاؤ آ گیا۔

''وہ کوئی غیر نہیں' چچا زاد ہے میرا اور جہاں تک ماضی کے تعلق کی بات ہے۔ اس تعلق کو تو میں نے سا وقت محسوس نہیں کیا تھا' جب یہ ممکنات میں سے تھا' اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہیں بات رتے ہوئے کچھ سوچ لینا چاہیے۔''

اس کے نروٹھے انداز میں واضح برہمی عیاں تھی۔

''میرا مطلب یہ نہیں تھا ڈیر۔'' وہ اسے منانے کو بازو اس کے گرد ڈالتے ہوئے یگانگت سے لی۔

''میں نے کب کہا کہ تم خدانخواستہ' منیب بھائی سے سابقہ تعلق کے سبب ملی تھیں۔ ایسی بات تو دونوں جانب نہیں ہے لیکن یار! یہ شوہر نام کی جو چیز ہوتی ہے ناں' بڑی جلدی بیوی سے بدگمان ہو جاتی ہے۔ تشکیک و تذبذب کا شکار ہونے لگتی ہے خصوصاً اتنے بشاش' بے تکلف اور خوش خلق انداز میں تم نے کبھی اپنے شوہر سے بات نہیں کی جس طرح منیب بھائی سے کر رہی تھیں تو ایسے میں حماد بھائی کے دل میں میل آنا لازمی امر ہو گا۔ آخر ان کی بھی عزتِ نفس ہے۔ شوہر کبھی برداشت نہیں کرتا کہ اس کی بیوی اس کے سامنے کسی دوست کو اہمیت دے اس کی طرف متوجہ رہے۔ پھر تم دونوں کے درمیان تو ویسے بھی تعلق کا کوئی عملی پل نہیں ہے۔''

وہ بڑے تحمل اور تدبر سے اسے سمجھا رہی تھی۔

''اونہہ! وہ بے حس سا پتھر دل شخص اس پر کیا اثر پڑے گا۔''

وہ بدستور لاپروا تھی۔

نیلو کی آنکھوں میں ایک چمک سی ابھر آئی۔

''تو تم چاہتی ہو کہ اس پر اثر پڑے۔'' وہ براہِ راست اس کا چہرا پڑھ رہی تھی۔

''میری بلا سے۔'' اس نے بے نیازی جتانے کی کوشش کی مگر نیلو کو اس کی تہ تک اترنا آتا تھا۔

''ہوں' دیکھا اسی دن کے لیے تجھے سمجھایا تھا کہ ایک چیلنج کے لیے زندگی تباہ مت کرو۔ مت اندھا دھند چھلانگ لگاؤ' مگر تم نے کسی کی ایک نہیں سنی اپنی سی کر لی۔''

''تو میں کون سا کسی پہ الزام لگا رہی ہوں۔ کسی کے آگے فریاد کر رہی ہوں۔'' وہ بھڑک اٹھی۔

''میں خوش ہوں جیسی بھی ہوں۔''

''الزام لگانا یا فریاد کرنا تو ویسے بھی بے سود ہو گا' اب ضرورت ہے ''سمجھوتے'' کی نباہ کی اور یہی تجھے سب اشارے کنایے میں سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اب چھوڑو یہ بچکانہ پن جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب سنجیدگی سے عملی زندگی کا آغاز کرو۔''

''تو میں اور کیا کر رہی ہوں؟'' اس کے پلے تو سرے سے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔

''یہی تو بات ہے' اب دیکھو ناں پہلی رات ہی اپنی بیزاری کا اظہار کر دیا۔ پھر اس کی ذات سے اتنی بے نیازی اور بے توجہی کے مظاہرے تمہاری عادت میں شامل ہو چکے ہیں۔ تمہیں کچھ ہوش نہیں ہوتا کہ تمہارا شوہر کہاں ہے' کس حال میں ہے۔ کس چیز کی اسے ضرورت ہے' اس کے آرام' اس کی

تنہائی اور اس کا دھیان بٹانے کا خیال کبھی تمہارے دل میں نہیں آیا۔ اس کی خواہش' طلب اور مزاج سے قریب ہونے کی کوشش نہیں کی' اس کے لیے یہ ثبوت کیا کم ہے کہ تم اس کے احساسات سے قطعی بے خبر مگن اور مسرور سی منیب بھائی کے ساتھ باتوں میں لگی ہوئی تھیں۔''

نیلو اچھی طرح اس کے لتے لے رہی تھی۔ وہ برے برے منہ بناتے ہوئے سنتی رہی۔

''تمہیں سارا جہان پھر کر یہی پسند آنا تھی۔'' وہ اشتعال سے مٹھیاں بھینچ رہی تھیں۔

''میں نے خاندان سے باہر کے چکر میں اس سے کئی گنا اچھی لڑکی کا رشتہ لوٹا دیا تھا اور تم کو پسند آئی بھی تو وہی خاندان کی لڑکی۔''

''خاندان کی لڑکیوں میں کیا خرابی ہے امی؟ یوں بھی اپنے گھر کے ہیرے موتی ٹھکرا کر دیارِ غیر کے کوئلے پتھروں سے دامن بھرنا دانش مندی کی علامت تو نہیں ہے۔ مجھے تو خبر ہی نہ تھی دادا جان مرحوم کے طے شدہ رشتے کی ورنہ کبھی آپ کو یہ قدم اٹھانے کا مشورہ نہ دیتا۔ بہرحال اس کا بہترین ازالہ نیلو کا انتخاب ہی ہو سکتا تھا جو میں کر چکا ہوں۔''

منیب حتمی انداز میں کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہونہہ! جانے کیا الو کا گوشت کھلا دیا ہے امریکہ والوں نے اسے' لوگوں کی اولاد تو اتنی آزادی پسند ہو کے نکلتی ہے اور...... یہ نواب صاحب......''

وہ بڑبڑاتی' تلملاتی الماری میں کھٹاک پھٹاک کرنے لگیں۔ بہرحال بات مانے بغیر گزارا تو نہیں تھا۔ بیٹے کی فرمائش پوری تو کرنا ہی تھی۔

''ارے یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' وہ اوپر ٹیرس پر بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی' جب چہرے پر ہوائیاں لیے لرزتے' ڈگمگاتے قدموں سے نیلو دروازہ کھول کر اس کی سمت آئی۔

''کیا ہوا بھئی؟'' وہ بے اوسان سی نیلو کو دیکھتے ہوئے خود بھی حواس باختہ ہونے لگی۔

''کہیں چچی فرحت کے پرپوزل کا ردعمل تو نہیں؟''

کھٹ سے تمثین کے ذہن کے دریچے میں یہ خیال لہرایا۔ آگاہ تو وہ ہو ہی چکی تھی۔

''تمثی...... تمثی!'' وہ بے دم ہو کر اس کے کندھوں پر ڈھے گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

تمثین نے دکھ سے بوجھل گہرا سانس اندر کھینچا اور دھیرے دھیرے اسے تھپکنے لگی۔ یقیناً یہ باخبر

ہو چکی ہے۔

"پلیز نیلو! بی ایزی' پھر کیا ہو گیا؟ ابھی فائنل تو نہیں ہوا ناں' میں جمال بھائی اور ارم بھابی سے بات کروں گی۔ انہیں یقیناً تمہاری خوشیاں عزیز ہوں گی گھبراتی کیوں ہو؟"

"تمشی!" وہ اتنی بے قراری سے زاروقطار رو رہی تھی کہ تمشین کا حساس دل بے کل سا ہونے لگا۔

"پلیز نیلو' حوصلہ۔"

"وہ......وہ کہتا ہے...... وہ کہتا ہے لڑکیاں تو ہوتی ہی بے وقوف ہیں۔ مردوں کے دل میں اترنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتیں۔ بھئی سیدھی سی بات ہے' میں تو ایسی لڑکی پسند کروں گا جس کا آنچل بھی کبھی کسی غیر مرد نے نہ دیکھا ہو۔ بھلا اس لڑکی کو کیوں بنانے لگا شریک حیات' جو پانچ سو مردوں کے درمیان کام کرتی ہے۔ ہر دوسرے سے بات چیت' جان پہچان اور ہائے ہیلو رکھتی ہے' جو میرے سامنے ادا سے بولتی' ہنستی مسکراتی ہے' اپنی لچھے دار باتوں سے رجھاتی ہے' بھئی ان سے تعلق تو وقت گزاری کے لیے ہوتا ہے تاکہ کام اچھے ماحول میں کیا جاسکے۔"

"ہیں!" تمشین کی تو سٹی گم ہو گئی۔ ایک ساعت کو لگا دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔

"تم عابد ستار کی بات کر رہی ہو؟ کیا اس نے یہ سب تمہیں کہا ہے؟"

"نہیں' آج اپنے کمرے میں کسی گہرے دوست سے باتیں کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ میں نے تو اتفاقاً سن لیا۔ اف اللہ تمشین! میں مر کیوں نہ گئی۔"

وہ وحشت زدہ انداز میں روتی' سسکتی کہہ رہی تھی۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی اتنا اعلاظرف' اتنا فہیم اتنا بلند خیال شخص ایسا ہو سکتا ہے۔ اتنی تنگ ظرفی اور بے رحمی سے بات کر سکتا ہے' اف میں اسے کیا سمجھتی رہی اور وہ۔ وہ کھلونا سمجھ کر مجھ سے وقت گزاری کرتا رہا؟"

تمشین نے گہری سانس لی۔

"یہی تو بات ہے مائی ڈیئر نیلو! لڑکیاں جب آفس میں اپنے باس یا سینئر کا گرم جوش اور خیر خواہانہ رویہ دیکھتی ہیں تو ان سے توقعات وابستہ کر کے خواب بننا شروع کر دیتی ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ مرد گھر بسانے کے لیے مردوں کی فیلڈ میں کام کرتی لڑکیوں کا چناؤ نہیں کرتے۔ وہ دفتروں میں لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں انہیں بے تکلفانہ اور دوستانہ انداز اپنانے پر اکساتے ہیں ذہنی وطبعی آزادی کی

باتیں کرتے ہیں۔ مرد وزن کے مساوی حقوق کے راگ الاپتے ہیں۔ عورت کو ترقی کی نئی نئی راہیں دکھاتے ہیں لیکن شادی کے لیے گھریلو سی سادہ سی معصوم طبع لڑکی کی تلاش کرتے ہیں مجھے خبر تھی ایسا ہی ہو گا اسی لیے میں اس کے ذکر سے چڑتی تھی۔ تمہیں ہزار ہا مواقع پر اشارتاً سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کہ کسی کی پسند میں ڈھال کے خود پر پابندیاں لگا رہی ہو اس کے دل میں کبھی مقام حاصل نہیں کر پاؤ گی مگر خیر شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہم لوگ خود تجربے کرنے کے شوق میں اس حد تک بے قرار ہوتے ہیں کہ "بھگتے ہوئے" اور ٹھوکر کھائے ہوئے کے تجربات کے نچوڑ سے سبق سیکھنے کو اپنی توہین گردانتے ہیں۔"

کتنی ہی دیر نیلو تڑپتی' سسکتی رہی۔ تمشین گم صم سی اس کی بے کل سسکیاں سنتی رہی۔

رمنا کے سسرال والوں نے اتنی جلدی مچائی ہوئی تھی کہ جمیلہ بیگم کو شادی کی تاریخ دیتے ہی بن پڑی۔ ادھر آمنہ باجی کے سسرال کو بھنک پڑی تو وہ بھی کشاں کشاں چلے آئے نتیجتاً دونوں بہنوں کی ایک ساتھ رخصتی طے پا گئی۔ دو ماہ کا عرصہ پلک جھپکتے بیت گیا۔ تیاریاں کرتے کرتے بھی کتنے ہی کام رہتے تھے۔ تائی تو بری طرح بوکھلا ہی گئی تھیں۔ ایسے میں حماد نے مثالی تعاون کیا۔ دونوں بہنوں کے جہیز کی خریداری' شادی کے سلسلے میں کیے جانے والے انتظامات' سب کچھ اس نے سنبھال لیا تھا۔

آج مایوں تھا۔ مہمانوں سے سارا گھر بھرا ہوا تھا کسی جگہ بھی تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ان کا خاندان ویسے بھی بہت وسیع وعریض تھا۔ بقول رمنا کے پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں ہمارے رشتے دار "اگے" ہوئے ہیں۔ اس کے اپنے کمرے میں چار پانچ شادی شدہ خواتین اپنے چیاؤں پیاؤں سمیت ڈیرے ڈالے ہوئے تھیں۔ رات کو مہمانوں کے کچھ اور قافلے چلے آئے۔ ان کے لیے سونے کا انتظام کرنے کے لیے تائی کی ہدایت پر وہ اپنے کمرے کے بیڈ کے گدے اٹھانے لگی تاکہ انہیں باہر بچھا کر بستر کا عارضی بندوبست کیا جا سکے۔ دوسری سائیڈ کا فوم جونہی اٹھایا اسے لکڑی کے بیڈ پر ایک تصویر اوندھی پڑی نظر آئی۔ پشت پر لکھا تھا۔

"میری متاع حیات' میری آتی جاتی سانسوں کی ضمانت۔"

اس نے بڑے تجسس سے تصویر سیدھی کی تھی۔

اور پھر جیسے گنگ سی کھڑی رہ گئی۔

اف چہرہ تھا کہ حسن ودلکشی کا مرقع نمونہ اس کے سامنے تھا۔ ہر ہر نقش اتنا سحر انگیز' اتنا پرکشش اور

بے مثال تھا کہ لڑکی ہونے کے باوجود کتنی ہی دیر اس کی نگاہیں چہرے سے ہٹنا بھول گئیں۔ اس کی سانسیں رکنے سی لگیں۔ اسے بہت کچھ یاد آنے لگا۔

اس نے اکثر اوقات رات کے کسی پہر یا فرصت کے وقت حماد کو کسی تصویر کو گھنٹوں تکتے اور اس سے سرگوشیاں کرتے دیکھا تھا۔

اوہ تو یہ وہ ہے۔ وہ دراصل اس ساحرہ کا دیوانہ ہے اسی لیے وہ سارے جہان سے غافل اپنے آپ میں گم رہتا ہے۔ اسی لیے شبِ اولین سے مجھ پر جائز حق کے باوجود اس کا استعمال نہیں کیا۔ ظاہر ہے ایسی ماہ تمام بے مثال حسینہ کے سامنے میری سادہ سی عام سی شخصیت کا داؤ کیوں چلنے لگا۔

وہ جانے کیوں ایسا سچ رہی تھی۔ اپنا وجود، اپنی خود اعتمادی اسے ہلکی پڑتی نظر آ رہی تھی۔ ایک بار پھر اس نے اس حسین چہرے کو دیکھا۔ عجیب سی بے تابی، بے کلی اس کے گرد گھیرا ڈالنے لگی۔

''مجھے اس سے کیا۔ میرا کون سا اس سے کوئی رابطہ، رشتہ ہے۔ سب کچھ تو کاغذوں میں دفن ہے۔''

اس نے ہمیشہ کی طرح خود کو ریلیکس کرنا چاہا مگر اس بار کوئی تاویل، حجت دل تسلیم نہیں کر رہا تھا۔

یونہی خود سے الجھتی الجھتی باہر سے کسی کے پکارنے پر وہ کمرے سے نکل گئی۔

''بس ہمیں نہیں پتا، آپ کو وہ ڈریس پہننا ہوگا۔ پلیز دیجیے۔ ہم تو آپ کی شادی میں شرکت نہیں کر سکے تھے لہٰذا ہمارے لیے تو آپ کی شادی جیسے اب ہوگی۔ آج ہی دلہن بنیں گی۔ پلیز جمیلہ آنٹی ان سے سفارش کیجیے ناں۔''

اس کی باہر سے آئی کزن مسلسل اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھیں کہ شادی کے روز وہ اپنا عروسی جوڑا پہنے پوری دلہن بنے۔

''بچے مان لو ناں۔ ان کی بات۔ ویسے بھی تم نے اس جوڑے کو دوبارہ چھوا بھی نہیں ہے زیورات بھی جوں کے توں پڑے ہیں۔ اچھا موقع ہے اب۔ یہی تو پہننے اوڑھنے کے دن ہوتے ہیں۔''

ایک بوڑھی خاتون بھی سر ہو گئیں۔ کچھ ادھر ادھر سے بھی اصرار بڑھنے لگا تو تنگ آ کر اس کو ماننے ہی بن پڑی۔ جھمکے، ہار، چوڑیاں، انگوٹھیاں تو مارے باندھے لیں مگر جھومر لگانے کے لیے اس کی کزنز کو اچھی خاصی بحث کرنا پڑی۔

''اتنا چھوٹا سا تو ہے۔ محسوس بھی نہیں ہوتا۔ اتنا سا تو غیر شادی شدہ لڑکیاں بھی آج کل پہن ہی

لیتی ہیں۔''

گلابی کھلتے ہوئے رنگ کے سنہری کام والے عروسی جوڑے میں زیورات اور ہلکے ہلکے میک اپ کے لوازمات کے ہمراہ وہ اتنی جچ رہی تھی کہ جس جس نے دیکھا بے ساختہ توصیف وستائش کی۔

''اپنے اُن کے سامنے زیادہ مت جاؤ ورنہ وہ بھی خود کو نیا نویلا دولہا سمجھ کر ہوش کھو بیٹھیں گے۔''

اس کی ایک شادی شدہ کزن نے بڑی معنی خیز نظروں سے کسی کام سے ادھر آتے حماد کو دیکھتے ہوئے شرارت سے تمشین سے کہا تھا۔

وہ جھینپ سی گئی۔

''امی ادھر مردانے میں کھانا شروع کرا دیا ہے۔ ویٹرز کو ادھر زنانے میں لگانے کا کہہ دوں؟'' وہ سنی ان سنی کرتا تائی جمیلہ سے مخاطب ہوا تھا۔ پھر جتنی دیر ان کے ساتھ کھڑا بات کرتا رہا بھولے سے بھی نگاہ ادھر نہ کی۔ بات ختم کر کے اسی طرح اپنے محتاط سے سنجیدہ انداز میں باہر چلا گیا۔

تمشین کا دل بجھ سا گیا۔ پھر دوبارہ جتنی بار اس سے سامنا ہوا تمشین شعوری طور پر اس کی بھرپور نظروں کی منتظر ہی رہی۔ انتہائی سرسری انداز میں اگر اڑتی پڑتی نظر پڑی ہو تو الگ بات ہے، وگرنہ بطورِ خاص اس کی دید یا اس سے گفتگو کی ایک بار بھی کوشش نہ کی تھی۔

اس کی روح جھلس کر رہ گئی۔ بے اختیار نظروں میں اسی ماہ جبیں کے نقوش لہرا گئے۔ اس کے اندر دور تک تھکن اور اندھیرا اترتا چلا گیا۔ جانے کیوں اسے بھرے پرے ماحول سے بے زاری اور وحشت کا احساس ہونے لگا۔ اک شکستگی اور پژمردگی سی اعصاب پر برف بن کر جمنے لگی تھی۔ محض اس ایک نظر کے لیے؟

یہ سوچتے ہوئے اسے خود بھی کوفت وکلفت ہو رہی تھی۔

دونوں دلہنوں کی مشترکہ رخصتی کے بعد گھر کا آنگن اتنے مہمانوں کی موجودگی میں بھی سونا سونا لگنے لگا تھا۔ پوری حویلی کے مشترکہ بڑے سے لان میں آدمی شامیانے، برتن اور کرسیاں سمیٹ رہے تھے۔ حماد ان کو احکام دے رہا تھا۔ رو رو کر تائی کا سر دکھنے لگا تھا۔

''اپنی تائی کو ایک کپ چائے کے ساتھ کوئی ٹیبلٹ لا دو تمشی۔'' عالیہ بیگم نے ہمدردانہ انداز میں اپنی سمدھن کو دیکھتے ہوئے بیٹی سے کہا۔

''اپنی امی اور خالہ کے لیے بھی بنا لانا تمشی بچے۔ بلکہ یوں کرو بڑے پتیلے میں بنا لو۔ مہمانوں میں

سے بھی اکثر کو طلب ہو گی اور ہاں بچے وہ باہر حماد بیٹے کو بھی ایک کپ دے آنا۔ صبح سے پھرکی کی طرح گھوم رہا ہے۔ دو منٹ کو ڈھنگ سے نہیں بیٹھا۔"

تائی اپنے دکھتے سر کو دباتے عالیہ بیگم کی سمت دیکھتے ہوئے بتا رہی تھیں۔

"اللہ زندگی دے میرا تو رواں رواں اس کے لیے دعا گو ہے۔ میرے سر سے پہاڑ سا بوجھ ہلکا کر دیا۔ دونوں لڑکیوں کی سوئی سے لے کر صوفہ سیٹ تک سب کچھ خود ہی کیا کرایا۔ اتنی شان سے رخصت کیا ورنہ مجھ میں تو تمہارے بھائی جان (تایا مرحوم) کے بعد کچھ کرنے کرانے کی سکت ہی باقی نہیں رہی ہے۔"

تائی وغیرہ کو نپٹا کر وہ کپ ہاتھ میں لیے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی لان میں چلی آئی۔

شامیانے اور کرسیاں میز ہٹ جانے سے لان کی وسعت اور اس میں چھایا سناٹا دوبارہ لوٹ آیا تھا۔

وہ ایک کونے میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے پاؤں پسارے تساہل سے بیٹھا ہوا نظر آ گیا تھا۔ وہ اسی سمت بڑھی تھی۔

"یہ چائے۔" وہ بازو آنکھوں پر رکھے تھکن زدہ کیفیت میں بیٹھا تھا۔ جب کافی دیر تک اس کی موجودگی کا نوٹس نہیں لیا گیا تو مجبوراً اسے چونکانا پڑا۔

حماد نے تیزی سے بازو پرے ہٹا کر اندازِ نشست تبدیل کی تھی۔ بلا ارادہ نظر کا اس کی سمت اٹھنا تو فطری امر تھا مگر جس طرح وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ یہ چیز تمشین کے لیے خاصی خوشگوار سی حیرت کا موجب تھی۔

اس بھرپور نگاہ نے (کہ جس کا لاشعوری طور پر اسے سارا دن انتظار رہا تھا) ایک پل میں اسے اوپر سے نیچے تک جانچ لیا تھا۔ نہ جانے کیوں تمشین کی نظر جھک سی گئی۔

دوسرے ہی پل وہ اپنی بے ساختگی پر قابو پا چکا تھا اور سر جھٹک کر کپ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"یہ؟" اس کا انداز سوالیہ تھا۔

"تائی جان نے بھجوائی ہے آپ کے لیے؟" غالباً تنہائی میں ان کے درمیان یہ پہلی گفتگو تھی۔ وہ بہت کم ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے تھے۔ شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد تو ان کے درمیان کوئی ایسا لمحہ نہیں آیا تھا کہ زیادہ دیر تک تنہائی میں ایک دوسرے کے پاس رہ کر گفتگو کا سہارا لینا پڑا ہو۔

اس نے چپ چاپ کپ تھام لیا۔

تمشین کا کام ختم ہو گیا تھا۔ سو وہ جانے کے لیے مڑی۔ مڑتے مڑتے جانے یوں اس کے قدموں میں اک لرزش سی آئی تھی۔ ایک لمحے کو وہ جیسے چلنے سے انکاری ہو گئے تھے۔

شاید کچھ کہے یا روکے کہ یہ روپ خالصتاً چھ سات ماہ پہلے بھی اسی کے لیے سجایا تھا اور آج بھی۔

مگر دوسری طرف برفیلی جامد چپ تھی۔ وہ کچھ مایوس اور افسردہ سی ہو کر واپس پلٹی تھی۔

اونہہ۔ اعصاب پر تو وہ جادوگرنی سوار ہو گی۔ وہ جانے کیوں جھنجھلا رہی تھی۔

وقت کتنی تیزی سے بدل دیتا ہے یا بدل کے رکھ دیتا ہے حال کو بھی اور صورتِ حالات کو بھی۔ کتنی جلدی منتہائے نظر اور مدعائے دل بدل جاتا ہے۔

یا شاید نظامِ فطرت ہی یہی ہے۔ ہونی کو انہونی اور انہونی کو ہونی میں بدل دینا۔

نیلو کے ہاتھ میں منیب کے نام کی انگوٹھی سج گئی تھی۔ جذبوں کو تو قرار آیا تھا یا نہیں بہر حال زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ اک ٹھکانا مل گیا تھا سفینۂ حیات کو۔

ادھر تمشین کے سارے قرار ایک ایک کر کے لٹتے جا رہے تھے۔ رات کے کسی پہر یا فرصت کے اوقات میں جب بھی حماد اس تصویر کی "زیارت" میں مگن ہوتا اس کی جان جل جاتی تھی۔

جانے یہ جذبۂ رقابت کہاں سے آن ٹپکا تھا دل میں۔ ادھر تائی جمیلہ اس کے بظاہر بے نیازانہ اور بے اعتبار رنگ ڈھنگ دیکھ کر دن بہ دن تنگ ہوتی جا رہی تھیں۔ جانے ان میں ساس والا جذبہ کیوں اتنا توانا ہوتا جا رہا تھا۔

حسبِ معمول اس دفعہ وہ ویک اینڈ پر آیا تو قدرے سست سا تھا۔

"طبیعت ٹھیک ہے بچے تمہاری!" تائی نے تشویش سے پوچھا تھا۔ پھر خود ہی ماتھا اور ہاتھ چھو کر دیکھنے لگیں۔

"ہائیں تمہیں تو اچھی خاصی حرارت ہو رہی ہے۔"

"نہیں، وہ پچھلے چند دنوں سے بخار تھا۔ اب تو ٹھیک ہوں کافی۔" اس نے تھکے تھکے انداز میں ان کی تشفی کرائی۔

"خاک ٹھیک ہو۔ شکل سے ہی اتنے بیمار لگ رہے ہو۔ اتنے دن سے وہاں بے آسرا بے سہارا پڑے رہے۔ فون کر دیتے ادھر۔ میں آ جاتی یا بچیوں میں سے کسی کو بھجوا دیتی۔" تائی خفا ہو رہی تھیں۔

''جاؤ جا کر بستر میں لیٹو۔ اے ریما تمہاری بھابی کہاں ہیں۔ حماد کے لیے سوپ بنانا ہے۔''

''وہ نیلو آپی کے ہاں ہوں گی۔''

تائی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''اس لڑکی کا تو اپنے گھر جی ہی نہیں لگتا۔ جاؤ بلا کے لاؤ اسے۔ کچھ ہوش نہیں ہوتا محترمہ کو کہ گھر اور شوہر کس حال میں ہیں۔'' وہ بڑبڑا رہی تھیں۔

پھر تھوڑی دیر بعد وہ آتی نظر آئی۔

''تمشین! تم اب کوئی بچی نہیں ہو۔ ایک شادی شدہ عورت ہو۔ ذمہ داری ہے تم پر۔ کیا ضروری ہے کہ میں منہ سے کہوں تب ہی اثر ہوگا۔''

وہ حیران پریشان تائی کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

''کیا ہو گیا آخر؟'' وہ الجھی۔

''تمہیں خبر بھی تھی آج حماد نے آنا ہے پھر بھی گھر سے نکل کھڑی ہوئیں۔ خبر ہے کتنی طبیعت خراب ہے اس کی۔ پورا ہفتہ وہاں اکیلا پڑا رلتا رہا ہے۔''

تائی کھری کھری سنا رہی تھیں۔

''کوئی منہ سے کچھ نہیں بولتا تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ......''

''بھابی! میں بناؤں کہ آپ بنالیں گی سوپ۔'' ریما نے دانستہ مداخلت کر کے معاملے کو نپٹایا تھا۔

تمشین چپ چاپ کچن کی سمت آ گئی۔

''لیجیے۔'' کافی دیر کھڑی رہنے کے باوجود جب وہ متوجہ نہیں ہوا تھا تو مجبوراً اسے کہنا ہی پڑا۔

حماد نے آنکھوں پر سے بازو اٹھا کر چونک کر اسے دیکھا' اس کی بخار سے لال براؤن آنکھوں میں استفہام نمایاں تھا۔

''یہ تائی نے کہا تھا۔'' وہ قدرے ہچکچا کر گویا ہوئی۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مہربانی۔''

اپنے ہاتھ میں پکڑی تصویر تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے اس نے بوجھل گرم سانسیں چھوڑتے ہوئے بمشکل تمام کہا تھا۔

نجانے رقابت کا گرم گرم سلگتا ہوا احساس کہاں سے در آیا تھا اس کے اندر اسے لگا کہ جیسے وہ چہار راف سے شعلوں میں گھر گئی ہو۔ ایک آواز کے ساتھ سوپ کا پیالہ ٹیبل پر پٹختے ہوئے وہ اس کی سمت ی تھی۔

''مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے آپ کے چونچلے اٹھانے کا۔ آپ کی امی محترمہ کے شور مچانے پر آئی تھی نہ مجھے کیا میری جانے بلا۔'' اس نے گویا کسی قسم کا ادھار نہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

حماد نے نظریں اٹھا کر پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ وہ بھی اس سمت متوجہ تھی اس کی لال سرخ براؤن نکھوں سے نظریں ملتے ہی جانے کیسا کوندا سا لپکا۔ تمشین کو بس یوں لگا جیسے ابھی دل پسلیاں توڑ کر جسم ے باہر نکل آئے گا۔

''یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں اور آپ کے ایک ایک انداز سے ٹپکتی بےزاری بھی میری نگاہ ے پوشیدہ نہیں ہے۔'' اس پر بدستور نظریں جمائے اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا تھا۔

''آپ کو جتانے کی ضرورت نہیں تھی۔''

وہ ایک لمحے کو عرق عرق ہو گئی۔ پھر سائیڈ پر رکھی تصویر دیکھ کر اس کے اندر آگ سی بھرنے لگی۔

وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''نہ صرف آپ کو بلکہ اس گھر کے کسی فرد کو بھی یہ بات جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اپنی قیقت اپنے مقام کا بہت اچھی طرح پتا ہے۔ کس کو میری کتنی پروا ہے۔ کون میرے لیے کتنا حساس ہے یرے علم میں ہے۔ اس کاغذی بندھن کی آپ کی نظر میں جو وقعت ہے' یہ بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے یکن یہ بات میں آپ کو بہرحال باور کرا دینا چاہتا ہوں کہ اس میں میری طرف سے کوئی دباؤ نہیں تھا۔ یں نے بہت احتجاج کیا تھا امی جان سے۔ مجھے اچھی طرح علم ہے کہ میں کتنے پانی میں ہوں مگر امی جان کے شدید اصرار پر مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔''

تمشین کے تلوؤں سے لگی سر میں پھوٹی۔

''ہاں آپ کیوں راضی ہونے لگے۔ آپ کو کیوں میں پسند آنے لگی۔'' وہ پھٹ پڑی۔ ''آپ کے دل پر تو یہ ساحرہ راج کر رہی ہے۔ اس کے آگے کیوں مجھے گھاس ڈالنے لگے۔'' اس نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے تصویر اس کی طرف اچھالتے ہوئے چیخ کر کہا تھا۔

اسی لمحے نیلو اندر داخل ہوئی تھی۔

وہ حیرانی سے کبھی حماد کا شدت ضبط سے سرخ پڑتا چہرا دیکھ رہی تھی اور کبھی غصے سے ابلتی تمشین کی

طرف جو تصویر کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

حماد نے لڑکھڑاتے قدموں سے بیڈ پر پھینکی تصویر کو سیدھا کیا۔ ایک جلتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور تیز تیز قدموں سے چلتا دروازے کی سمت اس طرح بڑھا کہ نیلو کو بوکھلا کر ایک سمت ہو جانا پڑا۔ وہ دروازے پر جا کر رک گیا تھا۔

''یہ۔ عورت وہ ہے جس کے پیٹ سے جنم لینے کی بدولت بچپن سے اب تک میں تم سب کی نظروں میں معتوب رہا ہوں۔''

وہ کہہ کر رکا نہیں تھا آندھی طوفان کی طرح نکل گیا تھا۔ ایک لمحے کو تو تمثین کے جیسے اعصاب سن ہو کر رہ گئے۔ پھر یکلخت الٹے قدموں اس کے پیچھے بھاگی۔

''حماد۔ حماد پلیز' رکیے حماد۔''

''حماد بات سنیے میری۔''

اس اثنا میں گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور اس سے پہلے کہ وہ پورچ تک پہنچتی گاڑی گیٹ سے باہر نکل چکی تھی۔

''کیا ہوا؟'' تائی سٹپٹا کر اپنے کمرے سے نکلی تھیں۔ ''یہ حماد کہاں چلا گیا۔ اتنے بخار میں؟'' وہ حواس باختہ سی تمثین کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

وہ جواب دیے بنا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں نیلو سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔

تمثین نے بیڈ پر گر کر سسکیاں لینا شروع کر دیں۔

نیلو نے گم صم سے انداز میں تصویر سیدھی کی اور پھر ششدر سی رہ گئی۔

''ارے یہ تو واقعی گیتی آرا کی تصویر ہے۔ تایا جی کی ڈیتھ کے بعد جب ان کے کمرے کی صفائی ہوئی تھی تو ڈائری کے اندر سے نکلی تھی۔''

''نیلو۔ نیلو۔ پلیز ہیلپ می۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

نیلو نے دل مسوس کر اس کی طرف سمت دیکھا۔

''ہر کام تو الٹا کرنا ہوتا ہے اور وہ بھی اپنی ضد سے۔ کتنا کہا تھا چیلنج قبول کرنے کے چکر میں' زندگی برباد نہ کرو پھر کتنا سمجھایا تھا کہ اب حماقت کر بیٹھی ہو تو ڈھنگ سے نبھاؤ بھی مگر تم نے کسی کی نہیں سنی۔ نہ تائی کے اشارے کنائے' نہ عالیہ آنٹی کی تنبیہ اور نہ میری لمبی چوڑی بحث۔ اپنی سی کی۔ اب بھگتو۔''

نیلو صاف اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ جواب میں وہ دردانگیز سسکیاں بھرتی رہی۔ کچھ دیر گومگو کے عالم ڑے رہنے کے بعد بالآخر نیلو کا دل پسیج گیا۔ اس کے پاس آ کر اسے اٹھایا اور آنسو پونچھتے ہوئے لگی۔ ''منیب ابھی گھر پہ ہوگا۔ جاؤ اسے کہو تمہیں حماد بھائی کی رہائش گاہ پر چھوڑ آئے۔ تمہارے ے سے پہلے یقیناً پہنچ چکے ہوں گے۔ طبیعت بھی ان کی ٹھیک نہیں۔ اس وقت انہیں تمہاری سخت ضرور ۔ جاؤ اور پچھلی ساری معافیاں تلافیاں کر ڈالو لیکن سنو' کوئی نئی حماقت مت کر بیٹھنا۔''

وہ ناک منہ پونچھتی اٹھ بیٹھی تھی۔

''کیا یونہی جھاڑ جھنکاڑ حلیہ لے کر جاؤ گی؟ شکل اور لباس تبدیل کرو فٹافٹ۔'' نیلو ڈپٹ رہی تھی۔

گاڑی پرسکون سی کالونی میں جا ٹھہری تھی۔ مکانات کی تعمیر و آرائش بہت نفیس اور پرشکوہ تھی۔ منیب ب کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔ بیل بجانے پر ایک ملازم ٹائپ چھوکرا برآمد ہوا۔

''صاحب ہیں؟''

''ہاں جی اپنے کمرے میں لیٹے ہیں۔ کہا ہے کوئی بھی آئے ٹال دینا۔''

''بھئی میں ان کی رشتہ دار ہوں۔ گھر والی۔'' اسے یونہی گیٹ پر جمے دیکھ کر تمثین نے جھنجھلا کر ت کی تھی۔ لڑکے نے ٹھٹک کر اسے دیکھا اور قدرے ہچکچاہٹ کے بعد راستہ دے دیا۔

وہ بیڈ کے بیچوں بیچ آڑا ترچھا بازو پہ ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔ جانے کیا ہوا اس کے کمرے میں قدم رکھتے ین کے ہاتھ پاؤں اور دل کی دھڑکنیں لرزاہٹ کا شکار ہونے لگیں۔ وہ بڑی جرأت سے آگے اور اعلا درجے کی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے پرحرارت بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔

س نے جیسے کرنٹ کھا کر آنکھوں سے بازو اٹھایا تھا پھر اس پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں تحیر سے ئیں۔

''اوہ آپ یہاں۔ کیسے؟'' وہ بہ سرعت اٹھ بیٹھا تھا۔

''مجھے بالآخر یہیں آنا تھا۔'' اس نے سر جھکا کر لرزتی آواز میں کہا۔

''کیا آپ کو معلوم ہے' آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

کتنی ہی دیر بحر حیرت میں غوطہ زن ہونے کے بعد وہ بھاری آواز میں بولا تھا۔

''مجھے اچھی طرح معلوم ہے اور یہ بھی کہ یہ بات ایک سال پہلے مجھے کہنی چاہیے تھی۔'' گزرتے کی پشیمانیاں اس کی آنکھوں میں شبنم بن کر جھلکنے لگیں۔

"مجھے علم ہے آپ مجھ سے بہت خفا ہوں گے اور یہ آپ کا حق بھی بنتا ہے مگر کیا تلافی کا موقع بھی نہیں دیں گے؟" اس کا بازو تھام کر اس پر سر ٹکا کے بالآخر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا خود پر کچھ اختیار ہی نہ رہا تھا۔

خود حماد کو بھی پتا نہیں چلا کب اس کے بازو پھیلے اور کس طرح اس کے نازک وجود کے گرد ایک مضبوط قلعے کی طرح جم گئے۔

تمشین کی سسکیاں تیز تر ہو گئیں۔ اس کے وجود کا سہارا ملتے ہی ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔

"پلیز یار! تمہارا یہ رونا میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔"

حماد نے پرجوش طریقے سے اسے خود میں سمیٹ لیا تھا۔

"ویسے ایک بات کی میں بھی معذرت چاہتا ہوں۔ میں نے غلط کہا تھا کہ شادی میں میری مرضی شامل نہ تھی۔ سچ پوچھو تو امی کے منہ سے تمہارا نام سن کے میرے دل کی ساری دھڑکنیں تمہارا شور مچانے لگی تھیں۔ تمہارا وجود میری زندگی میں ایک بہت خوب صورت اور خوشگوار اضافے کی حیثیت رکھتا تھا مگر شب اولین کے تمہارے بے زار کن اور بے اعتنا انداز پر میری خودی اور عزتِ نفس نے مجھ پر پہرے لگا دیے تھے۔"

"آپ ناراض تو نہیں ہیں ناں اب۔" وہ بالآخر رونے کا پروگرام ترک کرنے کے بعد سادگی سے پوچھنے لگی۔

جواب میں وہ ہنس پڑا اور بڑی محبت سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ اسی دم تمشین کو اپنی پوزیشن کا احساس ہوا۔ اس نے اس کی اتنی قربت کی تپش کی تاب نہ لاتے ہوئے اس کے بازوؤں کا حصار توڑتے ہوئے پرے ہونا چاہا مگر دوسرے ہی لمحے وہ پوری طرح زنجیر پا ہو چکی تھی۔ بھلا مرد ایک سال کے رکے ہوئے جائز شرعی جذبوں کے پرجوش اور والہانہ اظہار کا موقع ہاتھ سے جانے دیتا ہے۔

☆☆☆

دل ٹھہر جانے کے موسم

بوگن ویلیا کی بیل سے ڈھکی ہوئی ٹیرس کی ریلنگ کے قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے بیٹھتے وہ ایک دم چونک کر سیدھا ہو گیا تھا۔ نظریں سامنے "نشاط منزل" کے ...حصے پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ دونوں گھروں کے درمیان محض پانچ فٹی تنگ سی گلی ...تھی۔ دونوں اطراف کے ٹیرس عمارت کی حدود سے کچھ اس طرح لہک کر آگے کو بڑھ آئے تھے ...سر جوڑ کر سرگوشیاں کرنے کی شدید حسرت بے چین کیے دے رہی ہو۔ نشاط منزل کے ٹیرس کے ...نیچے وسیع و عریض صحن تھا جس کے ایک کونے پر چھوٹا سا سرسبز قطعہ بنا ہوا تھا۔ رنگا رنگ موسمی ...یوں سے مزین' دیوار کے ساتھ موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ برآمدے کے نزدیک دو تین کین کی ...سیاں بکھری پڑی تھیں اور برآمدے کی دیوار کے ساتھ لمبا چوڑا بوسیدہ سا تخت بچھا تھا۔

حسبِ معمول ٹیرس اور صحن "بشری آواز و انداز" اور حرکات و سکنات کے رنگوں سے کھلا کھلا اور ...ن تھا۔ ٹیرس کی سفید آہنی ریلنگ سے ٹیک لگائے سولہ سترہ سال کی شولڈر کٹ بالوں والی لڑکی کتاب ...سر دیے بیٹھی تھی جب کہ نیچے صحن میں ایک طوفان بپا تھا۔

"امی! اگر آج شام قبل از افطاری آپ کو اپنے پیارے بیٹے ٹیپو کی جھلک دیکھنے کو نہ ملے تو گھبرائیے گا مت۔ بس جان لیجیے گا کہ حضرت اپنے انجام کو پہنچ گئے۔"

اس نے دانت پیستے ہوئے تاک کر تخت کی سمت ہیل والی جوتی کا فائر کیا تھا۔ جواب میں اک دل آویز کراہ بلند ہوئی۔

"اماں دیکھ۔ ہاں دیکھ۔" اس نے سر کو قاصد بنا کے اندرونی کھلے دروازے سے ماں کو اپنا نالہ وشیون پہنچانے کی سعی کی۔

"کیا کر دیا ٹیپو بھائی نے آپی؟" ٹیرس پر بیٹھی لڑکی نے ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر نیچے کا میدان حشر ملاحظہ کرتے ہوئے کچھ جھنجلا کر پوچھا تھا۔ اس کی اسٹڈی ڈسٹرب ہو رہی تھی۔

"اس نے تو جو کرنا تھا کر دیا۔ اب یہ دیکھو کہ میں اس کا کیا کرتی ہوں۔" آپی نے جوتی کا دوسرا فائر داغتے ہوئے بڑے باعزم لہجے میں جواب دیا۔ وہ ہنس پڑی۔

"کیا؟ اچار، آملیٹ یا چٹنی۔" اسے بھی لطف آنے لگا تھا۔ ٹیپو نے بھنا کر اوپر دیکھا۔

"تمہارے کباب بنا کے، تل کے تو میں افطاری کے بعد کھاؤں گا۔ فی الحال ذرا دشمن کو منہ کی کھلا دوں۔ جسے میری ایک سال کی ایج سنیارٹی کا بھی لحاظ نہیں۔"

آپی بھاگ کر کھلے دروازے سے اندر داخل ہو کر پلک جھپکتے میں اپنی پنسل ہیل کا جوڑا لے آئی تھی۔ اس آتشی ہتھیار کا وار "ڈھاڈا" خطرناک تھا اور سہنے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا بچاؤ کے لیے اس نے اندر سے برآمد ہوتے شامت اعمال کے مارے دس بارہ سالہ لڑکے کو ڈھال کی صورت میں آگے کر دیا کہ کچھ اس کا لحاظ کر جائے گی مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ اس سے پہلے ہی دنادن فائر کھول چکی تھی۔ چھوٹے میاں تیورا کر گرے۔ تحیر کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا۔ ایک زنانے دار چیخ ماری اور پورے سر تال اور والیوم کے ساتھ شروع ہو گئے۔ اسی دم اندر سے امی برآمد ہوئیں۔

"میرے اللہ! کیا ہو رہا ہے یہاں۔" انہوں نے ڈپٹ کر دونوں سے پوچھا جن کا جوش حریفانہ چھوٹے میاں کے منہ کا غار کھلنے سے کافی حد تک سرد پڑ چکا تھا۔

"مجھے توپ دم کرنے کا پروگرام بنا رہی تھی یہ؟" ٹیپو نے جھٹ ماں کے پیچھے پناہ لیتے ہوئے شکایت داغی۔

"آپ کو پتا ہے اس خبیث نے کیا کیا ہے میری قیمتی نئی نکور نائلون کی جرابوں کے ساتھ؟" آپی نے خونخوار نظروں سے اسے گھورتے ہوئے طیش کے عالم میں مٹھیاں بھینچ کر ماں سے مخاطب ہو کر کہا

"انہیں اپنے فل بوٹس کے ساتھ پہن کر گیا تھا کھیلنے۔"

"تو واپس بھی تو کر دی ہیں ناں۔" ماں کے پیچھے چھپے چھپے اس نے سر نکال کر صفائی پیش کی تھی۔ کے تو سر سے لگی اور تلووں پر بجھی۔

"واپس اس حال میں کی ہیں کہ اب وہ باآسانی کلوروفام کی جگہ استعمال کی جا سکتی ہیں بلکہ ایک اور دو کاکروچ تو ابھی ابھی انہیں سونگھ کر عالم مدہوشی کو پہنچ چکے ہیں۔"

شاہ بخت کو اپنا بے ساختہ قہقہہ ضبط کرنا دشوار تر ہوتا جا رہا تھا اسی لمحے نیچے سے ربیعہ کی پکار سنائی۔ اسے یہ ڈراما عین کلائمکس پر چھوڑ کر نیچے جانا پڑا۔ دودھ والا گھنٹی پہ گھنٹی بجا رہا تھا۔

"مائیگریشن کیس کی ساری کارروائی پوری ہو چکی ہے۔ تم کل سے کالج جوائن کر لو اب۔ کالج بس بھی دے دی ہے۔" افطاری کے دوران اس نے بتایا۔ ربیعہ کے چہرے پر خوشی دوڑ گئی۔

"تھینکس گاڈ۔ میں تو ان پچیس دنوں میں گھر میں اکیلی رہ رہ کر تنگ آ گئی تھی۔"

"چلو اس طرح میری فکر بھی کچھ کم ہو گی۔ آفس میں بھی سارا وقت تمہاری طرف دھیان لگا رہتا ہے۔" پکوڑوں سے انصاف کرتے ہوئے شاہ بخت نے قدرے طمانیت سے کہا۔ "نئی جگہ نئے لوگ، حالات میں ایڈجسٹ کرنا کوہ گراں زیر کرنے سے کیا کم ہو گا۔"

"ہاں! وگرنہ اس قسم کی سچویشن کا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔" ربیعہ کے چہرے پر حزن وملال کے سائے لہرا گئے۔

"ٹیک اٹ ایزی یار!" شاہ بخت اس کا ہاتھ تھپتھپا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم یہ پھیلاوا سمیٹ لو۔ پھر پڑھ کر واک کے لیے نکلیں گے۔" اس نے بیرونی دروازے کا رخ کیا۔

"ارے یاد آیا۔ بھائی جان! پاؤ بھر دہی لیتے آئیے گا واپسی میں۔" ربیعہ نے یاد آ جانے پر پیچھے سے ہانک لگائی تھی۔ وہ سر ہلا کر دروازہ لاک کرنے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔

"امی جانی! "نیک بنو نیکی پھیلاؤ" کی یہ ریہرسل آخر کب تک جاری رہے گی؟" چلغوزے نکلتے ہوئے ٹیپو نے بڑی سنجیدگی سے استفسار کیا تھا۔ "کم از کم میری ذاتیات کا حال تو بہت پتلا ہو چکا ہے۔ سٹنگ روم کا قالین ترستا ہے میرے زمانے بھر کی گرد سے آلودہ جوگرز کے لمس کو۔ میرے بڑے الگ وارڈروب میں حبس دم کا شکار ہو چلے ہیں۔ کتابیں ریک میں لگی لگی اکڑ گئی ہیں۔ موزے

اور ٹائیاں صوفے کی پشت سے جدائی کے عذاب جھیل رہی ہیں اور میں...... میں نشست و برخاست کے شائستہ اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی تگ و دو میں آدھا رہ گیا ہوں۔"

"اور میرے حسین بال تیل کے جوہڑ میں ڈبکیاں لگا کے اوپر سے دوپٹے کا غلاف اوڑھ اوڑھ کر تباہ حال ہو چلے ہیں۔ مارے شرم کے بالکل کھوپڑی سے چپک گئے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے اپنے سر پہ صفا چٹ چٹیل، شفاف میدان ہونے کا گمان ہوتا ہے۔" ٹیپو نے اپنا دردنامہ ختم کیا تو نزل نے اپنا کھول لیا۔

"مجھے بھی اپنی بکس اور بیگ ڈائننگ ٹیبل کے بجائے الماری میں رکھنے پڑتے ہیں۔" چھوٹے میاں عمران نے بھی اپنے دردنامے سے ایک اقتباس پیش کیا۔

"اور میں اوپر نیچے آرائش و جمال اور صفائیاں کر کے شفاف چم چم کرتے فرش میں اپنی شکل دیکھ دیکھ کر اوب چکی ہوں۔" شفتل کیوں کسی سے پیچھے رہتی۔ بیگم آفریدی اپنا سر پیٹ کر رہ گئیں۔

"اللہ رے۔ یہ میری اولاد ہے۔ جی بھر کے روشن کرے گی اماں باوا کا نام۔ صغریٰ بھابی کے سامنے خاک ڈلوا کے رہے گی میرے چونڈے میں۔"

"آپ نے بھی انہیں ہوّا بنا دیا ہے۔ گویا بھابی صغریٰ نہیں بلکہ قیامت صغریٰ آ رہی ہو۔"

"جیسے وہ تائی نہیں قصائی ہوں۔ ہماری تو تائی ذبح کرنے کی مشتاق۔"

شفتل نے ٹیپو کی تائید کی۔ باہمی اختلافات اور جنگ و جدل اپنی جگہ مگر دو طرفہ مفادات پر ضرب پڑنے کی صورت میں دونوں ایک ہو جاتے تھے۔ امی نے دونوں کو کچا چبا جانے والی نظروں سے گھورا۔ دونوں نے معصومیت سے سر جھکا لیے۔

"اف کب سدھرو گے تم دونوں۔" انہوں نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بے بسی سے انہیں دیکھا۔ "لے کے چھوٹوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ بھلا سوچو تو صغریٰ بھابی کیا رائے قائم کریں گی میرے متعلق کہ اولاد پیدا کی ہے یا بے نتھے بیل؟ تمہیں کیا معلوم کس قدر وضع قطع کی خاتون ہیں وہ۔ انتہا سے زیادہ صفائی پسند۔ کم گو۔ ہمہ وقت کام میں مگن۔ ادب آداب اور سلیقے طریقے والی۔ کچھ تو میرا بھرم رکھ لینا ان کے سامنے۔" امی نے خصوصیاتِ تائی صغریٰ کا بار بار کھینچا گیا نقشہ ایک بار پھر دوہرایا۔

"اسی لیے تو ہم اپنی فطرت سے ہٹ کر نیک پروین اور دین محمد بنے ہوئے ہیں امی!" شفتل منمنائی۔

"ان کی کوئی اولاد بھی تو ہو گی امی!" ٹیپو نے ڈرائی فروٹ پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے دریافت فرمایا۔

شفتل نے کڑی نگاہوں سے گھورتے ہوئے ملامت انگیز لہجے میں کہا۔ "کچھ حیا کر لو۔ کھوجے کہیں کے۔ سرِعام ٹیرس پہ چڑھ کے کھا رہے ہو۔"

آج امی کی آنکھ سحری ختم ہونے سے پانچ منٹ قبل کھلی تھی۔ افراتفری اور جلدی جلدی میں جس کے جو ہاتھ لگا کھا کر رسم پوری کی۔ نزل اور شفتل تو امی کی ایک دو آوازوں پر لبیک کہتی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں مگر ٹیپو کو دس منٹ کی محنت کے بغیر اٹھانا ناممکن تھا لہٰذا وہ ٹھاٹ سے ان پر الزام دھر کے کھانے پینے کی تمام حسرتیں پوری کر رہا تھا۔

"تین بچے ہیں اس کے۔ ماشاءاللہ جوان جہان۔"

"اچھا کیا تناسب ہے ان کا؟" ٹیپو کی رگِ معروضی پھڑکی۔ "میرا مطلب ہے کتنے لڑک سنگھ اور کتنی لڑھک سنگھ ہیں؟" لڑکے اور لڑکی کے لیے یہ مخصوص اصلاح ان کی ذاتی تخلیق کردہ تھی۔

"اف گدھے! ڈھنگ سے بولا کرو۔ بھلا صغریٰ بھابی یہ سن لیں تو۔" امی نے خفگی سے ٹوکا۔

"امی گدھے ڈھنگ سے کب بولتے ہیں۔ ڈھینچوں ڈھینچوں کر کے بولتے ہیں۔" شفتل نے شریر نظروں سے بھائی کو دیکھا۔

"ولیں جی۔ ہم نے تائی محترمہ کو لبھانے کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔" کچھ کھسیا کر جھنجلا کر وہ بولا تھا۔

"سب سے چھوٹی عائشہ ہے۔ اپنی نزل کی عمر کی ہو گی۔" امی نے تفصیلات کی پٹاری کھولی۔

"اچھا" ٹیپو کے لہجے اور چہرے پر اشتیاق امڈ آیا۔ "ماشاءاللہ!" امی کے گھورنے پر وہ جلدی سے بولا۔

"اس سے بڑا وقاص ہے۔ یہی کوئی تمہارا ہم عمر ہی ہو گا۔"

"واہ!" ٹیپو نے مسرت سے کہا۔ "خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

"اور اس سے بڑا وقار ہے۔ وہ تو تم سے کافی بڑا ہے۔" امی تفصیلات کی زنبیل بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "اب اٹھو اور پچھلی گلی میں افطاری دے آؤ۔ شفتل تم بھی آ کر پلیٹوں میں لگا دو سامان۔" امی نے کچن کے کھلے عقبی دروازے کا رخ کرتے ہوئے دونوں کو ان کی ڈیوٹی بتائی۔

"وقار بھائی کافی بڑا۔ دوسرے معنوں میں تمہارا بوجھ تو ہمارے سینے سے سرکا۔"

ٹیپو نے پرخیال انداز میں معنی خیز نظروں سے شفتل کو تاڑتے ہوئے کہا تھا اور ساتھ ہی ایک دم

لڑھک کر سیڑھیوں کے پاس کھسک گیا تھا ورنہ شغفل کا پوری قوت سے داغا گیا تربوز کا اسکڈ میزائل اس کے سر پر آ کر پھوٹتا۔

"جی کون؟" شاہ بخت باتھ روم میں غسل کر رہا تھا۔ ڈور بیل مسلسل ڈھٹائی سے چیخے جا رہی تھی۔ بالآخر کوئی چارۂ کار نہ پا کر ربیعہ خود ہی گیٹ تک آئی تھی۔ بند گیٹ کے دوسری سمت براؤن چمک دار گھنے بالوں سے سجا خوشنما سر جھلک رہا تھا۔ تھوڑی سی فراخ پیشانی بھی نظر آ رہی تھی۔ گیٹ کے نچلے خلا سے چمکتے دمکتے پشاوری چپل نے آنے والے کے مرد ہونے کی واضح نشاندہی کی تھی۔ پھر آواز نے اس کی صدفی صد تصدیق کر دی۔

"جی یہ افطاری لے لیجیے۔ نشاط منزل سے۔" وہ مترنم رسیلی آواز کی حلاوت اپنے اندر جذب کرتے ہوئے کھنکھار کر بولا تھا۔

ربیعہ نے تذبذب کے عالم میں گیٹ کے اوپر سے جھلکتے بالوں کے ڈھیر کو دیکھا۔ گیٹ کے اوپر لگی گرل اتنی اونچی تھی کہ وہ ایڑیاں اٹھا کر بھی باہر سے آئی کوئی چیز نہیں پکڑ سکتی تھی۔

"ایک منٹ ویٹ کیجیے گا۔" بالآخر کسی نتیجے پر پہنچ کر وہ اندر لپکی۔ چابی سے لاک کھولا۔

"آواز ایسی سریلی ہے تو آواز والی کیسی ہو گی؟" ٹیپو کی متجسس نگاہیں اوپر اٹھیں اور پھر جیسے واپس پلٹنا بھول گئیں۔ وہ بت بنا دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ مجسم معصومیت، مجسم رعنائی، مجسم سادگی۔ کیا تھا اس پری وش، اس پیکر زیبا، اس دلنشین سراپے میں کہ اس کے دل کا ہر خلیہ لرزیدہ ہو گیا تھا۔ دھڑکنیں پسلی توڑ کر اس بت طناز کے قدموں میں لوٹنے کو مچل اٹھی تھیں۔

"جی لائیے۔" کافی دیر تک اس کی سمت سے کوئی پیش دستی نہ ہونے پر ربیعہ نے بالآخر خود ہی کہا تھا پھر قدرے حیرانی سے اس کے چہرے کی سمت نگاہ دوڑائی۔ اس کی تکا بازی صحیح ثابت ہوئی۔ اس کا براؤن بالوں والا سر دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا تھا کہ ضرور اس بندے کی آنکھیں بھی براؤن ہوں گی مگر ان آنکھوں میں تحریر خمار آلود وارفتہ سی کیفیت اس کے لیے خاصی بوکھلا دینے والی تھی۔ اس نے گھبرا کر اپنی لانبی پلکیں جھکا لیں۔ اس کی غزالی آنکھوں کی انی، اس کے مژگاں کی سناں سیدھی ٹیپو کے دل میں پیوست ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ پلیٹ خالی کر کے اپنی طرف سے اس میں کچھ بھرتی کر کے لے آئی۔

"ارے! یہ تکلف کیوں کیا آپ نے۔" نگاہ سے اس کی آرتی اتارتے ہوئے وہ شائستگی سے

بولا۔

"شکریہ آپ کا۔" وہ آہستگی سے کہہ کر اندر کو ہو گئی۔ ٹیپو نے دزدیدہ نگاہ گیٹ سے جھلکتے سراپے پر ڈالی پھر پانچ فٹی گلی عبور کر کے اپنے گھر کے عقبی دروازے سے اندر کی سمت بڑھ گیا۔ اس کی شربتی آنکھوں میں وہ دلفریب سراپا ہلکورے لے رہا تھا۔

نزاکت اور لطافت وہ کف پا تک کہ حیراں ہوں
سمن، گل، نسترن، نسریں، دُر، پرنیاں مخمل

وہ حیرانگی کے عالم میں خود سے مخاطب تھا۔ کس قدر سنجیدہ و سادہ انداز تھا اس کا۔ کتنا شستہ اور شائستہ لہجہ تھا۔ فی زمانہ ایسا مجسمہ حسن و تمکنت کہاں مل سکتا ہے۔ وہ جذب کے عالم میں سوچ رہا تھا۔ بھئی آہ! آج محترم ٹیپو آفریدی بھی بے دل ہو گئے۔

"اسے کہتے ہیں اونچی دکان پھیکا پکوان۔" ٹیپو نے شدید غیض و غضب کے عالم میں انکشاف کیا تھا۔

"اسے کہتے ہیں ڈھول کا پول کھلنا۔" شغفل نے بھی دانت پیس کر جوشِ غضب کا اظہار کیا۔

"اسے کہتے ہیں کھوکھلا چنا، باجے گھنا۔" نرمل نے بھی مصرعہ طرح لگایا۔

"اسے کہتے ہیں کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔" عمران میاں کیوں نہ حصہ لیتے میدانِ جملہ بازی میں۔

"افوہ...... اب بس بھی کرو۔" امی کھسیائی ہوئی سی بولیں۔ "اب مجھے کیا خبر تھی۔ ان پانچ سالوں میں صغریٰ آپا اتنی بدل جائیں گی۔" وہ خجل ہو کر بولیں۔

"اتنی؟" ٹیپو کا دل جل کر راکھ ہو گیا۔ "آپ صرف اتنی کی بات کرتی ہیں؟ مروا دیا ہمیں اٹھک بیٹھک کروا کر کے۔ دن رات تائی کی پرجلال، پرنور، پرہیبت صورت نگاہوں میں گھومتی رہتی۔ سانس لیتے، سوتے جاگتے آنے والے اندوہ ناک دنوں کا تصور ہولائے رکھتا۔ آپ نے ہمارا خون خشک کر کے رکھ دیا تھا۔" وہ ہانپنے لگا۔

"اچھا بس ناں!" امی شرمندہ سی جھنجھلا کر بولیں۔ "چلو اسی بہانے تم لوگوں کو ڈھنگ تو آیا زندگی کا۔"

"اور ان کے رنگ ڈھنگ ملاحظہ کیے ہیں آپ نے۔ وہ تائی صغریٰ کے "نونہالوں" کے؟" شغفل آگ بگولہ ہو رہی تھی۔

تائی معہ اپنے اہل وعیال قطعی اس سے مختلف تھیں۔امی کی ساری تصویر کشی پر پانی پھر گیا تھا۔آج صبح وہ تشریف لائی تھیں۔انہیں دیکھ کر سب کو جھٹکا سا لگا۔جدید طرز کا فینسی سا شلوار کرتا پہنے' ٹشو کا دوپٹا گلے میں ڈالے' رنگے ہوئے سرخ بوب کٹ بالوں کے ہمراہ ڈھیروں ڈھیر جیولری اور میک اپ سے مزین سراپا۔ان کے تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا تائی محترمہ کا یہ انداز۔ابھی پانچ چھ سال پہلے تایا جان کی وفات پر امی کوئٹہ گئی تھیں۔کچھ عرصے بعد وقار کو قطر میں جاب مل گئی تو ساری فیملی ادھر شفٹ ہوگئی۔اب طویل عرصے بعد وطن واپس آئے تھے۔پانچ سالوں میں پانچ صدیوں کا فرق سمٹ گیا تھا۔بیگم آفریدی تو دم بخود رہ گئی تھیں۔بچوں کو تو انہوں نے صرف قصے ہی سنائے تھے مگر خود وہ تو صغریٰ بھابی کو برسوں سے جانتی تھیں۔شادی کے ابتدائی سات سال ان کے ہمراہ گزارے تھے۔پھر آفریدی صاحب کی پوسٹنگ پنڈی ہوگئی۔یہیں گھر بنا لیا اور پھر جیسے کوئٹہ سے بالکل کٹ ہی گئے اور ان کی اولاد الگ اپنی اپنی جگہ ایک عجوبہ تھی۔

عاشی بی انتہا کی ہونق' ڈری سہمی چڑیا کی مانند بھاری سی چادر میں ملبوس ماں کے شانے کے پیچھے چھپی لگی بیٹھی تھی۔اس کی یتیم' وحشت زدہ صورت دیکھ کر دل میں بے اختیار ترس اور رحم کا جذبہ ابھرتا تھا۔دوسرے لمحے ماں بیٹی کو ایک ساتھ دیکھ کر بندہ مخمصے میں پڑ جاتا تھا کہ آیا جی بھر کر قہقہہ لگائے یا دھاڑیں مار اس تضاد کے امتزاج پر ماتم کرے۔

سب سے بڑا وقار۔انتہا سے زیادہ روڈ' ہتھے سے اکھڑ جانے والا' مخاطب کو کاٹ کھانے کو دوڑنے والا۔انتہا سے زیادہ سفاک اور بے رحم تاثرات سے سجے چہرے والا۔اس کی سلوٹ زدہ پیشانی پر مجال ہے جو بلوں کی ترتیب یا تعداد میں ان بارہ گھنٹوں میں کوئی فرق پڑا ہو بلکہ نرل نے تو ہر ہر گھنٹے میں پڑنے والے بلوں کے اضافے کا ریکارڈ بنا لیا تھا۔

درمیان کا وقاص البتہ کچھ معقول تھا لیکن نارمل بہرحال وہ بھی نہ تھا۔ذرا ذرا سی بات پر منہ پھاڑ کر بے تحاشا ہنستا۔ہنستے ہوئے اس کے منہ کا پورا غار کھل جاتا جہاں سے کبھی کبھی شدت شادمانی کے باعث تھوک کے فوارے پھوٹ پڑتے۔پھر اس کا لہجہ بہت پاٹ دار اور سماعت میں چبھنے والا تھا۔کچھ ایسا ہی لب ولہجہ خود تائی صغریٰ کا بھی تھا۔

ٹیپو تو ہکا بکا رہ گیا تھا۔''یار شفو! یہ اپنے رشتے دار ہی ہیں ناں۔'' وہ ہراساں ہو کر پوچھ رہا تھا۔

''میرا وجدان کہتا ہے میرے نہ سہی مگر تمہارے رشتے دار ضرور لگتے ہیں۔'' شفقل نے سنجیدگی سے مذاق کیا۔اندر سے وہ بھی بہت مایوس اور دل گرفتہ ہوئی تھی۔

''مجھے تو مینٹل ہاسپٹل سے بھاگی ہوئی کوئی فیملی لگتی ہے۔'' عمران نے خاصے سوچ بچار کے بعد اپنا زیہ پیش کیا۔جواب میں امی نے گھرکا۔

''اے لو۔ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔جاؤ جا کر اپنے بھائیوں کو ان کا لمرا دکھاؤ۔''

''ویسے اصولاً تو انہیں پاگل خانے کا رستہ دکھانا چاہیے۔کیوں؟'' شفقل نے پرخیال انداز میں ٹیپو سے کہا۔

''شفو! اب تم مجھ سے پٹ جاؤ گی۔'' امی ناراض ہونے لگیں۔''چلو جا کر نرل کے ساتھ ٹیبل لگواؤ' رٹیپو! تم بازار سے کوک کا ایک کریٹ لے آؤ۔'' انہوں نے سب کو کام پر لگا دیا۔

''ربیعہ! مجھے اوپر چائے پہنچا دینا۔'' شاہ بخت کہہ کر ٹیرس کی سمت بڑھ گیا۔نشاط منزل کا ٹیرس سب معمول رنگ' روشنی اور خوشبو کی تمام تر لطافتوں اور رونقوں سے معمور تھا البتہ تعداد اور تناسب میں یرت انگیز طور پر اضافہ ہو چکا تھا۔

''کیا ان کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔کب آئے؟ مجھے تو خبر ہی نہ ہوئی۔'' وہ متحیر سا رہ گیا۔حالانکہ پچھلے ایک ماہ سے اس گھر کا عقبی صحن اور ٹیرس اس کی نظروں کے فوکس میں رہا تھا۔شروع شروع میں تو محض اتفاقیہ نگاہ اٹھ جایا کرتی تھی پھر رفتہ رفتہ نشاط منزل کی رونقیں' ہنگامے اس کے معمولات اور دلچسپیوں کا جزو بنتے گئے۔یوں لگتا یہ سب نظارے اس کی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ایک دن اگر ٹیرس پر نہ آتا تو دل نامعلوم سی خلش اور خالی پن کا شکار ہو جاتا۔یہ شہر یہ کرائے کا گھر ایک ماہ قبل ان کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ایک حادثے میں ان کے والدین جاں بحق ہوگئے۔باپ کوئی وسیع وعریض جائیداد چھوڑ کر نہیں مرا تھا۔بس اتنا تھا کہ اس نے ایم ایس سی کر لیا اور ربیعہ کا انٹر ہو گیا۔نوکری کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔بڑی تگ ودو اور طویل انتظار کے بعد بالآخر پنڈی میں ایک معقول جاب مل گئی۔لاہور میں اکیلی بہن کو چھوڑنا ممکن نہ تھا لہٰذا کالج سے پنڈی مائیگریشن کرائی۔لاہور کا مکان کرائے پر چڑھایا اور پنڈی شفٹ ہوگئے۔یہاں نہ کوئی جان پہچان کا بندہ تھا نہ دوست آشنا۔اجنبی شہر کی اجنبی رہ گزر پرانی خوبصورت یادوں کی راکھ کریدتی۔دل وجاں کو زخم زخم کر دیتی۔وہ تو بہرحال مرد تھا مگر ربیعہ شروع شروع میں یہاں کی تنہائی' اجنبیت اور ماحول سے بہت وحشت زدہ ہوگئی تھی۔

شفتل اس سنگین صورت والے مرد کو چائے پیش کر رہی تھی۔ بڑے خوشگوار سے انداز میں۔ شاہ بخت بڑے زور سے چونکا۔ ٹیرس کے دونوں بلب جل رہے تھے۔ تمام اہل خانہ مع مہمانان گرامی افطار و ڈنر کے بعد کھلے آسمان تلے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ چاروں بہن بھائیوں میں حسب معمول نوک جھونک چل رہی تھی۔ کوئی بھی سامنے متوجہ ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی حرکت کو معیوب جانتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ نشاط منزل کے ٹیرس کی ریلنگ آہنی وہائٹ پولشڈ نقاشی کے نازک کام سے آراستہ محض سجاوٹ کا کام دیتی تھی لہٰذا بیٹھ کر بھی ٹیرس کا سارا منظر واضح نظر آ رہا تھا۔ ان کے ہاں کی ریلنگ البتہ ایسی تھی کہ نشاط منزل والے اپنے ہاں سے بیٹھے بیٹھے نہیں جھانک سکتے تھے۔

اس اکھڑ سے مرد نے چائے پینے سے انکار کر دیا تھا۔ سو شفتل ماں کی ہدایت پر کافی بنا کے لے آئی۔

”اے ہے۔ بیٹی! اس کو گرین ٹی کا شونک (شوق) ہے۔“ کرخت سے مردانہ لب و لہجے کے ساتھ چست کپڑوں میں تھل تھل کرتا وجود مہمان عورت نے ہنس کر کہا تھا۔ اس کے لبوں سے انگریزی کے الفاظ یوں ادا ہوئے تھے جیسے ایک خالص انگریز پشتو لب و لہجہ اپنانے کا عزم لیے نیا نیا میدان میں کودا ہو۔ ان کے پنجابی لب و لہجے میں تو اردو تک اجنبی لگ رہی تھی کجا کہ انگلش۔ لگتا تھا موصوفہ کو انگریزی الفاظ فراٹے سے استعمال کرنے کا بڑا شوق تھا۔

ربیعہ چائے کا کپ لے کر ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر آئی تو بلا ارادہ سامنے نظر اٹھ گئی۔ جانے کیسے خوشبو کی آمد کا علم و عرفان ٹیپو کو بھی ہو گیا تھا۔ اچانک اس کی نظر پڑی تھی۔ نظروں کا تصادم ہوا۔ بڑا موثر اور دیرپا۔ ایک لمحہ قرنوں کے فاصلے بہا کر ساتھ لے گیا۔ ٹیپو کی شوخ براؤن آنکھوں میں اک الوہی سی چمک ابھر آئی تھی جسے اتنے فاصلے کے باوجود ربیعہ نے پوری شدت سے محسوس کیا تھا۔ اس کے لبوں پر دھیمی سی مدھری مسکان سج گئی تھی۔ لب و نگاہ کے شوخ معنی خیز تبسم نے ربیعہ کے رگ و پے میں لطیف سی سنسنی پھیلا دی۔ وہ تیزی سے بھائی کو چائے پکڑا کر ساتھ کی کرسی پر براجمان ہو گئی تھی۔ گویا اس کی سحر آگیں نظروں سے محفوظ ہو گئی ہو۔

”بھائی جان! کہاں ہیں؟“ دھڑکنوں کے ارتعاش پر قابو پا کے اس نے سوچوں میں گم بھائی کے آگے ہاتھ لہرایا۔ یک بیک اسے بہت طمانیت، شانتی اور خوشگواریت محسوس ہونے لگی تھی۔

”ہوں۔ یہیں ہوں۔“ وہ چونکا۔ ”خیریت؟“ اس نے ہڑبڑا کر بہن کی سمت دیکھا۔ انداز سوالیہ تھا۔

”خیریت ہی ہے مگر آپ کہاں کھوئے ہوئے ہیں۔“ اس نے بھائی کا اترا اترا بے چین سا چہرا اور آنکھوں کی مایوس کن کیفیت ملاحظہ کرتے ہوئے ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کا تھکا تھکا انداز کسی ذہنی تناؤ کی غمازی کر رہا تھا مگر ہزار اس کے پوچھنے پر بھی وہ ٹال گیا۔

”محترمہ! آپ کا غرور بجا ہے کہ ان رنگین جلوؤں کی تابانی، ان تجلیوں کی سہار اس دل ناتواں کو کہاں مگر اب ایسا بھی کیا زعم کہ اک جھلک کے لیے ترسا مارا ہے؟ آپ ہمارا حال دل تو اس نامے کے ذریعے روز جان لیتی ہیں۔ کچھ اپنی بھی سنائیں۔ ان گوری گوری مخروطی نازک انگلیوں سے بھی کبھی ہمارے نام بھی کچھ خوشبو خوشبو جملے تحریر فرما دیں۔ اپنے بیمار پہ اتنا بھی ستم ٹھیک نہیں۔ کم از کم ریلنگ کے پاس یا گیٹ کے قریب آ کر اپنا جی بھر کے دیدار ہی کرا دیں۔ اپنے احمریں لبوں کے میٹھے تبسم کی خیرات ہی ڈال دیں ہماری جھولی میں۔ فقط آپ کا عاشق۔“

”افوہ۔“ شدت غیض سے کانپتے ہاتھوں میں کاغذ بھینچ کر پرزے پرزے کر دیا۔ اس کا رواں رواں سلگ اٹھا۔

”یا میرے اللہ! کہاں جاؤں۔ کس کو بتاؤں۔ کیا کروں۔“ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر وہ وہیں بیٹھ گئی۔

گزشتہ ایک ہفتے سے یہ معمول جاری تھا۔ دوپہر کو وہ بیل کے سائے میں بیٹھی ہوتی۔ اسی لمحے پتھر میں لپٹا خط ٹیرس کے فرش سے ٹکراتا اس کا دل مٹھی میں لے لیتا۔ دو تین دن تک وہ ٹیرس پر نہ نکلی مگر پتھر بدستور آتے رہے۔

زچ ہو کر اس نے دوبارہ اپنا معمول شروع کر دیا۔ اس ڈر سے کہ اگر کبھی یہ کاغذی پتھر شاہ بخت کے ہاتھ لگ گئے تو کیا ہو گا۔ جانے ایسے معاملات میں حجاب کیوں ہاتھ باندھ دیتا ہے لڑکیوں کے؟ چپ چاپ جلتی کڑھتی پریشان حال رہیں مگر بھائی یا باپ سے کہنے کی ہمت نہیں کریں گی۔ شاید اس لیے کہ وہ غیرت و حمیت کے انتہائی مظاہرے کے نتیجے میں کہیں خود کو گزند نہ پہنچا بیٹھیں۔ اپنی اور ان غنڈوں کی جان ایک نہ کر دیں۔ سوچوں کے آسیب اس کے وجود کے گرد گرداب بنا رہے تھے۔ مکڑی کے جالے اور سوچوں کے تانے بانے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ایک سے پیچیدہ، الجھے ہوئے، دقیق اور گنجلک۔ یونہی خود سے الجھتے ربیعہ کی نگاہ سامنے اٹھی اور وہ جیسے زندہ زمین میں دفن ہو گئی۔ شفتل ریلنگ پر کپڑے پھیلاتے ہوئے پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھی اور اس کا کچھ کھوج لگانے والا متجسس سا انداز شاہد تھا کہ وہ کچھ ساعت پیشتر رونما ہونے والے واقعے کی جزئیات ملاحظہ کر چکی ہے کیونکہ اس پر

سرسری سی نگاہ ڈال کر وہ گلی میں کھڑے لڑکے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ربیعہ کی سانسیں اٹکنے لگیں۔ اف سرعام تذلیل ورسوائی کی داستان کا آغاز ہو چکا تھا۔ کیا سوچ رہی ہوگی وہ اور کس کس سے ذکر کرے گی؟

دکھا کر اک جھلک دل کو نہایت کر گیا بے کل

آج کل ٹیپو کی زبان پر نظیر اکبر آبادی کے اسی مصرعے کا مترنم ورد تھا۔

''افوہ! کیا نظیر صاحب یہی مصرعہ کہہ کر گزر گئے تھے۔'' تواتر سے ایک ہی فقرے کا بار بار اعادہ شفقل کی سماعت پر گراں گزرنے لگا تھا۔

''ہرگز نہیں۔'' ٹیپو مخمور آنکھیں کھول کر دھیرے سے مسکرایا۔ ''وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ

جب ایسا حسن بھبھوکا ہو دل تاب بھلا کیوں کر لاوے
وہ مکھڑا چاند کا ٹکڑا سا جو دیکھ پری کو غش آوے

''یہ اپنے ٹیپو آفریدی صاحب ہی ہیں ناں!'' شفقل نے حیرانی سے نرل سے دریافت کیا۔ ''بخدا ایسا دھیمے سروں میں بجتا ساز اور ایسی شائستہ بیانی کا مظاہرہ پہلی دفعہ میرے سامنے ہوا ہے۔''

ٹیپو اس کا طنز پی کر بدستور دل نشین خیالات میں کھویا رہا۔ اس کی نگاہ میں' دل میں' دھڑکنوں میں' تخیل میں بس ایک چہرا بس گیا تھا۔ سادہ سنجیدہ' معصوم' شائستہ پر وقار۔ اس کی اک اک ادا نے ہزار بار' ہزار ہا روپ میں چشم تصور میں جلوہ گری کر کے حشر بپا کیا تھا۔

''تم نے بنا دیا ہے کیا سے کیا مجھے۔'' وہ ایک نئی ترنگ سے گنگنانے لگا۔ شفقل کی نگاہوں میں کل دوپہر کا منظر روشن ہو گیا۔ بتا دوں اسے کہ تمہاری منزل کھوٹی ہے مگر نہیں؟ اس نے دماغ کی تجویز خود ہی رد کر دی۔ تصدیق بہر حال ضروری ہے۔ اسی لمحے آندھی طوفان کی رفتار سے عمران عقبی صحن میں داخل ہوا۔

''تائی عید کارڈ خریدنے بازار جا رہی ہیں جس جس نے جانا ہو تیار ہو جائے۔''

''ہرا۔ تائی کے ساتھ شاپنگ۔ وہ بھی عید کارڈز کی۔'' ٹیپو اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ شفقل نے بھی دروازے کی جانب دوڑ لگانے میں دیر نہیں کی۔ تھوڑی دیر میں سوائے وقار اور بیگم آفریدی کے سب لدے لدائے شاپنگ کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔

''بھائی کارڈ والے! ہمیں وہ والے کارڈ دکھاؤ جو بہت بیائی فول ہوں۔'' کاسنی کلر کا ریشمی لہنگا [...]ں ہاتھوں میں سنبھالے' سرخ بڑا سا بیگ شانے پر ڈالے۔ سرخ رنگے ہوئے بوب کٹ بالوں [...]، سجے جھریوں سے بھرے (جو میک اپ کے اناڑی پن کے باعث مزید نمایاں ہو رہی تھیں) [...]ے پر رنگین شیشوں کی عینک لگائے اپنی طرف سے وہ بڑی چیز بنی ہوئی تھیں۔ الگ تھلگ کونے پر [...]یعہ کے لیے مناسب سا عید کارڈ منتخب کرتے شاہ بخت نے کراری سی' قدرے الھڑ سی آواز سن کر بے [...]نیار پلٹ کر دیکھا۔ بے ساختہ لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تیر گئی۔ وہ پورا شرارتی ٹولہ معہ اپنے مہمانوں [...]ے اسٹال کے قریب ایستادہ تھا۔

''تائی جان! بلڈی فول تو آپ کے گھر پہ ہی بہتیرے ہیں۔ آپ بیوٹی فل پر ہی اکتفا کر لیجیے۔'' [...]ی تگ و دو کے بعد اپنے اندر ابلتے قہقہے کو دبا کر ٹیپو نے جیسے بڑی دردمندی سے مشورہ دیا تھا۔ دکاندار نے سر اٹھا کر بڑی مضحکہ خیز نگاہوں سے بڑی بی کو دیکھا تھا۔ وہ ناک چڑھائے سارے کارڈز ریجیکٹ کیے جا رہی تھیں۔

''ہونہہ! موئے یہ تو ذرا بھی پارٹی نہیں۔''

''تائی کا مطلب ہے۔ آپ کے ہاں پریٹی کارڈز نہیں ہیں۔''

دکاندار کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں نرل نے اطمینان سے تائی کی اصطلاح کی وضاحت کی تھی۔ شاہ بخت کو حقیقتاً اپنی ہنسی دبانے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑی۔ بڑی تگ و دو کے بعد اللہ اللہ کر کے انہوں نے تین کارڈز خریدے۔ دو سعودیہ میں مقیم اپنے بھائیوں کے لیے اور ایک عاشی بی کی متوقع و مجوزہ سسرال کے لیے۔ آخری عید کارڈ بڑی چھانٹی کے بعد انہوں نے پسند کیا تھا۔ بقول ان کے اس کی پکچر بہت بیائی فول ہے۔ پہلے پہل ٹیپو نے اندر کی انگریزی میں لکھی عبارت پڑھ کر اعتراض کیا مگر پھر شفقل کے اشارے پر کچھ سوچ کے چپ ہو رہا۔ شفقل اور نرل نے تائی کے اس انتخاب کی جی بھر کے تعریف کی۔ زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔ رہا وقاص تو اسے ماں کو بے وقوف بنانے کی اسکیم کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ وہ اسی میں خوش منہ پھاڑ کے قہقہے لگا رہا تھا کہ چلو ایک انجوائے منٹ سہی۔

''اور یہ لائی ہوں میں عاشی کے سسرال پوسٹ کرنے کو۔'' گھر آ کر بیگم آفریدی اور وقار کو دکھاتے ہوئے تائی بصد ناز بولی تھیں۔ امی نے پڑھ کر جیٹھانی انداز میں جیٹھانی کو دیکھا۔ وقار کی پیشانی کی لکیروں میں اضافہ ہو گیا۔

"یہ کیسا......اٹھالائی ہیں امی! دیکھ تو لیتیں۔" وہ ناگواری سے بولا۔

"اے لو۔ اچھی طرح دیکھ بھال کے ہی تو لائی ہوں۔ دو ادھر مجھے۔" انہوں نے خفگی سے کارڈ جھپٹ لیا۔ وہ تو داد و تحسین کے ڈونگروں کی منتظر تھیں۔ کھول کر بذاتِ خود معائنہ کیا۔ سنہرے انگریزی حروف پر مشتمل اس لمبی سی عبارت کو تفہیمی انداز میں کھنگالا۔

"اے شفو بیٹی! کیا بتلایا تھا تم نے اس کا مطلب؟"

"تائی اس کا مطلب ہے بہت زیادہ عید مبارک۔" اس نے کن انکھیوں سے وقار کے بگڑتے چہرے کو دیکھتے ہوئے سادگی سے جواب دیا۔ تائی کچھ مطمئن نہ ہوئیں۔

"پر یہ تو بہت لمبی عبارت ہے۔" وہ سنہری حروف کو یوں تک رہی تھیں جیسے کھوج لگانا چاہتی ہوں۔

"تو اس کا مطلب ہے تائی کو بہت لمبی' بہت میٹھی' بہت پیاری عید مبارک ہو۔" ٹیپو نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے متانت سے ان کی تسلی کر دی۔ تائی نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

"بھابی یہ کارڈ آپ عاشی کے سسرال روانہ کریں گی۔ یہ تو قطعی نامناسب ہے۔" اپنی اولاد کی شرارت پر نالاں امی نے قدرے ہچکچا کر انہیں مخاطب کیا۔

"تمہیں زیادہ پتا ہے؟ بس کرو تم۔" تائی نے ناراضگی سے انہیں دیکھا۔ "اب اس کے اوپر لکھوں کیا؟ تم لوگ ذرا مجھے گائیڈ کرو۔" تائی ان کی سمت متوجہ ہو کر کسی نوعمر لڑکی سے اشتیاق سے بولی تھیں۔

"کوئی خوبصورت شعر بتاؤ مجھے۔"

"بالکل بالکل تائی! میں بتاتا ہوں آپ کو۔" ٹیپو آنکھوں میں شرارت بھرے تائی کے ہمراہ بیٹھ گیا۔

"تائی! یہ والا کیسے رہے گا۔"

ہری ہری ڈالیوں پہ آ گیا بور ہے
عید مناؤں کیسے ساجن میرا دور ہے

شفقل نے لپک کے تائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے مشورہ دیا تھا۔ "قسم سے اس عبارت کو چار چاند لگا دے گا۔"

"ہٹو شریر۔" تائی شرما کر ہنس دیں۔ وقاص نے منہ پھاڑ کر قہقہہ لگایا۔ حسب عادت۔ نرمل اور ٹیپو نے اشاروں سے شفقل کی پیٹھ تھپکی کہ "صحیح جا رہی ہو" عاشی بی تو اپنے سسرال کے ذکر پر ہی لاج سے سمٹ کر محفل سے کوچ فرما چکی تھیں۔ امی چائے بنانے کے لیے روانہ ہو چکی تھیں۔ سو بہن بھائیوں کو

کھل کھیلنے کا پورا پورا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ وقار نے تلملائی ہوئی نگاہ شفقل پر ڈالی اور تیزی سے باہر نکل لیا۔

"ویسے تائی! یہ کارڈ آپ اپنی کسی محبوب ہستی کو دے دیں۔" ٹیپو نے معنی خیز نگاہ شفقل پر ڈال کر سنجیدگی سے تائی کو مشورہ دیا۔ شفقل اس کی شرارت پر مسکرا دی۔ محبوب کو بڑا چبا کر زور دے کر ادا کیا تھا۔

"پر تایا جان تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ چچ چچ" شفقل نے افسوس سے سر ہلایا۔

"تو کیا ہوا۔ تائی جاتے ہوئے ساتھ لے جائیے گا یہ کارڈ۔ ایسی کیا بات ہے۔" ٹیپو نے جیسے تائی کو حوصلہ دیا۔

اک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ چائے میز پر رکھتے ہوئے امی نے غصے سے انہیں گھورا۔

"اللہ سلامت رکھے بھابی کو۔ شرم تو نہیں آتی۔" وہ جیٹھانی کے سامنے شرمندہ ہوئی جا رہی تھیں۔

"کیسی ناہنجار اولاد ہے۔ ان کے منہ پر ان کی موت کی باتیں کر رہی ہے۔"

تائی لاکھ بے وقوف سہی مگر کچھ نہ کچھ فہم تو رکھتی تھیں۔ انہیں اندازہ ہو چلا تھا کہ کس شان سے وہ بے وقوف بنائی گئی ہیں۔

"اے مجھے نکو بنا رہے ہیں تمہارے بچے۔" وہ جیسے بڑے صدمے سے بولیں۔ "لو ذرا تم پڑھ کے سناؤ' کیا مطلب ہے اس کا۔" انہوں نے کارڈ کے اندر لکھی عبارت دیورانی کو پڑھنے کے لیے دکھائی۔

"اس کا اردو ترجمہ ہے۔ میرے دل کو مسکراتے لبوں سے چھوؤ۔" امی نے جیسے ہار کر بالآخر پڑھ دیا۔

ان کا چہرا قدرے تپ گیا تھا۔ اف کس قدر بکواس جملہ تھا۔ تائی کے چہرے پر زلزلے کے تمام آثار ہویدا ہو گئے۔ ٹیپو اور شفقل سب سے پہلے دروازے کی سمت لپکے تھے۔ ان کے پیچھے باقی سب سرپٹ بھاگتے ہوئے' شفقل کوریڈور کے آخری سرے پر پہنچ گئی۔ ارد گرد ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

"تم میری ماں کو بے وقوف بنا رہی تھیں؟" پھولے پھولے سانس درست کرتے ہوئے جونہی اس نے دیوار سے ٹیک لگائی۔ یکلخت اس کا ہاتھ ایک مضبوط کھردرے ہاتھ میں آ گیا۔ لہجہ انتہائی درشت اور تند تھا۔ وہ سناٹے میں آ گئی۔ "کس نے حق دیا ہے تمہیں ایک معصوم عورت کو ورغلانے کا۔"

"جی۔" اس نے سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے سنگین تاثرات ملاحظہ کیے۔ "ایں۔ تائی اور معصوم......اور جی میں انہیں ورغلا رہی تھی۔ بھلا کاہے کو۔" وہ دل

ہی دل میں وقار کے سفید جھوٹ پر ششدر تھی۔ حیرت تو اسے اس کی جسارت پر بھی ہو رہی تھی۔ کس قدر استحقاقانہ انداز میں اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

"دیکھیے جی! آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم تو یونہی ذرا چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔" اس نے شائستگی سے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ آزاد کرایا اور پھر وہاں سے چمپت ہونے میں دیر نہیں لگائی۔

"آ...... آپ کو میرا فون نمبر کیسے معلوم ہوا؟" وہ رو دینے کو تھی۔ جواب میں اک زوردار قہقہہ گونجا۔

"اجی۔ مہینوال سوہنی کے لیے چرواہا بن گیا تھا۔ فرہاد نے اپنی شیریں کے لیے دودھ کی نہر کھود ڈالی تھی۔ پنّوں نے سسّی کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ شہزادہ سلیم نے تاج و تخت ٹھکرا دیے۔ تو کیا ہم آپ کی خاطر آپ کے عشق میں۔ فون نمبر بھی معلوم نہ کر پاتے۔ ویسے اتنی خوفزدہ کیوں ہو گئی ہیں؟ ارے بابا ہم تو تمہارے اپنے ہیں۔" وہ کمینہ پوری طرح اس کی ہراساں کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"میرے اللہ!" ربیعہ نے لرز کر فون پٹخ دیا۔ "اف کیا کروں میں۔" وہ سرتاپا کانپ رہی تھی۔ دل پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے کو تھا۔ معاملہ کس قدر سنگین ہو چکا تھا۔ مرتعش قدموں سے اوپر ٹیرس پر آ گئی جیسے فون والے کمرے ہی سے کہیں وہ خبیث برآمد ہو جائے گا۔ "اُف" زور سے آنکھیں میچ کے اس نے چہرا گھٹنوں میں چھپا لیا۔ اسی لمحے کاغذی پتھر زور سے آ کر اس کے قدموں میں گرا۔ وہ زور سے اچھل پڑی۔ وہ ہر طرف سے اسے گھیرنے کے چکر میں تھا۔ مارے دہشت اور بے بسی کے اس کے آنسو نکل آئے۔ اتنی ہمت بھی نہ رہی کہ اس پتھر کو اٹھا کر کہیں ادھر ادھر کر دیتی اور دوسرے ہی لمحے جیسے اس کا سانس بند ہونے لگا۔ ایک کے بعد دوسرا کاغذی پتھر بوگن ویلیا کی بیل سے الجھتا ہوا آ کر گرا تھا۔

"ٹھہرو ذرا۔ کمینے انسان...... کیا کر رہے ہو تم؟" اک کرخت کڑکتی ہوئی زنانہ آواز پر گلی میں منتظر مونچھیں سنوارتے لڑکے نے اوپر دیکھا اور جیسے سناٹے میں آ گیا۔

"وہ۔ جی۔ وہ میں" لڑکا قدرے گھبرا کر آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ "وہ جی میری پتنگ کٹ کر ادھر آ گری تھی۔ تو" اس کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔

"ارے پتنگ نہیں خبیث انسان! تمہاری شامت تمہیں ادھر لائی ہے۔ ٹھہرو ذرا میں بلاتی ہوں

ٹیپو کو اور امی کو بھیجتی ہوں تمہارے گھر مع تمہارے کاغذی پیامبروں کے۔ تمہارے مولانا والد صاحب کو تمہاری عشقیہ وارداتوں کی خبر ہو گی تو دیکھنا جو انجام ہو گا وہ سارا محلہ دیکھے گا۔ کیا خیال ہے۔ دو تین سال پہلے والا واقعہ فراموش کر گئے۔" وہ ریلنگ پر دونوں ہاتھ جمائے بڑے اطمینان سے استہزائیہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔ لہجے میں سختی، طنز اور تمسخر کے ساتھ ساتھ بے پناہ مضبوطی اور اعتماد تھا۔ ہیرو صاحب منت سماجت کرنے لگے۔

"بس جی۔ چھوڑیں جی۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔" وہ لجاجت سے کہہ کر مڑنے لگا۔

"ٹھہرو ذرا اپنے دلیپ کمار صاحب!" پیچھے سے آواز آئی۔ "یہ اپنے پتھر ہمراہ لیتے جاؤ۔ کسی دوسرے محلے میں آزما لینا۔ سسٹر! یہ دونوں پتھر اس کے منہ پر مارو۔" وہ ربیعہ سے مخاطب ہوئی۔ ربیعہ نے لرزتے ہاتھوں سے دونوں پتھر نیچے پھینک دیے۔ وہ کھسیانا سا ہو کر انہیں اٹھا کر جیب میں ڈالنے لگا۔ "اور ہاں۔ اب اس محلے میں نظر آئے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" شفتل نے دھمکی آمیز لہجے میں خجالت سے لبریز چہرا لیے شرمندہ قدموں سے جاتے ہوئے دلیپ کمار سے مخاطب ہو کر کہا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد لڑکے نے مڑ کر دیکھا۔ شفتل کو ہنوز ٹیرس پر ایستادہ دیکھ کر اس نے قدموں کی رفتار تیز کر دی اور سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا۔ شفتل ہاتھ جھاڑ کر ہنستی ہوئی اندر چلی گئی۔ آنکھوں میں شکر کے آنسو لیے رندھے ہوئے گلے سے ربیعہ نے اسے پکارنا چاہا مگر اس اثنا میں وہ دروازہ پار کر چکی تھی۔

"او گاڈ" اس نے طویل سانس لے کر کرسی کی پشت پر سر رکھ دیا۔ کس طرح جان اور آن بچائی تھی اس نے اس کی۔ وہ ممنونیت کے جذبات سے لبریز ہو کر سوچ رہی تھی۔ شفتل کا پاٹ دار گرجتا ہوا انداز تصور میں در آیا اور ساتھ ہی بھیگی بلی بنے اس ہیرو صاحب کی درگت یاد آ گئی۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"سارا طرہ بھسم ہو گیا محترم کا۔ کس طرح خون خشک کر رکھا تھا میرا۔ اعصاب شل کر ڈالے تھے۔ مگر وہ اس سے اتنا مرعوب کیوں ہو گیا تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی پسینے چھوٹنے لگے تھے اور اس کا لہجہ بھی کچھ۔ ارے ہاں وہ کہہ تو رہی تھی کہ پچھلے دو تین سال پہلے کا واقعہ فراموش کر گئے؟" وہ گتھی سلجھا رہی تھی حالیہ واقعے کی۔

"اچھا چھوڑو۔ کل سے کالج کھل جائیں گے۔ وہیں ان سے پوچھ لوں گی اور شکریہ بھی ادا کر دوں گی۔"

اس نے سرشاری سے سوچ کر خود کو تسلی دی۔ اتنا تو اسے علم ہو ہی چکا تھا کہ وہ اسی کے کالج میں

پڑھتی تھی۔

قدرے تذبذب کے عالم میں بے بسی سے شفتل نے انہیں دیکھا۔

''امی! میں کیا رائے دوں۔'' وہ گہری سانس لے کر بولی۔

''آپ خود دانا و بینا ہیں۔ تجربہ کار ہیں جیسے آپ کہیں۔'' اس نے سر جھکا لیا۔ امی نے عمیق نگاہوں سے بیٹی کے کچھ بے چین سے کچھ خفا خفا سے تاثرات نوٹ کیے۔ وہ بائیں پیر کے انگوٹھے سے قالین کا کونا کرید رہی تھی۔ پیشانی پر تفکر کی لکیریں نمودار ہو چکی تھیں۔

''اب کروں بھی کیا؟'' امی نے اس سے زیادہ خود کو تاویل پیش کی۔

''تمہارے پاپا کا بھی اصرار ہے کہ بھابی کی درخواست قبول کر لیں۔ کس قدر منتیں کر رہی تھیں۔ یاد نہیں ریلوے اسٹیشن پر رخصت ہوتے وقت بھی بدستور اصرار کیے جا رہی تھیں۔ تمہارے پاپا کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس طرح دونوں خاندان ایک دوسرے کے قریب آ جائیں گے۔ فاصلے کم ہوں گے پھر انہیں وقار کی پرسنالٹی پسند آئی ہے البتہ انہوں نے کہا ہے تمہاری مرضی پوچھے بغیر ہم بھابی کو کوئی رسپانس نہیں دیں گے۔''

''امی! میرے خیال میں یہ رشتہ کچھ بے جوڑ سا ہے۔'' ٹیپو نے سنجیدگی سے ماں کو اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

''وقار بھائی اور شفو کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔''

''شادی کے بعد مرد عورت دونوں بدل جاتے ہیں۔ یہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔'' امی نے بغیر نظر اٹھائے کہا۔

''ابتدا سے جو عادات پروان چڑھتی ہیں جو مزاج اور شخصیت تشکیل پاتی ہے وہ آگے جا کر نہیں بدلتی اور بدلے بھی تو کتنی حد تک؟ ان کا رویہ کس قدر روکھا پھیکا' توہین آمیز اور مغرورانہ ہے۔ یہ تو آپ کے سامنے کی بات ہے۔'' ٹیپو نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''شفو ان کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو پائے گی۔ ہم لوگوں کو آپ نے بہت کھلا' بڑا روشن' پرسکون ماحول دیا ہے۔ انسان کو انسان سے مربوط رکھنے کا ہنر سکھایا ہے۔ ایسے شفاف ماحول سے کٹ کر اس پراگندہ طبع خاندان میں یہ کیسے ضم ہو سکے گی؟ نہیں امی ان لوگوں کا مزاج ہم سے میل نہیں کھاتا۔'' ٹیپو بدستور اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔ ''میری نظر میں یہ کوئی مستحسن اقدام نہیں ہوگا۔''

''شفو اتنی بے وقوف نہیں ہے جو صورتِ حال کو نہ سنبھال سکے۔ پھر وہ کوئی غیر تو نہیں ہیں۔'' امی ،ٹیپو کی رائے سن کر برا سا منہ بنا کر جواباً کہا۔

''ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔'' ٹیپو کندھے اچکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''پھر شفتل! تمہاری کیا رائے ہے۔ مجھے فائنلی بتاؤ۔ بھابی نے فون کا تانتا باندھا ہوا ہے جواب نے کے لیے۔''

امی کی بات پر شفتل نے نظر اٹھا کر بغور ان کا چہرا جانچا۔ ان کے تاثرات سے واضح تھا کہ وہ اس شتے کی زبردست حامی تھیں اور اس کی جانب سے یقیناً ہاں کی متمنی تھیں۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ آہستگی سے بولی پھر چہرا موڑ کر کہنے لگی۔

''آپ جو کچھ بھی کیجیے گا' میرے فائنل ایگزام کے بعد۔''

وہ باہر نکل گئی تھی' اگر کوئی خوشی نہیں تھی تو کوئی دکھ بھی نہ تھا۔ بس اک خالی پن کا احساس ہو رہا تھا۔ ار کا چہرا تخیل کی وادی میں ابھرا۔ تنا تنا' غیض وغضب کے تمام رنگوں سے مزین بے مروت سا راز۔ بے رخی اور بدمزاجی کا حامل رویہ۔

''چلو مسٹر دیکھ لیں گے تمہیں۔ ہم اپنا ظرف اپنائیں گے تم اپنا قہر۔'' وہ کچھ سوچ کر مطمئن ہو گئی۔

''سنیے۔ وہ آپ بی ایس سی فائنل کی شفتل آفریدی کو جانتی ہیں؟'' فورتھ ایئر کی ایک لڑکی کو روک ر اس نے قدرے جھجک کر پوچھا تھا۔ وہ ابھی کالج کے ماحول اور اسٹوڈنٹس کے مزاج سے واقفیت اصل نہیں کر سکی تھی۔ ہنوز خود کو اپنے آپ میں سمیٹ کے رکھتی۔ محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر قدم ٹھاتی۔ لڑکی نے مڑ کر سر تا پا اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں غایت درجہ حیرت تھی۔

''بھئی۔ انہیں کون نہیں جانتا ہوگا۔ پریذیڈنٹ ہیں یونین کی۔'' وہ اپنی لاعلمی پر شرمندہ سی ہو گئی۔

''جی۔ میرا مطلب ہے۔ ابھی۔ اس وقت کہاں مل سکتی ہیں۔'' اس نے بے قراری سے کہا۔ ''یا ن کا کون سا پیریڈ فری ہوتا ہے۔ کچھ پتا ہے آپ کو؟''

''اس وقت؟'' لڑکی نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔ ''ویسے تو وہ ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔'' وہ گھڑی کی سوئی کی رفتار ملاحظہ کرتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''اس وقت شاید یونین کے آفس میں ہوں گی۔'' بتا کر وہ آگے بڑھ گئی۔ ربیعہ کوریڈور عبور کرتی آفس کی طرف لپکی۔

اطلاع تو درست تھی مگر موقع محل کوئی نہیں تھا۔ وہ دو تین اساتذہ اور پھر یونین کے دوسرے ممبران

میں گھری بیٹھی تھی۔ ''چلو اس پیریڈ کے بعد سہی۔'' اس نے مایوسی کو بھگاتے ہوئے سوچا۔

پھر وقتاً فوقتاً ہر پیریڈ میں کوریڈور، اسٹاف روم، ڈیپارٹمنٹس، کالج گراؤنڈ، ہال اور کلرک روم وغیرہ میں جھانکتی چکر لگاتی رہی۔ ہر جگہ وہ مل جاتی مگر کسی دوسرے سے بات کرتی اور یہ جرأت وہ خود میں نہیں پاتی تھی کہ براہِ راست سب کے سامنے مخاطب کرے۔ کلاسز آف ہونے کے بعد دل گرفتگی کے عالم میں وہ بس اسٹینڈ کے پاس آئی۔ اپنے مطلوبہ روٹ کی بس میں ٹھنس ٹھنسا کے کھڑے ہونے کی جگہ ڈھونڈی۔ بسیں چلنے کو تیار آخری تنبیہی ہارن دے رہی تھیں۔ پہلے پہل تو اتنے رش میں اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ کبھی کالج یا اسکول بس کی عادی نہیں رہی تھی۔ ہمیشہ ابو جان یا بخت بھائی پک اینڈ ڈراپ کرتے تھے مگر اب صورتِ حال مختلف تھی۔

''ہے لڑکی! ادھر آ جاؤ۔'' دفعتاً کسی نے پیچھے سے اس کا دوپٹا کھینچتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ قدرے بوکھلائے گھبرائے انداز میں اور پھر جیسے ساکت رہ گئی۔

''آپ!'' خوشی سے چھلکتے لہجے میں اس کے قریب کھسکتی ہوئی ساتھ بیٹھ گئی جہاں پہلے شفتل کا بیگ دھرا تھا۔

''تھینکس۔ میں آپ کو پورے دو ہفتوں سے ڈھونڈ رہی تھی۔ کہاں تھیں آپ؟'' وہ بے تابی سے دریافت کر رہی تھی۔ ''مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ آپ نے اتنے بڑے جنجال سے میری جان چھڑا دی۔''

وہ بغیر سانس لیے بولے جا رہی تھی مبادا پھر کوئی شفتل کو اپنے میں انگیج کر لے۔

''بھئی میری منگنی کا سلسلہ تھا اس لیے چھٹی پہ تھی۔'' اڑتے بالوں کو سمیٹتے ہوئے اس نے عام سے لہجے میں کہا۔ ربیعہ نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''اتنے بے نیاز سے انداز میں اتنی اہم خبر؟'' کوئی شرم یا جھجک یا دھیرج پن نہیں تھا اس کے انداز میں۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔ ''ہاں وہ میں کل بازار گیا تھا اس لیے۔'' اس کا ارادہ تو تھا شفتل کو اس تعلق کی نسبت سے شوخ سے انداز میں چھیڑنے کا مگر اس کا لاپروا عام سا انداز دیکھ کر ملتوی کر دیا۔

''آ۔ آپ۔ کیا جانتی تھیں اس غنڈے کو؟'' اس نے نظریں جھکا کر دھڑکتے دل سے آغاز کیا۔

''ارے بھئی اسے کون نہیں جانتا۔ عشق اور مشک کی طرح بدقماشی بھی چھپائے نہیں چھپتی۔'' اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے اس نے واقعہ کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

''بہ حال تم کسی قسم کے اندیشے کو دل میں جگہ نہ دو۔''

اس نے بے تکلفانہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''وہ آئندہ تمہارے سائے کو بھی چھونے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اگر تم پہلے دن سے ہی خوفزدہ ہونے کے بجائے اس کی طبیعت صاف کر دیتیں تو وہ لفنگا کبھی دوبارہ ادھر نہ آتا۔ اس قسم کے اسٹریٹ ہیرو مقابل کے ماتھے پر پڑتے بل دیکھ کر اس کا سخت لہجہ سن کر ہی پانی ہو جاتے ہیں۔'' شفتل بیگ سے نیل کٹر نکال کر ناخن کاٹنے لگی۔ ''پھر وہ اپنے باپ سے بہت ڈرتا ہے۔ ایک دفعہ میرا فون نمبر کہیں سے مل گیا اسے۔ لے کر رنگ کر مارا۔ میں نے کیا کیا۔ اس کے گھر کا پتا نوٹ کیا۔ باپ کا نام پڑھا اور ڈائریکٹری سے نمبر کھنگال کر ساری داستان اس کے باپ کو کہہ سنائی۔ شام کو امی اس کی ماں کے ہاں گئیں۔ ٹیپو نے مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔ دیکھا تھا اس دن کیسے میری شکل دیکھ کر بدک کے بھاگا تھا۔ بزدل۔'' اس نے ہونٹ سکوڑ کے کہا۔ ربیعہ اس کے پراعتماد لہجے، اس کے پرسکون اور قدرے بے نیاز سے انداز، اس کے چہرے اور آنکھوں سے ہویدا مضبوطی اور پر تمکنت تاثرات سے بہت متاثر ہوئی۔

''کبھی آنا ہمارے ہاں بھئی۔'' اسٹاپ پر اترتے ہوئے شفتل نے اسے دعوت دی۔

''جی ضرور۔'' اس کے لہجے میں خلوص کی خوشبو محسوس کر کے ربیعہ نے مسکرا کر وعدہ کر لیا۔ بلکہ اگلے ہفتے سہ پہر کو وعدہ پورا کرنے کے لیے وہ سچ مچ چلی آئی۔

عقبی دروازہ ٹیپو نے کھولا تھا۔

''جی وہ مجھے۔ شفتل سے ملنا ہے۔'' جانے کیوں وہ گھبرا سی گئی تھی۔ وہ بھنورا سی بھوری آنکھیں جیسے اس کے چہرے پر گڑ کر رہ گئی تھیں۔ نظروں کی تپش سے اس کے پسینے چھوٹنے لگے۔ وہ ایک ٹک اسے گھورے جا رہا تھا۔ شعلہ فشاں رخساروں پر خمدار پلکوں کا رقص ٹیپو کا کل ضبط و قرار لوٹے لیے جا رہا تھا۔ اس کا دلنشین سراپا اس کے ہوش و حواس چھین کر لے گیا۔ وہ ایک ٹک پاگلوں کی طرح اسے تک رہا تھا۔

''وہ۔ میں۔'' ربیعہ کے اوسان خطا ہونے لگے۔ ہاتھ مسلتے ہوئے پھنسے پھنسے گلے سے کہا۔

''اوہ۔ آیئے پلیز۔'' ٹیپو بھی جیسے ہوش میں آ گیا۔

راستہ چھوڑ کر اندر آنے کی دعوت دی۔ ربیعہ بمشکل اپنے اڑے ہوئے حواس مجتمع کر کے اندر کی سمت بڑھی تھی۔

بیگم آفریدی نے بہت خوش اخلاقی سے اس کی پذیرائی کی۔

''جاؤ ٹیپو! شنو کو جگاؤ جا کر۔''

امی نے بظاہر ٹیپ ریکارڈ کے اندرونی پرزوں کی صفائی میں مگن ایک کونے پر بیٹھے ٹیپو سے کہا جو بباطن پوری طرح ان کی باتوں پر کان لگائے متوجہ تھا۔ ساتھ میں اڑتی پڑتی نگاہ ربیعہ کے دلفریب مکھڑے پر بھی ڈال لیتا۔

''وہ امی۔ میں۔ اور اسے اٹھاؤں۔'' اس نے گڑبڑا کر ماں کو دیکھا۔ پھر کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''میں واضح طور پر معذرت کا طالب ہوں۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں محترمہ پہلا فائر ہائی ہیل والی جوتی کا داغتی ہیں۔ میرے سر پر تو ویسے بھی یہی چار بال رہ گئے ہیں۔'' اس نے اپنے گھنے چمکدار براؤن بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے قطعیت سے کہا۔

''افوہ!'' امی جھنجلا گئیں۔ ''جاؤ عمران تم۔''

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق عمران میاں ہوم ورک چھوڑ کر حکم کی تعمیل میں اٹھے۔ محض پانچ منٹ بعد ان کی لرزہ خیز چیخ سے سارا گھر گونج اٹھا۔

''الٰہی خیر۔ یہ کیا ہوا۔'' ربیعہ نے دہل کر دھڑ دھڑ کرتے دل پر ہاتھ رکھا۔

''وہی جس سے بچنے کے لیے میں نے معذرت چاہی تھی۔'' ٹیپو نے اطمینان سے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

''اُف جاؤ نرمل تم۔'' انہوں نے سبزیوں کی گوڈی میں تندہی سے مصروف نرمل سے کہا اور خود عمران کی خستہ حالی ملاحظہ کرنے ادھر لپکیں۔ تھوڑی دیر میں ماتھے پر گومڑ سجائے وہ بھی ہائے وائے کرتی واپس آ گئی۔

''امی! دیکھ لیجیے مم میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔''

عمران اور نرمل کی حالت زار ملاحظہ کرتے ہوئے ٹیپو نے خوفزدہ ہو کر ماں کو دیکھا۔ وہ زچ ہو کر خود ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''کیا شفتل روز اسی طرح اٹھتی ہیں؟'' وہ ہراساں ہو کر پوچھ رہی تھی۔

''نہیں جی۔ دراصل دن کو جب وہ سوتی ہیں تو اپنی مرضی سے پانچ بجے اٹھتی ہیں۔ اس سے پہلے اگر انہیں اٹھانے کی کوشش کی جائے تو اٹھانے والے کا یہی انجام ہوتا ہے۔'' ماتھے کا گومڑ سہلاتے ہوئے نرمل نے وقتی طور پر آہوں کراہوں کا سلسلہ منقطع کر کے جواب دیا تھا۔

امی کی پندرہ منٹ کی جانفشانی سے کی گئی کوششوں کے نتیجے میں وہ اس کے سامنے تھی۔ بڑے

فریش خوشگوار اور مطمئن انداز میں۔ کوئی دیکھ کر قیامت تک تسلیم نہ کر پاتا کہ چند ساعت قبل ہونے والی خونریزی میں اس کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔

ربیعہ کے جانے کے بعد ٹیپو نے جی بھر کے شفتل کے لتے لیے۔

''یہ ڈھنگ ہے۔ کون سا دستور ہے یہ۔ گدھے کی طرح پڑی اینڈتی رہتی ہیں۔ محترمہ۔ کوئی بھلے انتظار کی سولی پہ لٹکا ادھ موا ہو جائے۔'' وہ چیں بجبیں ہو کر کہہ رہا تھا۔

''اگلے گھر جائیں گی تو چار چوٹ کی مار کھائیں گی۔ اچھا ہے۔ وقار بھائی سے تمہارا پالا پڑا ہے۔ درست کر دیں گے تمہیں بدعادتوں سمیت۔'' وہ سلگ کر بڑبڑا رہا تھا۔

''تم کیوں تاؤ کھا رہے ہو۔ ہیں۔'' شفتل نے اطمینان سے کہتے ہوئے اسے سرتاپا دیکھا۔

''تمہارا کام تو نکل گیا ہے ناں۔ تمہیں کیا مطلب میرے معاملات سے؟'' اسے شان سے ڈپٹ کر وہ امی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ''میرا خیال ہے اس کے لیے بھی کوئی کھونٹا تلاش کر ہی لیں۔ ویسے یہ ربیعہ کیسی لگی آپ کو؟ کیا خیال ہے آپ کا اس کے بارے میں؟''

''اوہ تمہارے منہ میں گھی شکر۔'' ٹیپو تو گویا نہال ہو گیا۔ بس نہیں چل رہا تھا ابھی بلائیں لے ڈالے اس کی۔ کس قدر من پسند موضوع چھیڑا تھا اس نے۔ وہ ماں کی رائے جاننے کو پوری طرح ہمہ تن گوش ہو گیا۔

اس سے پہلے چھاجوں مینہ برسنے والا محاورہ اردو کمپوزیشن میں پڑھا تھا۔ آج اس کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ لیا۔ لگتا ہے سچ مچ اللہ میاں چھاج بھر بھر کر الٹ رہا ہے۔'' اس نے ایک نظر تربتر لباس پر ڈالی پھر برہم سی ہو کر آسمان کو دیکھا۔

''اللہ! آج تو کوئی فلمی سچویشن بھی نمودار نہ ہونے کی قسم کھائے بیٹھی ہے۔ مجال ہے جو ایک بھی گاڑی والا گزرا ہو۔'' اس نے کوفت سے سر جھٹکا۔ اس کوفت کا سبب سوچ سوچ کو وہ کھول رہی تھی۔ سراسر میری اپنی کوتاہی ہے۔

پیپر دے کر ٹھیک بارہ بجے ہال سے نکل کر وہ بس اسٹینڈ کی سمت ہی بڑھی تھی۔ بس نے ساڑھے بارہ بجے روانہ ہونا تھا۔ ان کے فائنل کے ایگزام ہو رہے تھے۔ باقی سب کلاسز کی چھٹیاں تھیں۔ سو سارے شہر کے اسٹاپ کی لڑکیوں کو پک اینڈ ڈراپ کرنے کی ذمہ داری ایک بس کے سپرد تھی۔ ابھی اسٹاف روم کے آگے سے گزر رہی تھی کہ مسز شمع انچارج یونین نے آواز دے کر بلا لیا۔ کانووکیشن کے

سلسلے میں اسے ممبران یونین کے فرائض کی لسٹ گنوانے لگیں۔ پھر دیگر تفصیلات میں وقت کٹنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ گلوخلاصی کر کے جب اسٹینڈ پر پہنچی تو بس نکل چکی تھی۔ سارے اسٹاپس سے ہو کر واپس آنے میں کم از کم سوا گھنٹہ ضرور درکار تھا۔ آسمان پر کالی بدلیاں نقش و نگار بنا رہی تھیں۔ غضب کا حبس تھا۔ پورا کالج سنسان پڑا تھا۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ بس ڈرائیور دوبارہ واپس آ کر نئے سرے سے ڈیوٹی بھگتانے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔ بہرحال اس کا کچھ قصور نہیں تھا۔ روانگی کا ٹائم فکس تھا۔ وہ رہ گئی تھی تو اپنی لاپروائی کے باعث۔

کچھ سوچ کر اس نے پبلک بس اسٹاپ کی سمت جانے کی ٹھان لی۔ ابھی راہ میں ہی تھی کہ بارش نے آن لیا۔ کوئی چارہ کار نہ پا کر مزید سفر ملتوی کرتے ہوئے سڑک کے کنارے ایک پیڑ تلے کھڑی ہو گئی۔ اردگرد وحشت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شفتل نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ دفعتاً ایک کرولا اس کے قریب آ رکی۔ فلمی سچویشن کے عین مطابق گاڑی والے نے تیزی سے پچھلا دروازہ کھول دیا۔

"آیئے۔" برستی بوچھاڑ میں وہ ہق دق کھڑی دیکھتی رہ گئی۔ "تشریف لائیے پلیز۔ اس طرح آپ کا یہاں کھڑا ہونا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔" شیشہ نیچے کرتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے اس پر اک نگاہ ڈال کر کہا تھا۔ لہجہ قطعی پن لیے ہوئے تھا۔ شفتل نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر بے اختیار اطمینان کی سانس لیتے ہوئے برق رفتاری سے اندر براجمان ہو گئی۔ یہ سامنے والا پڑوسی تھا۔ ربیعہ کا بھائی۔ شاہ بخت۔ اندر کے گرم خوشگوار ماحول میں اپنی الجھی الجھی لٹیں پیچھے کرتے ہوئے ایک لمحے کو خود پر نگاہ کی۔ ذہن میں شاہ بخت کا کہا ہوا فقرہ ٹکرایا اور وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ حقیقتاً بھی وہ سرتاپا شرابور تھی۔ سفید سوتی لباس بھیگ کر بدن سے چپک رہا تھا۔ بڑا سا کاٹن کا دوپٹا بھی گیلا ہو کر اپنا فرض نبھانے سے معذور ہو گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے سمٹ کر سامنے دیکھا۔ وہ باوقار سنجیدگی و متانت لیے نظریں ونڈ اسکرین پر جمائے ڈرائیونگ میں مگن تھا۔ ایک بار بھی بیک مرر اس پر فوکس کرنے کی کوشش نہیں کی۔

"آپ غالباً کالج سے آ رہی تھیں۔ مگر ربیعہ تو کہہ رہی تھی سمر ویکیشن ہیں آج کل۔" کافی دیر بعد اس نے سوال کیا۔ نظریں بدستور سامنے مرکوز تھیں۔ اس کا لہجہ بھاری اور گمبھیر سا تھا۔ اک عجیب دلکش سا جادو لیے ہوئے۔

"ہاں تھرڈ ایئر والوں کو بلکہ باقی سب کو چھٹیاں ہیں۔ میرے بی۔ ایس۔ سی کے ایگزام ہو رہے

ہیں فائنل۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔ اس نے بلا حیل و حجت۔ گاڑی میں سوار ہو کے بڑی ہمت دکھائی تھی اور اب سوچ رہی تھی کچھ ایسا غلط بھی نہیں کیا اندھا اعتماد کر کے۔ بے شک دوبدو کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی مگر ربیعہ کے مزاج اور طبیعت کو ملحوظ خاطر رکھ کر اس نے اس کے بھائی کی پیشکش قبول کی تھی۔ شاہ بخت نے مزید کوئی سوال نہیں پوچھا۔ آناً فاناً ایک خیال شفتل کے دماغ میں در آیا۔

"آپ کا کوئی رشتے دار نہیں ہے یہاں؟" اس نے طریقے سے بات شروع کی۔ "میرا مطلب ہے کوئی بزرگ شخصیت؟"

"نہیں۔" شاہ بخت نے قدرے حیران ہو کر جواب دیا۔ یہ سوال اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔

"اس کا مطلب ہے۔ ربیعہ کے سلسلے میں کوئی بات ہو تو براہ راست آپ سے کرنا ہو گی۔" اس نے کسی نتیجے پر پہنچ کر کہا۔

"ربیعہ کے سلسلے میں؟" وہ زور سے چونکا۔ "مگر کیا بات؟" اس کی حیرت حد سے سوا تھی۔

"کیا آپ نے ربیعہ کی شادی نہیں کرنی؟" اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال جڑ دیا۔

"اوہ۔ تو یہ بات ہے۔" وہ سمجھ گیا تھا۔ ٹیپو گویا اس کے تصور میں آ کھڑا ہوا۔

"یہیں روک دیجیے گا پلیز۔" گھر کے قریب کے مین روڈ پر اس نے بہ عجلت کہا۔ بریک لگاتے ہوئے شاہ بخت کے ہونٹوں پر اک پراسرار تبسم مچل اٹھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" اس کی مسکراہٹ کا مطلب اخذ کرتے ہوئے شفتل نے پورے اعتماد اور سنجیدگی سے کہا۔ "میری فیملی کو میرے کردار پر، میرے عمل پر میری شخصیت پر پورا بھروسا اور اعتبار ہے۔ مگر گلی کے گھروں کی کھلی کھڑکیوں سے جھانکتے ہر چہرے کو اعتبار نہ آپ دلا سکتے ہیں نہ میں۔" وہ گاڑی سے اتر گئی۔

"آپ کا بے حد شکریہ۔"

کہہ کر تیز تیز قدموں سے گلی میں داخل ہو گئی۔

اس سے بے خبر کہ دو نگاہیں اس کے ہر ہر قدم پر نثار ہو رہی تھیں۔ اس کے معدوم ہوتے سراپے کو اپنے اندر جذب کر رہی تھیں۔

"کس کا کارڈ ہے بھئی؟" ربیعہ کو سفید دعوتی کارڈ الٹ پلٹ کرتے دیکھ کر شاہ بخت نے دریافت کیا۔

''نشاط منزل سے آیا ہے۔'' وہ کارڈ کی عبارت پڑھ رہی تھی۔ ''اور جناب بہ سلسلہ شادی خانہ آبادی دختر نیک اختر آنسہ شفتل آفریدی کی۔'' وہ خوشگوار انداز میں بتا رہی تھی۔ ''زبردست بہت لطف آئے گا اتنے عرصے بعد۔'' مسکراتی نگاہ بھائی پر ڈال کر تائید حاصل کرنا چاہی تو حیران رہ گئی۔ شاہ بخت کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں اک بے چینی سی' بے کلی سی وحشت بھر گئی تھی۔

''کیا ہوا بھائی جان۔ خیریت؟' اس کا بازو تھام کر ربیعہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''آں۔ ہاں۔ خیریت ہی ہے۔'' اس کا لہجہ بہت پژمردہ اور تھکا تھکا سا تھا۔ جانے کس بار گراں نے اسے اتنا نڈھال کر دیا تھا۔ ربیعہ کچھ بھی اخذ نہ کر پائی۔

''وہ آپ پرسوں کہہ رہے تھے' ایک خوبصورت سی مزے کی بات بتائیں گے؟'' ربیعہ نے بھائی کی آشفتگی شگفتگی میں بدلنے کے لیے موضوع سخن بدل ڈالا۔

''یونہی کہا تھا۔'' اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں دھیرے سے کہا۔ ''اب وہ خوبصورت مزے کی بات زہریلے بگولوں تلے مدفون ہو گئی ہے۔ اب تو صرف دل کو یہ سمجھانا باقی ہے کہ۔

وہ ترے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پر برس گئیں
دل بے خبر میری بات سن اسے بھول جا' اسے بھول جا

وہ بڑی تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ ربیعہ بحر حیرت میں غوطہ زن ہلتے پردے کو دیکھتی رہ گئی۔

''انہیں کیا ہوا؟'' اس کے دل میں کھد بد ہو رہی تھی۔ ''کہیں یہ شادی۔ تو۔ اوہ۔'' وہ اپنی نکتہ رسائی پر خود ہی انگشت بدنداں رہ گئی۔ انتہا کو چھوتا تحیر رفتہ رفتہ مدھم پڑتا گیا۔ سارے الجھے ریشم ایک ایک کر کے کھلتے چلے گئے۔

📖

شادی کے بعد عورت جسمانی لحاظ سے تو بدلتی ہی ہے ذہنی اور شخصی لحاظ سے بھی بدل جاتی ہے۔
بلند بانگ قہقہے شادی کے بعد ہنسی میں بدل جاتے ہیں۔
ہنسی مسکراہٹ میں ڈھل جاتی ہے۔
مسکراہٹ اک خوشگوار تاثر میں سمٹ جاتی ہے۔
اور خوشگوار تاثر محض سر ہلا کر اثبات و نفی میں جواب دینے کی حد تک محدود ہو جاتا ہے۔
شاید ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا اور حد درجہ محتاط روی کا مظاہرہ کرنا ہی نئی نویلی دلہن کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے والدین کی تربیت' عزیزوں کی پیار بھری تنبیہ اور خاندان کا وقار'

ـت آبرو کا احساس جاگزیں ہوتا ہے۔ لڑکی کا تجربہ اور عمر چاہے کتنی ہی محدود کیوں نہ ہو' شادی کے ـر وہ خود بخود نصاب زندگی پڑھ لیتی ہے۔

شادی کے اس بندھن میں دونوں فریق ایک دوسرے کی آسودگی اور تکمیل کے ضامن ٹھہرتے ـں۔ تکمیل کا یہ فطری ربط تو ان کے مابین بھی استوار ہو چکا تھا مگر آسودگی...... آسودگی شاید دونوں میں ـسے کسی کے نصیب کے افق پر نہیں جگمگائی تھی۔ جانے اس میں کس کا دوش تھا۔ اک تکلف اک ـلریز' اک سپاٹ اونچی دیواری حائل محسوس ہوتی تھی دونوں کے بیچ۔ بہر حال شفتل کافی حد تک مطمئن ـھی۔ اس نے تو یوں بھی کوئی ہوش ربا گلستانِ تخیل نہیں سجایا تھا۔ بااعتبار ہو' نکتہ رس ہو اور دوستانہ ـپنائیت سے پیش آئے۔

''آپ کے لیے چائے لاؤں وقار؟'' وہ اندر داخل ہوتے ہوئے خوشگوار سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔ وقار نے سر اٹھا کر بغور اس کا چہرہ ٹٹولا۔

''نہیں۔'' آہستگی سے کہہ کر وہ اخبار میں گم ہو گیا تھا۔ اس سے قطعی بے نیاز کہ اس کے بیڈروم کے رومان پرور ماحول میں اک رنگین وجود کا اضافہ ہو چکا ہے۔ وہ دھیرج سے قدم اٹھاتی اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ وقار نے نگاہ اٹھا کر ناگواری سے دیکھا البتہ بولا کچھ نہیں۔ شیشے کی رنگین چوڑیوں کی جھنکار یہاں سے وہاں فضا میں کھنک اٹھی تھی۔

''چھوڑیے بھی۔ اتنے آفت موسم میں کس بور کام میں لگے ہوئے ہیں۔ آیئے گھومنے چلیں۔ میں نے تو ابھی تک باہر سے کوئٹہ دیکھا بھی نہیں۔'' ناز بھری ادا سے اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر شفتل نے مسکرا کر کہا۔

وقار نے ایک سنگین برفاب نگاہ اس پر ڈالی۔

''میں اپنی ذاتیات میں دخل اندازی پسند نہیں کرتا۔'' سرد لہجے میں اک بے رحم سی تنبیہ چھپی ہوئی تھی اس نے پھر سے اخبار پھیلا کر پڑھنا شروع کر دیا۔

شفتل اپنی اہانت پر ایک لمحے کو دم بخود رہ گئی۔ سراسیمہ ہو کر ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ دو پیسے کے کاغذ کے ٹکڑے کے آگے اس کی لاکھوں کروڑوں کی بے بہا نادر ہستی اس کے نزدیک گویا دو کوڑی کی حیثیت بھی نہ رکھتی تھی۔ اس کی انا پر کاری ضرب پڑی۔ کچھ سوچ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

رات گئے شب کے تاریک سناٹے میں جب دو بازو فطری جذبوں سے مغلوب ہو کر اس کا کومل گداز لطیف وجود اپنے حصار میں لینے کو بڑھے تو وہ شکوہ کیے بنا نہ رہ سکی۔

"یاد ہے' آپ نے دوپہر کو کس بری طرح مجھے ہرٹ کیا تھا۔ بہت سنگدل ہیں آپ!"

"تمہارا ہی ہوں اب تو۔ صحیح کر لینا۔" اس نے مدہوش سے لہجے میں سرگوشی کی تھی۔ شفتل کا انگ انگ سرشار ہو گیا۔

"واہ بھیا! دلہن سے تو خیر کیا شکایت ہے۔ تم بھی ماں کو بھول گئے شادی کے بعد؟" طنزیہ ہنسی لیے تائی نے دریافت کیا تھا۔ شفتل ایک لمحے کو چور سی بن گئی۔

"کیا بات کرتی ہیں امی! مجھ سے یہ توقع ہے آپ کو؟" وہ ماں کے گرد بازو کا حصار باندھتے قطعیت سے بولا۔ "اور ہاں ڈاکٹر کے ہاں گئی تھیں آپ؟"

"تو میری فکر میں نہ گھلا کر میرے چاند۔" ممتا کا لاڈ پیار گویا ابل کر بہنے لگا۔

"اس گھر میں عورت عزت و توجہ کی حقدار ہے تو پہلے میری ماں اور بہن ہیں۔ میں ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی برداشت نہیں کر سکتا۔ سمجھیں تم!" کمرے میں آ کر وہ شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

"تو میں نے کیا کیا ہے؟" وہ ہکا بکا رہ گئی۔ "مجھ پر خفا کیوں ہو رہے ہیں۔ میں تو خود ان کا بہت احترام کرتی ہوں۔ ہمیں تو شروع سے ہی امی' پاپا نے یہ بات عملی طور پر سمجھا دی تھی۔"

"آئی نو اٹ ویل!" وہ لفظ چبا چبا کر بولا۔ "میری ماں کا جو احترام تمہارے گھر میں تم سمیت تمہاری فیملی نے پیش کیا تھا وہ میرے حافظے میں محفوظ ہے۔" وہ بہت تلخ ہو رہا تھا۔

"چھوڑیے بھی۔ کیا بیکار کی باتیں لے بیٹھے۔ آفس کو دیر ہو رہی ہے۔" اس نے ماحول کا تناؤ دور کرنے کے لیے بات بدل ڈالی۔

"بیکار باتیں نہیں ہیں یہ۔" وہ سختی سے بولا۔ "بلکہ کان کھول کر سن لو۔ امی کے حضور کی گئی تمہاری ایک معمولی گستاخی پر میں تمہاری جان لینے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔"

شفتل سن سی کھڑی رہ گئی۔ جانے کیوں ماں کے معاملے میں وہ اتنا حساس تھا۔ بھلا یہ کوئی بات تھی۔ ہو کیا جاتا ہے انہیں؟ وہ اس کے رنگ بدلتے رویوں پر ششدر تھی۔

"ادھر آؤ عاشی! میرے پاس۔" شفتل نے نرمی سے پکارا۔ "یہاں بیٹھو۔" اس نے پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔

"یہ کیا مجہول سا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے۔ ہیں؟" اس نے سرتا پا بدرنگ سی مٹیالے رنگ کی چادر اور ب وغریب طرز کے کرتے شلوار میں ملبوس ہونق بنی عاشی کو دیکھا جو حسب معمول اس کی توجہ اور نرم تاری کے آگے حواس باختہ ہوئی جا رہی تھی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں' بھنویں احمقانہ انداز ں اچکائے' نروس سی پلکیں جھپکاتے اپنی طرف سے بہت اعتماد اور سکون کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ لاہٹ چھپانے کے لیے ہاتھ کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ شفتل کو اس پر بڑا ترس آتا۔ وہ اس کا مسئلہ ھ گئی تھی۔ شاید اب تک کسی نے موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اسے اپنی شخصیت اجاگر کرنے' آگے بڑھ کر ل کرنے اور اپنی آنکھوں سے دنیا کو دیکھنے کا۔

اسے اس بابت خبر نہ تھی کہ اس کی ہم عمر لڑکیاں کیسا طرز عمل اپناتی ہیں۔ کیسے رہتی ہیں۔ کیسے خواب ھتی ہیں۔ (اس کام کے لیے اس کی اماں جو بہت تھیں) یہی وجہ تھی کہ وہ "لڑکیوں" سے میل ملاپ ے دوران بھی اس طرح گھبرا جاتی تھی جیسے اس کے مخاطب بھاری بھرکم مردانہ شخصیات ہوں۔ شفتل ل ہی دل میں خاصی حیران اور فکرمند بھی تھی۔

"ارے کیسے گزرے گی بھئی تمہاری آگے جا کے؟ کیسی لڑکی ہو۔ نہ تمہارے پاس پڑوس میں کوئی ھی سہیلی ہے۔ نہ اپنے عزیز و اقارب سے گھلتی ملتی ہو۔ نہ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ طریقہ ہے۔ یار! یہ تو مہارے لیے بہت نقصان دہ ہے۔"

اس کا ہاتھ تھامے وہ سچائی بے نقاب کر رہی تھی۔

"دیکھو اپنے اندر دوسروں کا سامنا کرنے کی جرأت بیدار کرو۔ خداوند قدوس نے تمہیں گویائی دی ہے۔ ایک نعمت عظمیٰ عطا فرمائی ہے۔ بھئی اس کو خوبصورتی سے' نزاکت و لطافت اور اعتماد سے بروئے کار لاؤ۔ یقین مانو انسان محض لہجے' آنکھوں اور انداز کے اعتماد سے سو بندوں کو جیت سکتا ہے۔"

"رہنے دو بی بی! ہمیں اپنی بیٹی کو منہ پھٹ اور بے لگام نہیں بنانا۔ تم یہ سبق اپنے بہن بھائیوں کے لیے ہی رکھ چھوڑو تو ہم پر کرم ہوگا۔"

تائی کی ناراض ناراض آواز پر شفتل حیرت سے بت بن گئی۔ وہ تو بہت خلوص سے' دردمندی سے سمجھا رہی تھی۔ اسے زندگی کے رنگ ڈھنگ نشیب و فراز سے آگاہ کر رہی تھی بلکہ دل میں اس کی شخصیت بنانے کا عزم صمیم باندھے بیٹھی تھی اور "بہن بھائیوں کے لیے رکھ چھوڑو" اس طنزیہ فقرے پر وہ ششدر رہ گئی۔

کیا یہ وہی تائی ہیں جو دن رات ہمیں اپنے زریں اعزازات سے نوازا کرتی تھیں؟

''ہاں بھئی شاباش آدمی کو اسی طرح بن سنور کے نک سک سے ٹپ ٹاپ سے رہنا چاہیے۔''

''بھئی یہ کون سا ہیر اسٹائل ہے۔ یہ کچھ سوٹ نہیں کر رہا تم پر۔ میری مانو چلو میرے ساتھ ''بیاٹی پارلر'' میں تمہارا بودا بنوا کر لاتی ہوں۔'' وہ بڑے خلوص' بڑی دردمندانہ رازداری سے مشورہ و تبصرہ نشر کرتیں۔

اسے کیا کہا جاتا ہے ''چراغ تلے اندھیرا'' یا پھر' یہ بات اس کے حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔

''تائی! میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ اسے اللہ رکھے بھرے پرے گھر میں جانا ہے' بہت سے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ ہر رنگ کا' ہر طرز کا ہر مزاج کا بندہ وہاں ہوگا۔ اگر یہی حال رہا تو اس کے لیے بہت مسئلہ ہو جائے گا۔'' اس نے بڑے سلیقے سے پراعتماد انداز میں وضاحت کی۔ اسی دم دروازے پر نگاہ پڑی وہ اضطراری کیفیت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانے کب سے کھڑا تھا وہ۔

''پہلے تو تم مجھے یہ بتاؤ۔ ابھی چند دن پہلے میں نے کیا کہا تھا تم سے۔ یاد ہے؟'' وہ اندر آ گیا۔ بڑے خطرناک تیور لیے۔ شفتل اندر ہی اندر کانپ سی گئی۔

''وقار! میں نے ان کے حضور کوئی گستاخی نہیں کی اور نہ ہی ایسا سوچ سکتی ہوں۔'' اس نے اپنی بدحواسی پر قابو پاتے ہوئے سنبھل کر کہا۔ (میں نے کیا کیا ہے' جو خوف زدہ ہو رہی ہوں)

''ناں بھئی! تم اپنا علم اپنے پاس تالے میں بند کر کے رکھو۔ ہم جیسے جاہل' پاگل ہیں' ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو۔'' بیٹے کی مضبوط قلعے جیسی ہستی کے ہوتے ہوئے انہیں کاہے کی جھجک' غم۔ لاجواب کر دیے جانے کا خدشہ ہوتا۔ بڑے جتانے والے انداز میں بظاہر بہت انکساری سے بولیں۔ لہجے کا تجاہل عروج پر تھا۔ جانتی تھیں اب بیٹا غضب کے آسمان سے جا ٹکرائے گا اور ہوا بھی یہی۔ وہ بلا کے غضب ناک تاثرات سمیت اس کی سمت بڑھا تھا۔

''تم ہمارا مذاق اڑاتی ہو۔ بڑا گمان ہے تمہیں اپنی اعلا تعلیم کا۔ شہری طرزِ زندگی کا۔ تہذیب وتمدن؟'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا قریب آیا اور دوسرے لمحے شفتل کے رخسار پر بھرپور طمانچہ اپنا نشان چھوڑ گیا۔

''ارے کیوں الجھ پڑے تم۔'' تائی آگ لگا کے تماشا دیکھ کے گویا اب مطمئن ہو گئی تھیں۔ بڑی ہمدردی اور جیسے کسی قدر خفگی سے بیٹے کو لتاڑا۔ پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''چھوڑو بیٹی! آؤ اندر اب۔ تم بھی ذرا زبان قابو میں رکھا کرو۔ مرد کے آگے اونچی آواز میں بات نہیں کرتے۔ اس کی مردانگی اور غرور پہ ضرب پڑتی ہے۔ غالباً یہ تمہاری امی نے نہیں بتایا تمہیں!''

جب نیت کھری ہو۔ شعور ولاشعور دونوں آمادگی و سپردگی سے وجدان کا لائحہ عمل تسلیم کر لیں۔

دل کا تھال سچائی وسادگی کے موتیوں سے بھرا ہو۔ ہر ہر جنبش' ہر ہر ادا' ہر سانس پاکیزگی' سنجیدگی شگفتگی کا مظہر ہو۔

احترامِ انسانیت' تقاضائے بشریت' رضائے الٰہی کے زرّیں اسرار و رموز' اصول وضوابط پالنے ے ممتا کی آغوش اور پدرانہ شفقت نے ازبر کرا دیے ہوں۔

ایسے خود اعتماد' وسیع القلب' شریف النفس' شانِ استغنائی رکھنے والے وجود پہ کیا گزرتی ہے جب سر سے پیر تک بدگمانی کے چھینٹوں سے نہلا دیا جاتا ہے۔ جب اس کی روح کانٹوں میں رگیدی جاتی ہے۔

بنا قصور' بلاجواز' بغیر وضاحت کے۔

شفتل پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا تھا جہاں وہ حد درجہ رنجیدہ تھی۔ وہاں بے انتہا متعجب بھی تھی۔ اسے ران کا کسی زمانے میں کیا گیا بے لاگ تبصرہ یاد آ گیا۔ ''مجھے تو یہ مینٹل ہاسپٹل سے بھاگی ہوئی کوئی بلی لگتی ہے۔''

شفتل کو چار ماہ ہو چلے تھے اس خاندان میں شرعی طور پر ضم ہوئے مگر ربط' میل جول' بے تکلفی' ہم ہنگی' ذہنی قربت ہر محاذ پر اسے پسپا ہونا پڑا تھا۔ فیملی کے دیگر ارکان سے تو خیر کیا واقفیت ہوتی اسے تو پنے سر کے سائیں کی بھی خاک سمجھ نہ آئی تھی۔ وہی اس کے پلے نہ پڑا تھا جانے کہاں کہاں کی' کب کی بیزاریاں' تلخیوں اور انتقام میں گندھ گیا تھا وقار کا وجود۔ بسا اوقات شفتل کو تعجب ہوتا کیا یہ شخص حسِ طیف سے قطعی کورا ہے؟

چوڑیوں کی مدھر جھنکار' لہجے کا لوچ دار ریشم' نگاہ کی خفیف بجلیاں' لطافت و نزاکت' نزہت و شگفتگی سے گندھا سراپا' کھلکھلاتا وارفتہ و پیوستہ پرسکون انداز' ہر ہر ادا سے ٹپکتا وفا و ایقان کا مظہر منہ بولتا ثبوت۔ کچھ بھی تو اس کے پتھریلے اعصاب پر جھرنے نہیں بہاتا تھا۔

کیسا شخص تھا وہ۔ الجھا الجھا۔ بکھرا ٹوٹا' خود سے خفا۔ سارے زمانے سے خوف زدہ۔ اس خوف اور سراسیمگی کو بظاہر اس نے بلند گرجدار آواز اور سنگین و سرد تاثرات تلے چھپا لیا تھا۔ خود پہ ماسک چڑھا لیا تھا۔

مگر وہ راز پا گئی تھی اور غالباً یہی وقار کی آسمان تک اونچی انا کے لیے تازیانہ تھا۔

''کیسی بستی ہے یہ۔'' لان کے گھپ اندھیرے میں بیٹھی وہ ادھر ادھر بھاگتی دوڑتی' آزادی سے

ڈیرہ جماتی ظلمت اور خامشی سے پوچھ رہی تھی۔

بصارتوں کے یقین سے عاری۔ ساعتوں کی لغزشوں پہ قیامت کا اعتبار رکھنے والی۔ پریشان حال' خود اپنا پتا ڈھونڈتی ہوئی' حواس باختہ' چلمن سے لگی۔ نقابوں میں بند' انا کے گھوڑے پر سوار ہو کے اپنی ہستی مٹا ڈالنے والی۔

"خالہ! میں پچھلے چھ ماہ سے عذاب جھیل رہی ہوں۔ اب تھک ہار کے آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ تو حسین فیملی کے شبستان کے رموز سے بھی آگاہ ہوں گی۔ کچھ بتلایئے مجھے۔ کوئی جگنو' کوئی تتلی' کوئی رستہ۔ کچھ تو بہر رہنمائی عطا کیجیے۔" اس نے دل کھول دیا تھا۔

حاجرہ خالہ تائی کے عزیزوں میں سے تھیں۔ روز کا آنا جانا لگا رہتا۔ ایک یہی واحد ہستی تھی جو شفتل کو بہت با اعتبار اور شعور و فہم کے زیور سے آراستہ محسوس ہوتی۔ قریبی اسکول میں سیکنڈ ہیڈ مسٹریس بھی تھیں۔ یقیناً کوئی شطرنج کا مہرہ اس کی جیت کے لیے منتخب کرنے کا مشورہ دے سکتی تھیں۔ سو وہ عرض مدعا لے کر ان کے گھر آئی تھی۔ صاف صاف سب کچھ بتلا دیا تھا۔

"جو کچھ ان کے ساتھ ہوا اس واقعے کا جوابی ردعمل یہی ہونا تھا۔ یہ بات باعث تعجب نہیں ہونا تھی اگر یہ اس کے خوگر نہ ہو جاتے۔" حاجرہ خالہ نے بہت سکون سے کہنا شروع کیا۔ شفتل نے الجھن بھری نظروں سے انہیں دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔

"سیدھی سی بات ہے بیٹا! جو شخص ساری عمر پانی کی ایک ایک بوند کے لیے ہزار بار ترسا ہو اس کے سامنے یکا یک میٹھے دودھ کی نہریں رواں ہو جائیں تو کیا آپ اس سے صبر و شکیب' ضبط و قرار' حوصلگی کی توقع کر سکتے ہیں۔ صغریٰ آپا نے ساری عمر اپنی ہستی ثابت کرنے میں پھونک ڈالی۔ میاں کے دل میں گھر کرنے' اس کے گھر میں جگہ بنانے' ساس کی سیوا کر کے قدم جمانے اور نندوں کی خوشامد سے ماحول بنانے میں راکھ ہو گئیں۔ تمہیں خبر ہے تمہارے تایا مرحوم کسی فلمی پری سے شادی کے زبردست خواہش مند تھے۔" خالہ نے اپنی دانست میں دھماکا کیا۔

"نہیں۔" وہ اچھل پڑی۔ "کہاں تایا۔ کہاں یہ مقام اللہ اللہ۔" وہ منہ کھولے حیرانی سے خالہ کا منہ تکنے لگی۔

"پھر کیا ہوا خالہ؟" تجسس اور معاملے کی پراسراریت نے اسے اپنا مسئلہ بھلا دیا تھا۔

"پھر یہ کہ حسین بھائی کی ماں نے وہی روایتی دھمکی دی کہ ان کی منتخب کردہ لڑکی رد کر کے کہیں اد

ا تو کچھ کھا کے مر جاؤں گی اور تمہارے سر چڑھے گی میری موت۔ انہوں نے گھبرا کر ہتھیار ڈال ، اور صغریٰ آپا کو بیاہ لائے مگر انسانی دل ایسی تاویلوں سے کب بہلتا ہے۔ دونوں کے درمیان لوں کو تعلیم اور جہالت کے فرق نے مزید تان کر ناقابل عبور بنا دیا۔ حسین بھائی اپنے زمانے کے ے عالم فاضل لائق فائق تھے جب کہ صغریٰ آپا اپنا نام لکھنے پڑھنے کی حد تک بھی تعلیم سے کوری ں۔ حسین بھائی نے ڈاکٹریٹ کی ہوئی تھی۔

تم یقین نہیں کرو گی' پورے دو سال تک انہوں نے محاورتاً بھی صغریٰ آپا کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

شفتل کا مارے حیرت کے دل بند ہونے لگا۔ کیسے کیسے انکشافات ہو رہے تھے۔

"کیا تائی شروع سے ہی ایسی تھیں۔ میرا مطلب ہے اتنی ماڈرن اور......" شفتل نے بے تابی ے سوال داغا۔

"ارے نہیں۔ کہاں بھلا۔" خالہ نے پرزور لہجے میں تردید کی۔ "ان کو تو ہم چھوئی موئی اور بی بکل ے نام سے چھیڑا کرتے تھے۔ جس طرح کی عائشہ نہیں ہے۔ ہو بہو صغریٰ آپا اسی کی تصویر تھیں۔ ڑے سے مسکینی' مظلومیت اور بدحواسی کے تاثرات اس طرح ٹپک ٹپک کر مخاطب کے قلب پر وار رتے کہ وہ بے ساختہ جیب میں ہاتھ ڈال کر امداد پر مائل ہو جائے۔ حسین بھائی ان کی شخصیت پر دل ھول کے طنز کے تیر چلاتے۔ جھنجلا جھنجلا کر' آگ بگولہ ہو کر انہیں زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ونے کو کہتے مگر وہ بے چاری کیا کرتیں' انہیں گائیڈ کرنے کو کون بیٹھا تھا۔

اور جو تضحیک آمیز انداز میں بدلنے پر اصرار کرتا وہ خود اپنی طرف سے کوئی رہنما دریچہ وا نہ کرتا۔ نتیجتاً انہیں خوش رکھنے اور آسودگی فراہم کرنے کے لیے صغریٰ بھابی خود کو مزید ذرہ خاک بناتی گئیں۔ لجاجت سے' وحشت زدہ ہو کر' منت سماجت سے' قدموں میں لوٹ کر' ہر طرح پیامن بھانے کی سعی کرتیں۔ حسین بھائی جیسا لطیف و پرکیف حسن جمال رکھنے والا مہذب طرح دار اعلا تعلیم یافتہ بندہ مزید چڑتا۔ ان پر برستا' کھولتا۔

گھر میں دوست احباب کی گھریلو محفل جمتی تو بھابی کو بی ہیو کرنے کا ڈھنگ نہ آتا۔

باہر ہمراہ لے کر جاتے تو اپنی گھبراہٹ کے سبب مضحکہ خیز حرکت کر بیٹھتیں۔

گھر آئے مہمان سے خوش آمدیدی الفاظ کہتے پسینوں میں نہا جاتیں۔

کسی کے روبرو عرض مدعا کا ہنر تعلیم کی کمی نے نہ بخشا۔ ماں ان کی پیدائش کے وقت ہی فوت ہو گئی تھی۔ ساس خود ان پڑھ تھیں' وہ پڑھے لکھے' اونچی ناک والے تیز غصے والے بیٹے کے قلبی مطالبات

خصوصاً بیوی کے واسطے کیا جان پاتیں۔ صغریٰ آپا کی زندگی کی رہی سہی خوشیاں بھی تذلیل و توہین کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتی چلی گئیں۔ کیونکہ حسین بھائی کے ضبط کا پیمانہ رفتہ رفتہ چھلکنے لگا تھا۔ سرعام ان کی کوتاہی پر برہمی کا مظاہرہ کرتے۔ بھری محفل میں ان کی انا کے آبگینے چکنا چور کر دیتے۔ چند جذباتی وفطری تقاضوں کے نتیجے میں اولاد کا سکھ صغریٰ آپا کی محروم جھولی میں آن پڑا، مگر حسین بھائی قطعی بے نیاز رہے۔

ان کی نازک مزاجی کے سبب آخر دم تک صغریٰ آپا ان کے معیار پر پورا نہ اتر سکیں۔ اولاد نے بارہا اپنی آنکھوں کے سامنے باپ کے گرجتے برستے تیور اور جواب میں مظلوم ماں کے اشک ندامت بہتے دیکھے۔ فطری بات تھی۔ اولاد ماں سے زیادہ قریب ہوتی گئی۔ لڑکوں کی تعلیم و تربیت میں تو شاید حسین بھائی نے کچھ دلچسپی دکھائی تھی مگر لڑکی سے قطعی بیگانہ رہے۔ شاید اس کی صورت میں انہیں صغریٰ آپا جھلکتی محسوس ہوتی تھیں۔ نتیجتاً عاشی کی جیسے ان سے بن پڑا اپنی فطرت کے مطابق شخصیت بنا دی۔ میٹرک پرائیویٹ کرایا کہ صغریٰ آپا کا خیال تھا زمانے کی ہوا ان کی بچی کو بگاڑ دے گی۔ پھر ستم تو یہ تھا کہ اس سانحے کی مجرم بھی ان کی اپنی ہستی ٹھہرائی جاتی۔ حسین بھائی نے کبھی توجہ نہیں دی، مڑ کر نہیں دیکھا کہ اولاد کس حال میں ہے اور اس پر گھریلو چپقلش کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ آج ان کی اولاد جو ٹوٹی پھوٹی شخصیتوں کی مالک ہے تو اس کا سارا دوش میاں بیوی کے ازدواجی غیریت سے لبریز تعلقات کو جاتا ہے۔" حاجرہ خالہ تواتر سے بولتی ہوئی سانس لینے کو رکیں۔

ایک ایک کر کے ساری الجھی گرہیں کھلتی جا رہی تھیں۔

"پھر یہ یکایک تبدیلی کیوں آئی تائی کے مزاج میں؟" وہ بے چینی سے مٹھیاں بھینچ کر پوچھ رہی تھی۔

"صغریٰ آپا نے ساری عمر دب کر گزاری۔ اپنی انا کو کچل کر، اپنی ذات کو ذلیل کر کے، خود کو پستیوں میں دفن کر کے بالآخر تمہارے تایا کے "مطلوبہ معیار" تک پہنچنے کا راستہ انہیں مل ہی گیا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ حسین بھائی کے انتقال کے بعد وہ گویا ایک طویل مدت کی محرومی، محکومی اور جبر و اذیت کے حصار سے آزاد ہوئی تھیں وہ بھی اور ان کی اولاد بھی۔ حسین بھائی نے زندگی بھر انہیں مان، اعتماد اور بھرپور استحقاق سے اپنے ساتھ ساتھ اپنے گھر کے کسی اختیار کو بھی برتنے کا حق نہیں دیا تھا۔ ان کی نظر میں صغریٰ آپا کم عقل، جاہل اور احمق خاتون تھیں۔ اب جب آزادی نصیب ہوئی تو غیر ارادی طور پر ان میں خود کو منوانے، اپنی شخصیت میں "نکھار" پیدا کرنے کا خیال آیا۔ زندگی میں نہ سہی موت

بعد سہی، وہ شوہر کے "مطلوبہ معیار" تک پہنچ گئی تھیں۔ پھر وہ انسان تھیں، انسان وہ جو بے توقیری کی ن پہنائیوں میں بھی اپنی ساکھ برقرار رکھنے کا احساس پیدا کیے رکھتا ہے۔

پس اپنی خودی، اپنی ذات کا غرور بحال کرنے کے لیے اولاد سمیت وہ اوٹنگے بوٹنگے احمقانہ طرزِ اور مضحکہ خیز قدم اٹھانے لگیں۔ اب ان کی آواز محض اپنی نگاہ کی کڑکتی بجلیوں سے دبا دینے والا ئی نہیں تھا۔ اب انہیں ہر قدم پر شرمندگی و خجالت سے دوچار کرنے والا موجود نہیں تھا۔ اندر سے اٹھتی ین آمیز صداؤں سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ اندھا دھند ہر وہ روش اپنانے لگیں جو ان کے خیال بساط کے مطابق انہیں ٹھکرائے جانے اور محروم رکھنے کا سبب بنی تھی۔ ماں اپنی انا کے جنگلوں میں لکنے لگی اور اولاد اپنے من چاہے رستوں پر گامزن ہو گئی۔"

خالہ نے مفصل تمام حالات کہہ سنائے۔ شفقل نے طویل سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا

وقار کے اس سے اتنے بے زار اور بے اعتنا رویے کا سبب سمجھ میں آ گیا۔ وہ درپردہ اس کی شخصیت ی چمکتی دمکتی روشن ضیاء پاش اعتماد کی کرنوں اس کے بے ساختہ و بے پروا انداز اور اس کے سادہ و شگفتہ رزِ عمل سے مرعوب تھا۔ شفقل کی بھرپور آراستہ شخصیت اسے کم مائیگی اور محرومی کا چبھتا ہوا احساس لاتی تھی۔

جب وہ اس سے نرمی کا برتاؤ کرتا اسے اپنے باپ کا ماں سے طرزِ عمل یاد آ جاتا۔ ماں کی بے توقیری اور تذلیل کنپٹیوں میں آگ بھر دیتی۔ اپنے حقیقی جذبات کو پس پشت ڈالنے پر مجبور کر دیتی۔

اور تائی کا رویہ اتنا مخاصمانہ کیوں تھا یہ بھی شفقل پر کھل گیا۔ انہوں نے اتنی ترسی ہوئی، اتنی محروم محبت و توجہ سے خالی زندگی بسر کی تھی۔ اب وہ اپنے سامنے ایک آسودہ، مطمئن، پراعتماد، جیت کا زعم لیے عورت کو برداشت کرنے کی ہمت نہ پاتی تھیں۔ ہر آن اذیت میں رہتیں کہ اگر وہ بھی ایسا ہی طرزِ عمل اپنا لیتیں تو سرکا سائیں آخری لمحے تک ان سے ناخوش اور بے زار ہرگز نہ رہتا۔ انہیں شفقل کی شخصیت بہت چھائی ہوئی، بہت بھرپور محسوس ہوتی اور انہیں یاد آ جاتا وہی منظر جب جب تایا کے مہمان دوستوں کی بیویاں بھی اسی طرح لطافت و نزاکت اور مہذبانہ لطیف لب و لہجے کا مظاہرہ کر کے اپنے میاں کے احباب سے توصیف و ستائش وصول کرتیں اور خود وہ ہونق بنی ڈری سہی بوکھلائی ہوئی میاں کی برہمی طبع کا باعث بنتیں۔

شفقتل کے وجود میں ایک نیا عزم حلول ہوگیا۔ اس خاندان کو اپنی شناخت لوٹانے کا۔ خود شناسی کا ہنر سکھانے کا۔ وہ بڑے مستحکم قدموں سے خالہ کے گھر سے روانہ ہوئی تھی۔

"افوہ وقار! بھئی اب چھوڑ بھی دیں پیچھا اس کتاب کا۔" بڑے دلنشین تبسم سے اس نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ وقار نے ماتھے پر بل ڈال کر بھنویں اچکاتے ہوئے سرد نظروں سے اسے دیکھا اور پھر بے زاری سے سر جھٹک کر اپنے سابقہ کام میں مشغول ہوگیا۔ شفقتل کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے قریب آئی اور بڑے دلفریب انداز میں سر کو خم دے کر بولی۔

"اونہہ! کیا سمجھتے ہیں صاحب! ناک بھوں چڑھا کے' منہ سجا کے' ماتھے پہ لکیریں ڈال کے آدمی بہت حسین لگتا ہے۔"

اس نے وقار کی پیشانی پر گرے بال نزاکت سے اپنی مخروطی انگلیوں سے پرے کیے۔ اک ایسا لطیف سا عمل تھا' جو پتھر میں شگاف ڈال دیتا مگر شاید وقار حسین پتھر سے بھی کچھ آگے کی چیز تھا جس پر اس قسم کی لطیف و پرکیف شوخیوں کا مطلق اثر نہیں ہوتا تھا۔

"مانا کہ غصے کا مونوگرام رخ مبارک پر سجانا آپ کے لیے بے حد ضروری ہے مگر آپ کوشش تو کر سکتے ہیں ہنسنا' مسکرانا کچھ ایسا دقیق اور پیچیدہ عمل بھی نہیں ہے۔ آخر انسان ہی اسے سرانجام دیتے ہیں۔ یقین نہیں آتا تو میری طرف دیکھ لیجیے بلکہ مجھ سے سیکھ لیں۔ دیکھیں یوں۔" شرارت سے جگمگاتی خوب صورت آنکھیں لیے بڑے شریر سے انداز میں اس نے اپنے گلابی لب پھیلائے تھے۔

دوسرے ہی لمحے ایک بھرپور طمانچہ اس کے منہ پر پڑا۔

"بازاری عورتوں کی طرح میرے سامنے فنکاری دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سمجھیں!" وہ غرا کر بولا تھا۔ شفقتل نے سائیں سائیں کرتے کانوں پر سے بال ہٹاتے ہوئے تمتماتا گال سہلایا۔ نہیں۔ یہی وقت تو امتحان کا ہے۔

"وقار!" بڑی جسارت سے اس نے وقار کا بازو تھام لیا اور بڑے عام سے انداز میں مسکرا کر بولی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ "اٹ از ناٹ فیئر۔ ہے ناں۔ دیکھیں جب میاں بیوی میں نوبت مار پیٹ اور تشدد تک پہنچ جاتی ہے تو رشتے کا سارا حسن' ساری نزاکت تباہ ہوجاتی ہے۔ حاکم محکوم کا تعلق استوار ہو جاتا ہے جب کہ شوہر اور بیوی کے درمیان اک دوستانہ سا' بااعتبار اور محترم سا بے تکلف سا ربط رہنا چاہیے...... اسی خصوصیت کے حامل شادی شدہ جوڑے کو "کامیاب" اور "سرخرو" قرار دیا جاتا ہے۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ......"

"میں نہیں چاہتا کچھ۔ دفع ہوجاؤ تم یہاں سے۔" وہ ہانپ کر بولا اور اپنے آپ کو چھڑاتا دوسری طرف مڑ گیا۔

شفقتل کے لطیف احساسات کو بڑے زور کا دھچکا لگا۔ اس کے تو باپ نے بھی کبھی اتنے بدصورت الفاظ سے اس کی اہانت نہیں کی تھی۔ اتنے تحقیر و تنفر میں ڈوبے انداز سے نہیں جھڑکا تھا۔ ہمیشہ ایک محترم سا خوب صورت سا احترام پیش نظر رکھا تھا۔ بہرحال اس نے ہمت نہ ہاری اور تیزی سے اس کے رستے میں آ گئی۔

"وقار! یوں سچائیوں سے منہ موڑ کر تو آپ خود کو دوہری اذیت میں مبتلا کر رہے ہیں۔ کبھی تو میری بات سن لیں۔ دیکھیں' ہم ایک خوشگوار زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ پورے اعتماد' محبت اور احترام کے ساتھ۔ کسی عہد رفتہ کے دل دکھا دینے والے خوابوں اور خدشوں سے بے نیاز۔" وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑے درد سے' بڑے یقین سے' خلوص سے کہہ رہی تھی۔

وقار نے ایک لمحے کو سر اٹھا کر بغور اس کا چہرا دیکھا جہاں صرف اور صرف سچائی کی تحریر ثبت تھی۔ پھر جانے کیا ہوا۔ کون سی لہر اندر سے ابھری اور وہ دیوانہ وار اس پر پل پڑا۔ لاتوں' گھونسوں' مکوں سے اس کو دھنک کے رکھ دیا۔

"میری بات نہیں سنی تھی۔ کیا کہا تھا میں نے کہ دفع ہوجاؤ۔" وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"میری حکم عدولی کرتی ہو۔ مجھ سے زبان درازی کرتی ہو' احمق' جاہل عورت۔ مجھے پڑھاتی ہو؟ حیثیت کیا ہے تمہاری۔ ہیں؟ تم ہو کیا چیز؟"

غالباً تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ وہی الفاظ' وہی انداز اور وہی مرد و زن کا قصہ واقعات اور حالات بدل گئے تھے تو کیا ہوا' مزاج تو نہیں بدلتا ناں۔ وراثت میں لیا گیا عورت سے نفرت و بیزاری اور توہین کا احساس تو ختم نہیں ہوسکتا ناں۔

"کچھ قصور اس میں خود امی کا بھی ہے بابا جان کو ہم سے دور کرنے میں' ٹھیک ہے ان کا رویہ بہت ناروا اور گریز پا تھا۔ وہ ہم سے قریب نہیں رہتے تھے مگر امی ایسا کرنے کی سعی تو کر سکتی تھیں۔ شاید فاصلے کم ہوجاتے۔" دھیمے لہجے میں وقاص ملول سا ہو کر کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پہلی دفعہ شعور و فہم اور سنجیدگی کے عکس دیکھے تھے شفقتل نے۔

"بابا کی ایک خاص عادت تھی' جب بھی ہم میں سے کوئی شرارت یا گستاخی کرتا وہ ہمیں ڈانٹنے کے

بجائے امی پر برس پڑتے، طنز سے چھلنی کر دیتے، امی اپنی شامتِ اعمال سے بچنے کے لیے جونہی بابا آتے ہمیں ادھر ادھر کر دیتیں۔ ان کے سامنے نہ آنے دیتیں۔ مبادا ہم سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جائے جو انہیں ناگوارِ خاطر گزرے، اگر کبھی ان کا سامنا ہوتا بھی تو ہم ماں کے ڈراووں پر سہمے خاموش رہ جاتے۔ امی ہمارے ایک معمولی سے فعل پر بھی بطورِ تنبیہ بابا سے شکایت کرنے کی دھمکی دیتیں۔ انہوں نے بابا کو ایسے دہشت ناک رونگٹے کھڑے کر دینے والے پرجلال روپ میں پیش کیا تھا کہ ہم ان کا سامنا کرنے سے خود ہی کترانے لگتے۔ ان کے مقابل ہماری تھرتھری چھوٹ جاتی۔ اوسان خطا ہو جاتے۔ اپنا مدعا بیان کرنا کوہِ گراں سر کرنے کے مترادف محسوس ہوتا۔ یوں مجرم بنے حواس باختہ سے ان کے آگے سر جھکائے کھڑے ہوتے جیسے کوئی سنگین واردات میں ملوث کسی قبیح جرم کا مرتکب شخص کسی جابر و پرجلال فرماں روا کے دربار میں پیش ہو رہا ہو۔ ہماری جائز بنیادی ضرورتیں ماں کے ذریعے ان تک پہنچتیں اور ان کے احکام کی وصولی بھی ماں کے ذریعے ہمیں پہنچتی۔ اس دوری کی دیوار نے باپ سے ہمیں اور باپ کو ہم سے بدگمان بلکہ متنفر کر دیا۔'' وقاص ہاتھ مسلتا زودانی سے اعتراف کر رہا تھا۔ ماں کے جرم کا۔

''یہی وجہ تھی کہ جب ''آزادی'' ملی تو ہم سب نے خود کو تباہ کر لیا۔ بے پناہ، بے تحاشا یا دوسرے لفظوں میں اپنے بچپن اور لڑکپن کی محرومیوں، ترساہٹ اور بے بسی کو چھپانے کے لیے ہم نے اپنی اپنی مرضی کے لبادے اوڑھ لیے اپنی شخصیتوں پہ۔'' اس کا حزنیہ مضمحل سا انداز اس کے لہجے کی سچائی کا مظہر تھا۔

شفقل کے اندر ابلتے بھڑکتے توہین کے انگاروں پر پھر جیسے چھینٹے سے پڑ گئے۔ ''کوئی بات نہیں۔ میں آہستہ آہستہ اس کے اندر سے سارا زہر نکال دوں گی۔ اس کی وحشتوں کو روشنی کی شانتی سے لبریز کر دوں گی۔ کیا ہوا جو میرا وجود اس کے اندر کی آگ باہر نکالنے کے لیے ''نشانا'' بن رہا ہے۔'' وہ دل ہی دل میں خود کو تسلی دے رہی تھی۔ نئے سرے سے ''مضبوط'' کر رہی تھی۔ پھر امن کی فاختہ کا روپ دھار رہی تھی۔

مگر شاید فلک کو اس کی اتنی برداشت، اتنی جاذبیت قلب کچھ بھائی نہیں تھی۔ حالات سنورنے کے بجائے بگاڑ و انتشار کی طرف مزید تیزی سے گامزن ہوتے گئے۔

اس رات بھی اس کے نیلوں نیل مضروب جسم کو رات کی اتھاہ تاریکی میں اپنے قریب کر کے نفس کی آگ بجھانے کے لیے مضبوط آہنی بازوؤں کا حصار تانا، تو اس کا رواں رواں اور تذلیل کے احساس

سے شعلہ فشاں ہو گیا۔

''میں کیوں ہر روز کی اہانت اور زدوکوب کے بعد ہر رات اپنا آپ بنا احتجاج کیے اس کے حوالے کر دیتی ہوں۔ اس کی فطری آگ بجھانے کے لیے، اتنا ناک والا ہے تو کیوں بے بس ہو جاتا ہے۔ اس سے؟ اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ دن میں ایک اپنائیت آمیز نگاہ بھی مجھ پر ڈال لے کہ اس سے اس کی خودی مجروح ہوتی ہے، اس کی نام نہاد انا پرستی کا پول کھل جاتا ہے۔ یہ عمل اس کی ''کمزوری'' کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لیے۔ وہ میرے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتا۔ حالانکہ میاں بیوی میں محبت و یگانت کا بھرپور مظاہرہ کمزوری کی نہیں اعلاظرفی اور بلند کرداری کا غماز ہوتا ہے۔ اس مقدس نورانی رشتے کو انتقام، تشدد اور جنسی تسکین کے جذبوں سے مربوط کر دینا مردانگی تو نہیں کہلاتا؟'' اُس کا ذہن برجستگی سے دلیلیں دے رہا تھا۔

کچھ سوچ کر اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اس کے بازو ہٹا دیے، اور دوسری سمت کروٹ بدل لی۔ وہ جانتی تھی، اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ زبردستی بہ زعم خود اس کی سمت بڑھ کر ''فتح'' کرتا کہ دل میں چور رکھنے والے بہادری کے اعزاز سے سدا محروم رہتے ہیں۔

ایک ہفتہ، ڈیڑھ ہفتہ۔ دو ہفتے۔ اس کے بعد وقار کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ''رات'' کا غصہ بھی اس کے منتقمانہ انداز میں شامل ہو جاتا۔ عجیب عجیب طرح سے اسے ذہنی کچوکے بھی لگانے لگا۔ براہ راست اس بات کو تو وہ شاید کبھی بھی کہنے کی جسارت نہ کرتا۔ وہی مخصوص ہتھکنڈے جو مرد ازل سے عورت کا غرور اور دل توڑنے کے لیے اختیار کرتا آیا ہے۔ بے وفائی کا الزام، شک و شبہات، جسمانی و ذہنی کارکردگی پر طنز، تمسخر اور ہر فعل پر شدید غصہ۔

انا سے بے حال ہوتا شخص مزید بپھرتا گیا۔ غیض کا طوفان ابل کر فرزانگی کی تمام حدود کراس کرتا گیا۔ جھنجھلاہٹ، ترساہٹ، انتقام اور بے بسی عروج پر پہنچ کر اس کی تمام ذہنی توانائیاں مفلوج کرتی گئی۔ اور بالآخر بصارت و سماعت کا ہر عصبی خلیہ ''آؤٹ آف آرڈر'' ہو گیا، اور صرف اور صرف گویائی کی حسیات دیوانہ وار ہونٹوں کی مہر توڑتی ہوئی ابل پڑیں۔ اور اُن سے وہ الفاظ ادا ہوئے جسے سننے سے پہلے ہر عورت مرنا پسند کرتی ہے۔

منیر اب مان بھی لے تو مقدر کی حقیقت کو
جو ہے وہ بھی ضروری ہے، جو گزرا وہ بھی ضروری تھا

شفقتوں کے خزینے لٹانے والا باپ' دکھ کا ہر ریشہ' ہر کرچی اپنی رگ جاں میں سمو لینے والی ماں' جان نچھاور کرنے والا' ذہنی و جذباتی پریشانیاں بٹانے والا بھائی' جان نچھاور کرنے والی بہن' اپنی معصومیت اور شوخی طبع سے دل بہلانے کے ہزار جتن کرنے والا چھوٹا بھائی۔ ہر ہر طرح سے درد بٹانے' خدمتیں کرنے والی بھابی' سب اپنے عمل سے' اپنے قول سے اسے یہی باور کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس دن بھی ربیعہ اس کی دلدہی اور دلجوئی کے حیلوں میں الجھی ہوئی تھی' تو وہ تھکے تھکے انداز میں مسکرائی۔

''ربیعہ! تم لوگ کیا سمجھتے ہو مجھے نہیں خبر کہ حقیقت تسلیم کیے بنا کوئی چارہ نہیں۔۔؟ میں جانتی ہوں تقدیر کا لکھا مٹانے پر نہ میں قادر ہوں' نہ تم لوگ۔ میں روایتی پچھتاوے یا ملال اور رنجیدگی سے دوچار نہیں ہوں۔ میں تو صرف حیران ہوں ربیعہ اس بات پر کہ میں نے تو آج تک نادانستہ بھی کسی کا دل نہیں دکھایا کسی کی آنکھ کے آنسو خوانخواہ مجھے بے چین کر دیتے ہیں۔ بلکہ میں نے تو اپنے بدترین دشمن کے بدانجام کی دعا بھی نہ کی تھی کبھی' پھر میرے ساتھ اتنا عظیم ظلم؟ اتنا زبردست نقصان؟ خود اپنی نگاہ میں گرا دینے والی تذلیل میرا مقدر کیوں ٹھہری؟ کیا اتنی اہانت' ایسی جان لیوا توہین کی مستحق تھی میری ذات؟''

اس نے استفہامیہ انداز میں متاسف و غمگین صورت لیے ربیعہ کو دیکھا۔ ربیعہ نے آہستگی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی نگاہوں میں غایت درجہ کا خلوص اور اپنائیت کی چمک تھی۔

''نہیں شفتل جی! آپ کی ذات تو بہت قیمتی بہت اعلا' بہت نایاب ہے۔ مگر کچھ جوہری' گوہر نایاب کی پرکھ نہیں رکھتے' ان کے اناڑی پن سے' خود ان کا اپنا نقصان ہوتا ہے' اس سے ہیرے کی قیمت' دلکشی اور نایابی پر تو کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے ناں۔'' وہ بڑے سبھاؤ سے اظہار محبت کر رہی تھی۔

آنسوؤں سے لبریز نگاہیں اٹھاتے ہوئے شفتل نے اس کی سمت دیکھا۔ کچھ لمحے یونہی بے خیالی میں تکتی رہی پھر آنسوؤں کو پلکوں کی باڑھ کے پیچھے دھکیل کر بڑی کوشش کے بعد مسکرائی جیسے اچانک رم جھم برسات میں دھوپ نکل آئے' اور پھر سر ہلا کر ربیعہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپانے لگی۔

''سنیے' وہ آپ سے ایک بات کرنا تھی۔'' اُسی رات ربیعہ بیڈ پر نیم دراز ٹیپو کے پہلو میں ٹک کر بیٹھی ہوئی محتاط انداز میں کہہ رہی تھی۔

ٹیپو نے آہستگی سے نظریں اُٹھا کر اس کی سمت دیکھا' پھر دھیرے سے مسکرا کر اس کا مومی ہاتھ تھام

لیا۔

''تو کیا ہمارے درمیان پردہ ہے؟ اب تو تمام حجاب دور ہو چکے ہیں۔ بلکہ یار ہم تو روز اول سے مشتاق ہیں آپ کے منہ سے جھڑتے پھول چننے کو۔ کہیے اور بے شک ساری رات' ساری عمر کہتی رہیے۔ ہم جب تک دم میں دم ہے سنتے جائیں گے۔ موت آ گئی تو ملک الموت سے اجازت پا کر ٹیپ ریکارڈر رکھوا جائیں گے آپ کے پاس۔''

''افوہ۔ بات کھینچ کر کہاں سے کہاں لے گئے۔''

''اب تو سارے افسانے' ساری داستانیں ایک ہی وجود تک رسائی پاتی ہیں۔'' ایک وارفتہ نظر اس پر ڈال کر ٹیپو نے ایسی ازخود رفتگی میں دھیرے سے اسے اپنے بہت قریب کر لیا تھا۔

''مجھے دراصل شفتل جی کے متعلق بات کرنا تھی لیکن ڈرتی ہوں کہیں آپ کو بری نہ لگے۔ اصولاً تو امی سے کرنی چاہیے تھی' مگر ہمت نہیں پڑی۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات بلکہ بہت بڑی بات کا معاملہ ہے۔'' وہ سہج سہج اپنے مدعا کے لیے ماحول استوار کرنے لگی۔

''تم اب ہماری فیملی کا ایک اہم فرد ہو۔ ہمارے اپنوں میں سے ہو۔ اور تمہیں پورا حق حاصل ہے ہمارے ہر معاملے' ہر مسئلے' پر رائے دینے اسے سلجھانے کا۔ ٹیپو نے ''عملاً'' اُسے اپنائیت و قربت کا یقین دلایا۔

''شفتل جی کی عدت پوری ہو چکی ہے۔ پاپا اور امی اُن کے مستقبل کے لیے فکرمند ہیں۔'' ربیعہ کو کچھ تسلی ہوئی' ٹیپو کے رویے سے تو کھل کر دھیمے سے کہنے لگی۔ ''اس سلسلے میں اگر کوئی پرپوزل پیش کروں تو کیا آپ قبول کریں گے؟'' اس نے بہت جھجک کر دھڑکتے دل سے کہہ کر اُس کی صورت دیکھی۔ ٹیپو کے چہرے پر تحیر ثبت ہو گیا۔

''وائے ناٹ یار۔ مگر تم کس کا پرپوزل پیش کرو گی' اور اتنی جلد تمہیں خیال کیسے آ گیا۔'' وہ حیران نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''سامنے کی بات ہے' اگر آپ سمجھیں تو۔'' ربیعہ نے اس کے گریبان کے بٹنوں سے کھیلتے ہوئے ایک لمحے کو اس کی صورت دیکھی۔

''میرا بہت ہی قریبی' بہت گہرا خونی رشتہ۔''

وہ کہہ کر رکی۔ ٹیپو ایک دم نظریں گھما کر ٹھٹک کر اُسے گھورنے لگا۔

''کیوں؟ اگر آپ کو میری بات' میری جسارت ناگوار گزری ہے تو۔'' دل ہی دل میں سہم کر اس

نے ڈرتے ہوئے کہا۔ تیپو گہری سانس لے کر اُٹھ بیٹھا' اور پُر خیال نظروں سے اس کی سمت دیکھنے لگا۔

"ربیعہ! ایک طلاق یافتہ بہن کا گھر بسانے کے لیے بھائی ہر ذات' رنگ و نسل اور عمر کے سوالیوں کو خوش آمدید کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس میں ناگواری یا خفگی کا کہیں سے کوئی پہلو نہیں نکلتا۔" وہ بہت ملائمت بہت روانی سے کہہ رہا تھا۔ حقیقتاً اُسے ربیعہ کی سادہ فطرت' اس کی معصوم خیالی پر ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا۔

"خاموش اس لیے ہوا ہوں کہ تمہارا پروپوزل میرے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ دوسری سب سے اہم بات یہ کہ آیا اس میں بخت بھائی کی دلی رضامندی شامل ہے؟ کیا وہ ایسا چاہتے ہیں یا محض تمہاری خواہش ہے؟"

اس کے لیے تو ربیعہ کا یہ پیغام گویا بہاروں کا حسین سندیسہ تھا۔ شاہ بخت جیسا بردبار' باشعور' حلیم الطبع' باوقار انداز اور سچ کا مالک شخص اپنی مستحکم معاشی پوزیشن سمیت شفتل کے لیے موزوں ترین بندہ تھا۔ صحیح معنوں میں اس کے مزاج اور فطرت سے ہم آہنگ۔ ربیعہ نے اس سوال پر متذبذب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بات یہ ہے کہ......" وہ ہچکچا کر ایک لمحے کو رکی۔

"پتا نہیں آپ کو کیسا لگے لیکن یہ حقیقت ہے کہ تائی کی طرف سے سلسلہ شروع ہونے سے بھی پہلے بخت بھائی مجھے آپ کی طرف بھیجنا چاہتے تھے۔ مگر شاید وہ مقدر کے سکندر نہ تھے۔ ہمیں کچھ دیر ہوگئی یہ بات چھیڑنے میں اور تب تک شفتل جی کو کوئی اور جیت چکا تھا۔ بہر حال...... دو سالوں کے اس گیپ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یقین مانیے وہ آج بھی اولین ایام کے جذبات کے ہمراہ شفتل جی کو اپنے گھر کا اجالا بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی مرضی نہ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اس کے لہجے میں یقین بول رہا تھا۔

امی اور پاپا کو یہ بات پتا چلی تو بے اختیار سربسجود ہوگئے۔ اتنا اچھا' اتنا نیک' ایسا عالی ظرف داماد مل رہا تھا نہیں۔ ان کے سر سے تو جیسے بھاری چٹان سرک گئی تھی۔

شفتل کے سامنے قصہ کھلا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ "امی آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ بے جوڑ رشتوں سے کبھی حسبِ تمنا نتائج برآمد نہیں ہوتے' آپ پھر اسی غلطی کا اعادہ کر رہی ہیں؟ خدا کے لیے اب مجھے بخش دیں۔ آپ نرل کی فکر کریں۔" اس نے جیسے بہت برا مان کر کہا تھا۔

"شفتل جی! خود ہی ہمیں باور کراتی ہیں کہ آپ روایتی لڑکیوں کی طرح احساسِ جرم اور بے بسی کا شکار نہیں ہیں اس "سانحے" پر خود ہی پھر اسی روایتی طرز کی ضد پر اڑی ہوئی ہیں۔ دوسری شادی کہاں سے "انہونی" ہوگئی۔"

ربیعہ اس کا مزاج سمجھ گئی تھی اس لیے اس کی ذہنی سوچ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے اپنی طرف سے گویا کاری وار کیا تھا۔

"میں دوسری شادی کے خلاف نہیں ہوں۔" اس کے لہجے میں ٹھہراؤ پیدا ہو چکا تھا۔ "مگر ایک تو اتنی جلدی؟ قدرتی بات ہے میں ذہنی طور پر خود کو آمادہ نہیں کر سکتی اور دوسری بڑی اور قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ یہ رشتہ مجھے قطعی قبول نہیں۔" اس نے دوٹوک کہا۔ ربیعہ دل ہی دل میں ازحد پریشان ہوگئی۔

"مگر کیوں؟ بخت بھائی کیا بہت برے ہیں؟" مضطرب سا ہو کر اس نے بے چینی سے اپنی انگلیاں مسلتے ہوئے پوچھا۔

"ایسی بات ہرگز نہیں ہے۔" شفتل کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔ "بلکہ میں ان کے لائق نہیں ہوں۔ وقار حسین سے رشتہ اس لیے بے جوڑ تھا کہ وہ ذہنی طور سے پسماندہ شخص تھا اور...... اور تمہارے بھائی سے اس لیے کہ ہماری "ظاہری کیفیات" قطعی مختلف ہیں۔ وہ تو کسی بھی بہت اچھی لڑکی کی پہلی پسند بن سکتے ہیں اور اس کا پورا حق رکھتے ہیں' مگر حقیقت یہ ہے کہ میرے جیسی عورت کے لیے کسی ٹھکرائے ہوئے یا "بھگتائے" ہوئے (رنڈوے) بندے کا رشتہ ہی موزوں ہو سکتا ہے اور یہی لائحہ عمل مناسب ترین ہوگا۔" اس نے بڑے بے رحم اور سفاکانہ انداز میں فراخ دلی سے سچائی افشا کی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" ربیعہ نے سکون کا سانس لیتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "بھائی کے لیے بیچ کے ان دو سالوں کی روداد سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہ اتنے کم ظرف ہرگز نہیں ہیں۔ آپ جس کی چاہے قسم لے لیجیے' ان سے۔ وہ زندگی کے کسی موڑ پر آپ کے ماضی کے حوالے سے کوئی تکلیف دہ ذکر نہیں چھیڑیں گے۔ وہ بالکل بھی ایسے نہیں ہیں شفتل جی! آپ میرا یقین کریں۔"

"اچھا ہوں گے۔" اس کے لہجے میں بے زاری عود کر آگئی۔ وہ کچھ جھنجلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مگر میری طرف سے معذرت۔ البتہ میں بھابی تلاش کرنے میں تمہارے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنے کو تیار ہوں۔ او کے!"

ربیعہ اس کے قطعی اور واضح انکار پر بھونچکا بیٹھی ویران نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

وہ اس وقت عقبی صحن میں بڑے زور و شور سے کریلے اور کدو کی بیلوں کی گوڈی کرنے میں مگن تھی۔ تخت کے ایک سمت دھیمے سروں میں ریکارڈر پڑا بج رہا تھا۔ سامنے کچن کے کھلے دروازے سے چائے

کے پانی کے ابلنے کی آواز پر وہ کھرپا ہاتھ میں لیے لیے اٹھی ہی تھی کہ عقبی آہنی دروازے پر دستک ہوئی۔

''جی۔'' ایک ہاتھ میں کھرپا لیے دوسرے سے لباس درست کرتی وہ دروازے کی سمت بڑھی تھی۔ پھر ٹھٹک کر رہ گئی۔

''السلام علیکم!'' شاہ بخت نے سنجیدگی سے اس کی سمت دیکھ کر کہا۔

''وعلیکم السلام۔ تشریف لائیے۔'' قدرے تذبذب کے بعد اس نے راستہ دے دیا۔ وہ دھیمی چال چلتا ہوا صحن کے بیچ آ کھڑا ہوا۔

''باقی لوگ نظر نہیں آ رہے؟'' ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے اس نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''جی۔ وہ ربیعہ اور امی تو عید کی شاپنگ کے لیے گئے ہیں اور ٹیپو اور عمران ''بکرا'' خریدنے گئے ہیں۔ نزل اوپر سو رہی ہے اور پاپا آفس میں ہیں۔'' اس نے فرداً فرداً سب کی ''حالیہ پوزیشن'' بتلائی۔ اس نے ابھی تک اسے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔

''اچھا'' اس نے مدہم لہجے میں کہا۔ ''پھر میں چلتا ہوں۔'' کچھ توقف کے بعد وہ سست رفتاری سے واپسی کے لیے مڑا۔ اس نے جس طرح دوٹوک انداز میں سب لوگوں کی عدم موجودگی کی خبر دی تھی، ظاہر ہے اس سے یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ میاں پھوٹا کھاؤ۔

''اونہیں پلیز تشریف رکھیے۔''

شفق کو اپنی بداخلاقی اور بے مروتی پر جیسے خود ہی شرمندگی ہوئی۔ ''آپ یہاں تشریف رکھیے۔ میں ابھی دو منٹ میں آئی۔''

تخت کے پاس پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارا کرتے ہوئے وہ سرعت سے کچن کی سمت بڑھی۔

تھوڑی دیر بعد ٹرے میں دو کپ اور کچھ چپس وغیرہ سجا کے لے آئی۔ اسے چائے پکڑا کر وہ آہستگی سے تخت کے کونے پر بیٹھ گئی اپنا کپ سنبھال کر۔ شاہ بخت کی پیشانی پر تفکر کا جال بچھا ہوا تھا۔

''آپ نے تکلف کیا۔'' خیالوں کی وادی سے ابھر کر وہ چونکا۔ شفق نے محسوس کیا جیسے وہ ذہنی طور پر غیر حاضر سا تھا۔ ''شفق!'' کافی دیر تک سر جھکائے چائے کا کپ ہاتھ میں تھامے کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے شاہ بخت نے اپنی نشست بدلتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ اس کا لہجہ بڑا فیصلہ کن سا تھا جیسے بڑے غور و خوض کے بعد اسے مخاطب کرنے کا ارادہ باندھا ہو۔ شفق نے چونک کر اس کی سمت دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔ شاہ بخت کے لہجے کا غیر معمولی پن اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔

''آپ کے انکار کی وجہ مجھ تک پہنچ گئی ہے۔ ٹھیک ہے یہ آپ کا اپنا فیصلہ ہے میں کسی لحاظ سے کسی حق

کے تحت آپ پر کوئی دباؤ ڈال کر اس فیصلے پر نظرثانی کی درخواست دائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ لیکن میں اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں' مجھے ریجیکٹ کرنے کا جو جواز آپ نے بتلایا ہے' اگر واقعتاً آپ کے انکار کی یہی وجہ ہے تو میرے خیال میں یہ کوئی ٹھوس یا ناقابل تردید وجہ نہیں ہے۔ یہ کوئی فارمولا نہیں ہے کہ دو فریق ٹھکرائے ہوئے یا بھگتائے ہوئے ہوں۔ وہی خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کر سکتے ہیں' اور اگر دونوں میں سے ایک فریق کنوارا ہو تو بندھن پائیدار ثابت نہیں ہوگا۔''

''یہ فارمولا بے شک نہیں ہے' مگر یہ واضح اور اٹل حقیقت ضرور ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا تھا۔

''یہ حقیقت نہیں' حقیقت کا ایک رخ ہے۔'' اس نے تحمل سے اس کی بات کو پُرسکون لہجے میں کہا۔

''دور کیوں جائیے۔ میں آپ کو خود اپنے گھر کی مثال دیتا ہوں۔ ہماری امی کی وفات کے بعد ہمارے والد نے مطلقہ خاتون سے شادی کی تھی' مگر دونوں ایک دوسرے کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے پچھلے ٹانکے ادھیڑنے میں لگے رہے۔ ان کی آپس کی ناچاقی کا واضح ثبوت اس سے بڑھ کے کیا ہوگا' کہ ان کی شادی کے دس سال بعد ان کی حادثاتی موت تک گھر میں کسی نئے بہن بھائی کا اضافہ نہیں ہوا۔''

شفق ششدر سی ان کی شکل دیکھتی رہ گئی یہ اس کے لیے قطعی غیر متوقع انکشاف تھا۔ تاہم اس کو جتنی حیرانی ہوئی تھی' اس کا دس فیصد بھی اس کے چہرے سے مترشح نہیں تھا۔ خاموشی سے اس کے اگلے جملے کے انتظار میں بیٹھی اپنے ناخن دیکھنے لگی۔ اس کے انداز سے واضح تھا کہ وہ قائل بہرحال نہیں ہوئی تھی۔

''میں یہ نہیں کہتا کہ ایک فریق کے کنوارے ہونے سے صورت حال بہت خوشگوار ہو جاتی ہے۔ ایسی بات بھی نہیں ہے۔ یہ ہمارے محلے کے ہی شیخ صاحب کی فیملی اس حقیقت کی واضح تردید کرتی ہے۔ ان کی بیگم کنواری تھیں جبکہ خود وہ ایک کو بھگتا چکے تھے۔ آپ دیکھ لیجیے' دن رات جتنے فساد اور ہنگامے ان کے ہاں ہوتے ہیں پورا محلہ دیکھتا اور سنتا ہے۔ ان کی بیگم بات بات پر پہلی بیوی کے حوالے سے انہیں کچوکے لگا کے سلگاتی رہتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے حلق تک شاکی ہیں۔''

شاہ بخت روانی سے کہہ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں بہت وقار' ٹھہراؤ اور مدبرانہ سی پختگی تھی۔

''میرا خیال ہے آپ پر کھل گیا ہوگا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دونوں کی ''ظاہری کیفیت'' کیا ہے۔ یہ عہد وفاداری بشرط استواری اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے لیے کتنے ایثار' خلوص اور برداشت سے کام لے سکتے ہیں۔ باقی کیفیات ثانوی اہمیت رکھتی ہیں۔'' اس کے لہجے میں غایت درجے کا اعتماد' استحکام اور متانت تھی۔ ''اب آپ کا کیا فیصلہ ہے؟'' بالآخر وہ کھڑا ہو کر اس کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

شفقتل نے جز بز ہو کر ایک لمحے کو بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ سچائی خلوص اور بردباری کے رنگوں سے مزین چہرہ۔ اس کی شفاف چمک دار نگاہوں سے ارد گرد جیسے روشنی سی بکھر رہی تھی۔ ان متین، دلکش آنکھوں میں عہد فردا کے دلفریب خواب اور محبتوں کے چراغ روشن تھے۔

پتا نہیں کیوں وہ کچھ جھنجلا سی گئی۔ شاید اپنی کم مائیگی کے احساس سے۔

"پلیز شاہ بخت۔" وہ کسی قدر بے بسی سے بولی۔ "دیکھیے میں خود تلاش کر دوں گی، آپ کو بہت اچھی سی آپ کے مزاج کے مطابق لڑکی۔ اس قصے کو چھوڑیے بلکہ بھول جایئے۔"

اس کی آنکھوں میں لو دیتے امید کے دیپ بجھ سے گئے کتنی دیر اس کی سمت دیکھتے رہنے کے بعد وا شکستگی کے عالم میں وہ پژمردہ سا واپس پلٹا۔ تبھی ربیعہ اور امی وغیرہ اندر داخل ہوئے۔

"اف انتشار تھا کہ کیا بتاؤں کس مصیبت سے فراغت ملی ہے۔" امی تخت پر بیٹھی ہوئی ہانپ کر کہہ رہی تھیں۔ دونوں کے چہرے پسینے سے شرابور تھے۔ شفقتل جھٹ اسکوائش بنا لائی۔ امی شاہ بخت کو بازار آنکھوں دیکھا حال، بتا رہی تھیں۔

"وہ ٹیپو اور عمران نہیں پلٹے اپنی "مہم" سر کر کے؟" شفقتل نے پوچھا۔

"آ رہے ہیں۔ سارے محلے کو سناتے۔ تماشا دکھاتے ہوئے کہ ہم نے دو بکرے لیے ہیں۔ راستے میں دو سو بندوں کو ٹکر ماریں، ٹھیلوں، چھابڑیوں سے ٹکرائے، بسوں گاڑیوں کے آگے پیچھے لپکے۔ کوئی ایک تماشا لگایا ہے۔"

امی بڑے مصروف سے انداز میں کوفت سے کہہ رہی تھیں۔ تبھی ان لوگوں کا نزول ہوا۔ اس طرح کہ ٹیپوں میاں وہ جارحانہ عزائم رکھنے والے صحت مند بکروں کو رسی سے بمشکل کھینچتے ایڑی چوٹی کا زور لگا کے بمشکل صحن تک لا رہے تھے اور ان سے پانچ فٹ پیچھے عمران پتلی سی شاخ ہاتھ میں لیے منہ سے لایعنی خوف زدہ آوازیں نکالتے، تھکے ماندے سے خراماں خراماں تشریف لا رہے تھے۔

"ارے یہاں کیوں لے آئے انہیں، ساری سبزیوں کا ناس مار دیں گے۔" امی نے پکار کر کہا۔ لگتا تھا شاید بکروں نے بھی یہ بات سن لی تھی۔ جونہی ہریالی دیکھی، رسی تڑا کر سرپٹ بھاگے، اور کیاریوں کو پامال کرتے لپ لپ منہ مارنے لگے۔ آن کی آن میں میدان صاف کر دیا۔ امی کے ہزار شش کارنے کے باوجود ٹیپو بکروں کے ساتھ ساتھ عمران پر بھی گرم ہو رہا تھا۔

"بھیج دیا تھا۔ میرے ساتھ بڑا پہلوان۔ مرمر کے ایک بکرے کی رسی پکڑی۔ وہ بدک کر بھاگا تو یہ محترم بھی ساتھ لڑھکتے گئے۔ دونوں ریس لگاتے لگاتے جانے کہاں غروب ہو گئے۔ اتنی خواری کے بعد

ں ڈھونڈا۔ اور یہ کالے دھبوں والا تو پورا "محمد علی" ہے بلکہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے۔ محمد علی تو بے رہ دو ہاتھوں سے باکسنگ کرتا تھا، یہ چاروں پنجے جھاڑ کر سر بازار پل پڑا مجھ پر۔ یہ بھورے بالوں والا شریف النفس لگ رہا ہے ناں، آپ کو۔ مگر آپ اس کی صورت پر نہ جایئے گا مین روڈ کے بیچوں بیچ دو درجن کے سامنے بے حجابانہ پاپ میوزک بجا کر خود ہی اس پر تھرک رہا تھا۔ بے شرم کو خواتین سے بھی حیا نہ آئی۔ اور گستاخ تو بلا کا ہے۔ بے ادب نے ایسا سینگ کھبویا بچارے عمران کی پسلی میں۔ ہائے ہائے۔"

عمران میاں نے جو ہمدردی کا ابلتا ہوا چشمہ رواں دیکھا تو اسے بھی اپنی صعوبت رفتہ یاد آ گئی۔ پسلی پہ ہاتھ رکھ کر بھاں بھاں کر کے رونے لگا۔

"بس کر دو یار۔ بکرے برا مان جائیں گے۔" آنکھیں ملتے ہوئے نرمل بھی ادھر ہی آ گئی۔ میوزک کے دلدادہ بکرے کی اتفاقیہ نظر اس پر پڑی۔ اس کے ہرے رنگ کے کپڑے دیکھ کر شاید اسے بھی ہری ہری سوجھنے لگی۔ ایک نعرہ مستانہ لگا کر نرمل کی طرف دوڑا۔ اس سے پہلے کہ بچاؤ کے لیے وہ کچھ کرتی۔۔ بکرے میاں کی بھرپور ٹکر اس کے پہلو میں لگی۔ وہ ایک دلخراش، فلک شگاف چیخ مار کے وہیں ڈھیر ہو گئی۔ ٹیپو نے بہ سرعت بکرے کو کھینچ کر پرے کیا۔ ربیعہ اور شفقتل نرمل کی سمت بڑھ کر اسے سنبھالنے لگیں۔

"اب آپ بھی بس کریں ناں۔ بکرے برا مان جائیں گے۔" عمران میاں نے دھواں دھار روتی کراہتی نرمل کو دیکھ کر بگڑے بگڑے لہجے میں گویا بدلہ چکایا تھا۔ بکرے میاں ٹیپو کے ہاتھوں بے قابو ہو کر موٹر سائیکل کی سمت بڑھے، ایک نظر اس قوی ہیکل بد ہیت سی چیز کو بے زاری سے دیکھا، پھر بے کار جان کر ٹھاٹ سے ٹکر مار کر اگلی ہیڈ لائیٹ توڑ ڈالی۔

"افوہ۔ آپ نے بھی کن کو بھیج دیا، بکرے خریدنے محترم اپنے جیسے "تخریبی و تجریدی" مزاج والے بکرے چن لائے، کسی نیک شہرت کے شریف صورت بندے کو بھیجنا چاہیے تھا اس کام کے لیے۔"

شفقتل نے تنک کر صاف ٹیپو پر چوٹ کی تھی۔ چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق تخریب کاری میں مگن بکرے کے کان کھڑے ہو گئے۔ محترم کو شاید اپنی بے عزتی کچھ بھائی نہیں۔ منہ اٹھا کے شفقتل کی سمت لپکے۔ وہ بے ساختہ تخت کے قریب کھڑے شاہ بخت کے پیچھے ہو گئی۔

اپنی بے اختیارانہ ہونٹوں پہ در آنے والی مسکراہٹ دباتے ہوئے شاہ بخت آگے بڑھا اور پھرتی سے منچلے بکرے کو پکڑ لیا۔ دونوں کو پکڑ کر دیوار کے ساتھ فاصلے سے ٹھوکے گئے کھونٹوں پر باندھ دیا۔ تو سب نے سکھ کا سانس لیا۔

"توبہ۔ کس قدر اکھڑ مزاج ہیں یہ خبیث۔" دانت کچکچا کر ٹیپو نے اپنے "شیروں" کو دیکھتے ہو۔
کہا۔ جواب کھونٹے سے بندھ کر معصومیت و مظلومیت کے پیکر بنے ہوئے تھے۔
"ربیعہ تسلے میں پانی لے آؤ ان کے لیے۔"
ربیعہ نے برتن لا کر قدرے فاصلے پر رکھ دیا۔ بکرے کچھ پس و پیش سے کام لے رہے تھے۔
"پی لو۔ پی لو۔ بھائی۔" ٹیپو نے ان کے پاس جا کر ان کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جیسے تھپکی دی

جس قدر پینا ہو پانی' پی لو ان کے ہاتھ سے
آب جنت تو بہت ہوگا' یہ پانی پھر کہاں

اس نے بڑے برجستہ سے انداز میں برمحل شعر پڑھا تھا۔ اک فرمائشی قہقہہ بلند ہوا۔
"لگتا ہے "کلیات نظیر اکبر آبادی" تم نے واقعتاً گھول کے پی لی ہے۔" شفتل نے ہنستے ہوئے فقرہ کسا۔
"کچھ اور سنو گی؟" اس کے ہاتھ بدستور بکروں کا بدن سہلا رہے تھے۔ "کیا خوب کہتے ہیں نظیر بھائی کہ

بے درد' ستم گر' بے پرواہ' بے کل' چنچل چٹکیلی سی
دل سخت قیامت' پتھر سا' اور باتیں نرم رسیلی سی

"میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ واقعی بہت خوب کہتے ہیں نظیر۔" کن انکھیوں سے شفتل کی سمت دیکھتے ہوئے شاہ بخت نے دھیمے انداز میں کہا تھا۔ یکایک شفتل کو کچھ دیر پہلے کی اپنی بے ساختہ پناہ لینے والی حرکت یاد آ گئی۔ وہ خفیف سی ہو کر چائے کے بہانے کھسک لی۔

جاتی ہوئی شام کی بنفشی شفق رنگ شعاعیں "نشاط منزل" کے عقبی صحن کو روشنیوں سے نہلا رہی تھیں۔ ٹیپو اور عمران بکروں کی "ٹہل سیوا" میں مگن تھے' نرل اپنے پسندیدہ کام یعنی بچی کھچی سبزیوں کی گوڈی کر رہی تھی۔ شفتل تخت پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔ ربیعہ صبح سے اپنے "میکے" گئی ہوئی تھی' آخر وہاں بھی "بقرعید" کا کچھ اہتمام کرنا تھا۔ امی کچن میں ہانڈی کے لیے مسالا بھون رہی تھیں۔
"ٹیپو! تم نے قصائی سے اچھی طرح معاملہ طے کر لیا تھا ناں۔" انہوں نے کھلے دروازے پکار لگائی۔
"جی ہاں' بے فکر رہیے' اس نے اطمینان دلایا ہے کہ "سویرے سرگی ویلے" نوراں پیراں دے وقت ں آؤں گا سب سے پہلے تہاڈے بکرے کاٹوں گا بس "سامان شان" تیار رکھیو۔ معہ پانچ سو روپوں کے۔"
"ہیں۔ پانچ سو روپے۔" امی حیرت سے بت بن گئیں۔ "یہ تو ایک بکرے کی قیمت خرید کا پانچواں صہ بنتا ہے۔ کیا وہ سونے کی چھری سے ذبح کرے گا؟" انہوں نے ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر برہمی اور حیرت کا ملا جلا اظہار کیا۔
"جانے دیجیے امی!" سبزی کا "قلع قمع" کرتے ہوئے شفتل نے بے پروائی سے کہا۔ "یہی تو ان کے سیزن ہوتا ہے' کمائی کا۔ بقرعید اصل میں آتی ہی قصائیوں اور بھکاریوں کے لیے ہے۔ دونوں کے ارے نیارے ہو جاتے ہیں۔" وہ صحن کی ٹونٹی کھول کے سبزی دھو رہی تھی۔
"اے لڑکی! جاؤ میری زوجہ محترمہ کو لے آؤ "میکے" سے۔" ٹیپو بکروں کا سنگھار کرنے میں مصروف ھا۔
"کس پر جاؤں اور لے کر آؤں۔" شفتل نے فکرمندی کا اظہار کیا۔
"ہوائی جہاز لے جاؤ یا پھر ٹینک' تمہاری مرضی ہے۔" ٹیپو نے حد درجہ سادگی سے مشورہ دیا۔
"مجھے ذرا جلدی ہے۔ میرا خیال ہے "ایف سکس ٹین" لے جاتی ہوں۔" وہ عقبی دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے بولی تھی۔
"ربیعہ۔۔ ربیعہ بھی تشریف لے آئیے۔ آپ کے سسرال میں آپ کی سخت ضرورت محسوس کی جا......"
کھلے دروازے سے بے دھڑک داخل ہو کر جونہی وہ اندر آئی۔ صوفے پر بے تکلفانہ نیم دراز سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں میں گم شاہ بخت پر نظر پڑتے ہی اس کی زبان اور قدم دونوں کو بریک لگ گئے۔
"شیخ صاحب کے ہاں گئی ہے کل کے لیے ان کی "ماسی" کو بک کرانے کے لیے۔ آیئے تشریف رکھیے۔" نشست درست کرتے ہوئے اس نے ربیعہ کی عدم موجودگی کی رپورٹ دیتے ہوئے پذیرائی کے لیے کرسی کی سمت اشارہ کیا۔
"نہیں۔ میں چلتی ہوں۔" وہ یکلخت واپسی کے لیے پلٹی۔
"شفتل!" اک بھاری رعب دار آواز نے اس کے قدم میخ کی طرح زمین پر گاڑ دیے۔ وہ رک گئی مگر پلٹی نہیں۔ شاہ بخت ڈگ بھر کر اس کے مقابل آن کھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال

دیں۔ ”میرا وجود آپ کے لیے ہزار تنفر و بے زاری کا سبب سہی مگر آپ اتنے عرصے بعد پہلی دفعہ میرے گھر آئی ہیں۔ اور کچھ نہ سہی ربیعہ کی سسرالی رشتہ دار ہونے کے ناتے آپ کی مہمان نوازی آپ کا حق بنتا ہے اور میری ذمہ داری۔“

اس کے ناراض ناراض سے روٹھے لہجے کی کاٹ دل ہی دل میں اسے شرمندہ کر گئی۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے شاہ بخت۔ میں آپ سے خائف یا بے زار نہیں ہوں۔“ اس نے نگاہ کترا کر کہا۔

”آپ بہت اچھے اور شریف انسان ہیں۔“

”تو کیا۔

ہم باوفا تھے اس لیے نظروں سے گر گئے
شاید تمہیں تلاش کسی بے وفا کی تھی

اس نے بڑی برجستگی، بڑے سبھاؤ سے لطیف سے انداز میں شکایت کی تھی۔ وہ خفت سے سرخ پڑ گئی۔ اور کچھ نہ سوجھا تو لاجواب ہو کر دروازے کی سمت بڑھی۔ ”میں چلتی ہوں۔“ اس کے دوبارہ روکنے سے قبل وہ دروازہ پار کر چکی تھی۔

گھر آ کر کتنی ہی دیر وہ خالی الذہنی کے عالم میں صحن میں ٹہلتی رہی۔ تصور میں امی کا پرزور اصرار۔ ٹیپو کے مضبوط دلائل۔ ربیعہ کا التجائیہ انداز اور نزل اور عمران کے خوش خوش چہرے در آتے رہے۔ وہ سب مل کر اسے اپنی ”اڑی“ توڑنے پر مجبور کر رہے تھے۔ وقار کی مرتبہ میں سب نے ایک سے بڑھ کر ایک شکایت آمیز تبصرہ کیا تھا مگر اب کے سب ”ایک“ ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ خود اس کی خودی، اس کا من بھی بڑھ بڑھ کر اسے ”ہموار“ کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے معاً اس کی نگاہ اوپر اٹھی۔ اس کے بڑھتے قدموں کو جیسے زمین نے پکڑ لیا۔ وہ دم بخود رہ گئی ریلنگ سے ٹیک لگائے جانے کب سے وہ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔

”افوہ۔ یہ حضرت قصائی صاحب آخر کب تشریف لائیں گے۔“ ٹیپو آتش زیر پا ہو رہا تھا۔ نو بج چکے ہیں۔“ وہ اترا اترا منہ اور بگڑا بگڑا موڈ لیے ماں سے کہہ رہا تھا۔ ”عالی حضرت کا ابھی ”نوراں پراں“ کا وقت نہیں آیا۔“

”شرم کرو کچھ۔“ امی ناراض ہوئیں۔ ”کیوں نیت خراب کر رہے ہو۔ کون سا آٹھ پہر کا روزہ رکھ ہے تم نے۔“

اس نے قربانی کی نیت سے روزہ رکھا تھا۔ دوسری قربانی کے لیے پاپا نے نیت باندھی تھی۔ اتنے سے وقت کے لیے ٹیپو کا بے چینی سے برا حال ہو رہا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے قصائی آیا۔ ذبح کی رسم ادا ہوئی کام کے لیے بلائی گئی ”ماسی“ کے ہمراہ ربیعہ اور شفتل کچن سنبھال چکی تھیں۔ امی ختم کی شیرینی بھجوا اور وصول کر رہی تھیں۔ نزل گوشت کی بو اور صورت دونوں سے الرجک تھی۔ صبح سے کمرہ بند کر کے بیٹھی موسیقی سن رہی تھی۔

”یار۔ اب تو سچ مچ متلی ہونے لگی ہے، تم دونوں کو اس حلیے میں دیکھ کر۔“ ٹیپو بیرونی کام نبٹا کر اندر آیا۔ اور ناک بھوں چڑھا کر بولا۔

دونوں سر سے پیر تک پسینے میں شرابور تھیں۔ گوشت اور خون کی خوشبو جیسے ان میں رچ بس گئی تھی۔ سہ پہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے، گوشت کی ڈشز پر ختم وغیرہ دلا کر احباب اور فقرا اور مساکین کو دعوت کے لیے بلایا جا چکا تھا۔ ٹیپو اور عمران گوشت دینے دلانے کے چکروں میں گھن چکر بنے ہوئے تھے۔ آنے والے اور والیوں کو پاپا اور امی ریسیو کر رہے تھے۔

”اچھا ہری اپ ناؤ۔ ہمارا کام خلاص۔ اب جلدی سے زیادہ تیزی سے چینج کرو۔ سب مل کے چلتے ہیں لمبی ڈرائیو پر۔ سیر و تفریح کریں گے، گھومیں گے، عیش کریں گے، گائیں گے، جھومیں گے، ناچیں گے۔“

”بس، بس، بس۔“ شفتل نے ہاتھ روک کر اس کے ”سر“ توڑ دیے۔ ”اب جاگ جاؤ۔ یہاں جو اتنا آنا جانا لگا ہوا ہے، ان کو کون دیکھے گا؟“

”امی اور پاپا سنبھال لیں گے۔ بس تم کھسکو اب۔“ ٹیپو نے زبردستی اسے واش روم کی سمت دھکیلا۔ سادا سے آسمانی سوتی شلوار قمیص پر سوتی دوپٹہ لیے وہ بڑی سادگی سے تیار ہو کر دروازہ کھول کر زینے کی سمت بڑھی ہی تھی کہ ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔

زینے کے اختتام پر تھوڑے فاصلے کے ساتھ ٹیرس کے بند دروازے سے پشت ٹکائے وہ غالباً اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بہت سکون اور تحمل کے ساتھ۔

”عید مبارک ہو۔“ شفتل کو کچھ تو کہنا تھا۔

”عید کے معنی خوشی کے ہوتے ہیں، اور میری عید ابھی نہیں ہوئی۔“ شفتل نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا، لہجے کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور متانت ثبت تھی۔ وہ سر جھکا کر اپنے ہاتھ دیکھنے لگی۔

”شفتل! میں آج آپ کو کچھ بتانے آیا ہوں۔“ وہ اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ ”میرا ارادہ تھا یہ

اعتراف آپ کو اپنے گھر لا کے' اپنا بھرپور استحقاق استعمال کرتے ہوئے' کسی بہت خوب صورت خوشبو خوشبو ماحول میں کہوں گا مگر' بہرحال سنیے۔'' اس نے...... اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے قطعی لہجے میں کہا۔ ''آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا ارادہ میرا آج کا نہیں ہے' اس کی اساس اسی وقت رکھ دی گئی تھی جب میں نے پہلی بار آپ کو اپنے نئے گھر کے ٹیرس سے دیکھا۔ یہ تقدیر کے کھیل تھے کہ مجھے عرض مدعا میں تاخیر ہوگئی اور آپ وقار حسین کے نصیب کا تارا بن گئیں۔''

اس کے چہرے سے ہویدا حیرت کے آثار شاہ بخت کو عجیب سی شادمانی اور سرشاری کی کیفیت میں مبتلا کر رہے تھے۔

''شفقتل! میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ کے عشق میں میں رانجھے' مجنوں' فرہاد یا مہینوال کا شاگرد رشید بن گیا تھا اور اس حالت کو پہنچ گیا تھا جس میں ہر گھنٹی کی آواز ناقہ' لیلیٰ کے گلے کی گھنٹیوں کی آواز محسوس ہوتی ہے۔ نہیں۔ میں نے آپ سے ایسی ہی محبت کی ہے جیسی کہ میرے جیسا بندہ کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ اقرار میں نہیں کروں گا اور نہ ہی کر سکتا ہوں البتہ میں آپ کو ایک یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں بطورِ شریک زندگی آپ کو بااعتبار' باوقار اور شفاف ساتھ فراہم کروں گا۔ میرا یقین کریں۔''

وہ یقین کیوں نہ کرتی شاہ بخت کے پراعتماد لہجے کی گمبھیرتا' اس کے روشن پرخلوص آنکھوں سے لپکتے وارفتہ شعلے' اس کے شفاف کھرے چہرے کے بولتے رنگ...... سب کے سب مل کر اسے یقین دلا رہے تھے۔ اس کے برفاب جذبوں کو اپنی آنچ دے کر پگھلا رہے تھے۔

''شفقتل آؤ...... کتابِ زندگی کا آغاز خوشگوار باب سے کریں۔'' اپنی چوڑی مضبوط ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا کر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا کہہ رہا تھا۔ شفقتل نے گھبرا کر پلکوں کی باڑھ گرالی اور بچکانہ سی بے ساختگی سے دونوں ہاتھ پشت کی طرف لے گئی۔

شاہ بخت شرارت سے ہنس دیا اور ازراہِ شرارت ایک لمحے کو دونوں ہاتھوں سے اس کے شانے چھو کر ہاتھ ہٹا لیے۔ اس کا چہرا مارے حجاب کے آتشیں ہوگیا۔ شاہ بخت سرشاری سے کہہ رہا تھا۔

''ہاں...... اب کہو عید مبارک!''

خواتین ڈائجسٹ میں قسط وار چھپنے والے خوبصورت ناول

خواتین ڈائجسٹ

اردو بازار کراچی